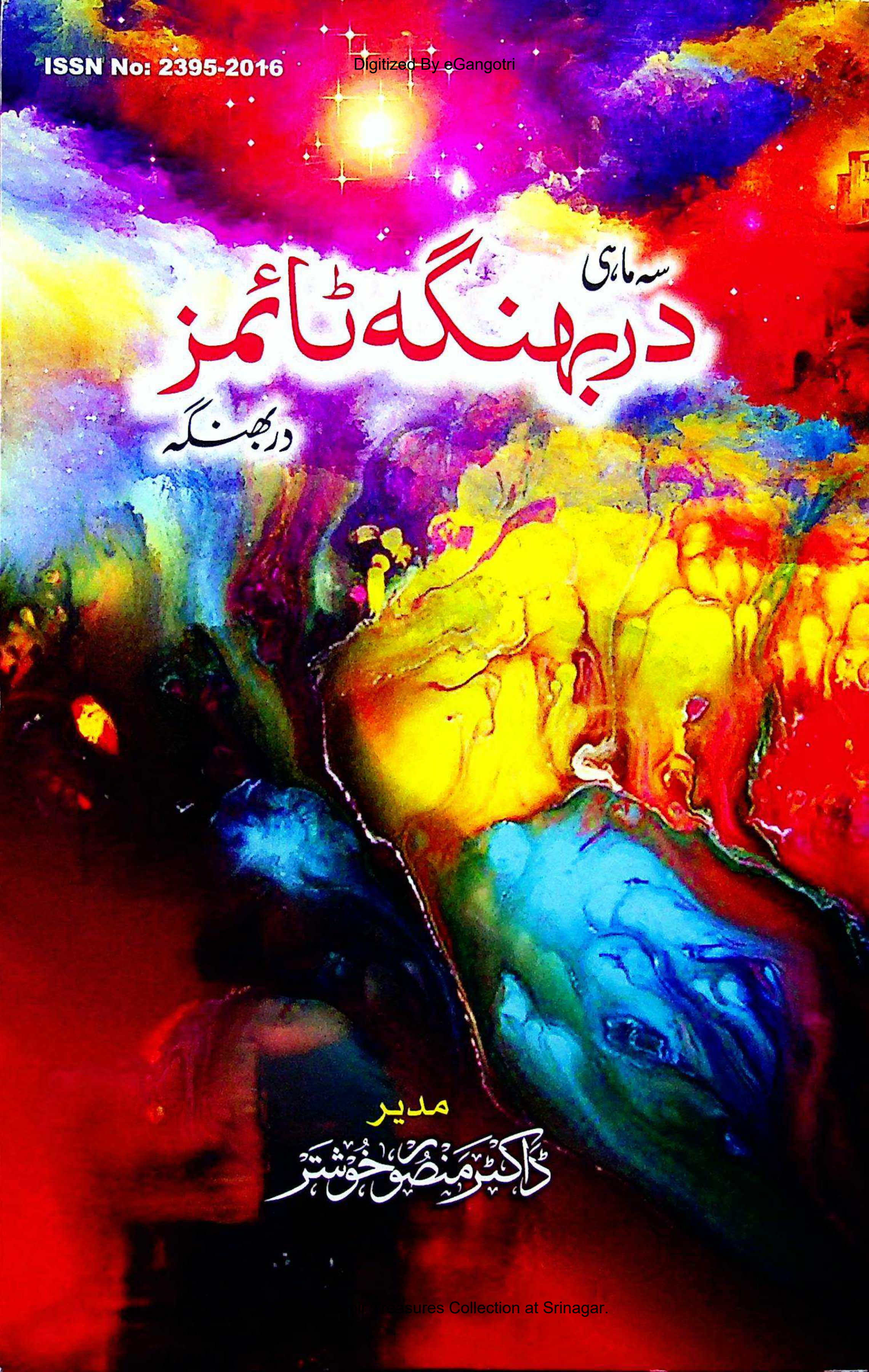
ISSN No: 2395-2016



سہ ماہی

دربھنگہ ٹائمز

دربھنگہ

مدیر

ڈاکٹر منصور خوشتر

ملت کالج ، دربھنگہ

للت نارائن متھلا یونیورسٹی کی منظور شدہ اکائی

ملت کالج خاندان کی جانب سے دربھنگہ ٹائمز
کی کامیاب اشاعت پر مبارکباد



ڈاکٹر محمد رحمت اللہ

پرنسپل ملت کالج

دربھنگہ



MILLAT COLLEGE

(A Constituent Unit of L.N. Mithila University, Darbhanga)

بیادگار: سید حکیم الطاف حسین دمریؒ و محمد فاروقؒ

زیر اہتمام: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ، بہار (الہند)

ادب کی صحتمند روایات اورجدید رجحانات کا ترجمان

کتابی سلسلہ

دربھنگہ ٹائمز

دربھنگہ

جنوری ۲۰۱۹

"Darbhanga Times"

Shaukat Ali House, Purani Munsifi, Lalbagh,
Darbhanga, Bihar (India)846004
www.darbhangatimes.in
e-mail:darbhangatimes@gmail.com
Contact No: 09234772764, 09472059441

ISSN No. : 2395-2016

معاون خاص : علاء الدین حیدر وارثی، فردوس علی، احتشام الحق، سید ارشد منہاج عقیل صدیقی، نثار احمد، حبیب اصغر، وسیم اختر، محمد حامد انصاری، ہمیر خاں، مولانا مہدی رضا

زر تعاون

فی شمارہ: 250 روپے، سالانہ: 800 روپے، خصوصی تعاون: 1000 روپے

پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): 2500 روپے، دیگر ممالک (سالانہ): 50 امریکی ڈالر / 15 پونڈ

اس شمارے کی قیمت -/300 روپے

''دربھنگہ ٹائمز'' کی خریداری کی سہولت کیلئے ہم مختلف ممالک میں زر تعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	پچاس (60) امریکی ڈالر
عمان	:	پندرہ (۱۵) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
قطر	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
کویت	:	پچیس (۲۵) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتہ پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پر بھیج سکتے ہیں۔

darbhangatimes@gmail.com

A/c No.: اکاؤنٹ نمبر:

Darbhanga times A/c 3574409122 IFSC CBIN0281302
Central Bank of india Millat College Branch Darbhanga

رابطہ: ''دربھنگہ ٹائمز'' شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ، بہار (الہند)

''دربھنگہ ٹائمز'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دربھنگہ کی عدلیہ میں ہوگا۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں، کسی بھی طرح کے تنازعے کے ذمہ دار مضمون نگار خود ہوں گے۔

پرنٹر، پبلشر و آنر ڈاکٹر منصور خوشتر نے اقرا گرافکس اینڈ آفسیٹ پریس، دربھنگہ سے چھپوا کر دفتر ''دربھنگہ ٹائمز'' شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ سے شائع کیا۔

فہرست

ISSN No. : 2395-2016

☆☆☆



منصور خوشتر

کہنے کی بات...

محترم قارئین!

اردو میں نسائی شعری آفاق پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ افسانوی جہات کو بھی روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جدید عصری رجحانات کی نئی جہات سے آشنا کرایا گیا ہے۔ جمالیاتی بصیرت کو بھی منور کیا گیا ہے۔ فکری آگہی کو بھی راہ دی گئی ہے اور رچے ہوئے شعور کو بلند قامتی کی شناخت دی گئی ہے۔

لیکن نسائی تنقید پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ میں عرصہ سے سوچ رہا ہوں کہ نسائی اعتبار سے تنقید کا کینوس اردو میں کیا جگمگائے گا۔ کیفیات کی رعنائی کب سامنے آئے گی۔ لہجہ انفعالی کب بنے گا اور نسائی تنقید سے تخلیقی توانائی کو تحرک کب ملے گا۔"

نسائی تنقید کی تھیوری میں عورتوں کے جذبات اور احساسات ان کی جنسی سوچ اور مروجہ سماجی حیثیت کی ترجمانی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نسائی تنقید کی مبادیات آج اکیسویں صدی میں سانس لے رہی ہے اور دو دہائی گذرنے کو ہے لیکن باطنی احساس کے تخلیقی شعور کا کتنا حصہ منصۂ شہود پر آیا ہے؟ دائرے کا سقم کتنا پھیلا ہے۔ کتنی خاتون تنقید نگار کو اعتبار ملا ہے؟ اور کس حد تک نسائی نقاد ریزہ ریزہ حیات اور قطرہ قطرہ سمندر کو مشق کی کسوٹی پر جانچ پرکھ کر مجسم بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ امر بالکل غلط ہے کہ مرد کی بالادستی زندگی کے ہر شعبے میں رہی ہے اور خواتین کو ان کے مقابلے میں کمتر یا کم حیثیت جانا جاتا ہے۔ عہد حاضر کے تناظر میں اب ایسی باتیں بے معنی سی لگتی ہیں۔ اب زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس میں خواتین کی شمولیت نہ ہو یا جس میں ان کی برابر کی حصے داری نہیں۔ آج کی

 ISSN No. : 2395-2016

خواتین تعلیم، سیاست، مذہب، تجارت، صحافت غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھ رہی ہیں اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوا رہی ہیں۔ اردو زبان و ادب کے میدان میں بھی بہت سی ایسی خواتین موجود ہیں جو اس کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ افسانہ ہو یا ناول، شاعری ہو یا خود نوشت نگاری، تحقیق ہو یا تنقید غرض ہر صنف میں خواتین نے اپنے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ البتہ ان میں تنقید ایک ایسی صنف ہے جس میں خواتین کی نمائندگی بہت کم رہی ہیں۔ ادب کے تنقیدی شعبے میں تنقید نگار خواتین بہت کم گزری ہیں۔ خواتین کی تنقید نگاری ہی کو نسائی تنقید سے موسوم کیا جاتا ہے۔

نسائی تنقید کے منظرنامے پر ابھی تک کئی اہم نام سامنے آئے ہیں جس میں ڈاکٹر سیدہ جعفر، ممتاز شیریں، پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر قمر جہاں، کشور ناہید، پروفیسر آصفہ واسع، پروفیسر فریدہ کول، ڈاکٹر نصرت چودھری، ڈاکٹر شہناز نبی، پروفیسر عارفہ بشریٰ، ثروت خاں، ڈاکٹر ارجمند آرا، سیما صغیر، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، جاوید حبیب، سیمیں کرن، تہمینہ اختر، شاذیہ عمیر اور افسانہ خاتون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نسائی تنقید نگار خواتین کے نام گنانے کا مقصد یہ نہیں کہ اس فہرست میں اتنے ہی نام شامل ہو سکتے ہیں یا مزید نام جوڑنے سے یہ فہرست اور مضبوط ہو سکتی ہے۔ البتہ کچھ نام ہیں جنھوں نے نسائی تنقید کی جانب خصوصی توجہ دے کر اسے کسی حد تک استحکام بخشا۔ نسائی تنقید کو عہد حاضر میں جو اعتبار حاصل ہے اور جن نسائی تنقید نگاروں نے اسے اعتبار بخشا ہے، انہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو شوقیہ ادب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ یونیورسٹیوں سے منسلک اساتذہ نسائی تنقید نگار خواتین ہو یا فارغ التحصیل محققین، میں بعض ہی نے اس میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وگرنہ ڈگری یافتہ اسکالروں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہیں خواتین کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں بلکہ نام گنانے کے لیے ایک کثیر تعداد ہے۔ یہ اردو زبان میں تعلیم یافتہ وہ خواتین ہیں جو محض ملازمت اور ڈگری کے حصول کے لیے اس میدان میں آگئی ہوتی ہیں ورنہ علم و ادب اور اردو زبان سے لگاؤ نیز اس کی وسعت کے لیے ہمہ تن کوشاں ہوتیں۔ تاہم غنیمت ہیں وہ بعض نسائی تنقید نگار خواتین جو انہیں تعلیمی اداروں سے تربیت یافتہ ہیں اور زبان و ادب سے لگاؤ ان کے مقام اور شناخت کا ذریعہ بن گیا۔ اس گروہ میں بعضے اتنی فعال نہیں ہیں۔ کبھی کبھار مضمون لکھا جو برسوں بعد جمع ہوتے ہوتے کتاب بن جاتی ہے اور کچھ اپنے تحقیقی مقالوں کا دم بھرتے ہیں۔ دوسرا گروہ

تو شوقیہ ہے مگر اس گروہ کو غنیمت ہی جانیے۔ جن کے نسائی تنقید کے حوالے سے تصانیف یا مضامین شائع ہوئے ہیں۔ نسائی تنقید کے حوالے سے جو باتیں ہوئیں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے یونیورسٹیوں کی جو فارغ التحصیل خواتین اسکالرس ہیں۔ بتایئے ان میں کتنوں نے شاعری کو اپنایا اور کتنوں نے تنقیدی میدان میں نام کمایا؟ جی ہاں! فہرست اطمینان بخش نہیں ہے۔

میری سوچ کے اس اظہار میں احتجاج نہیں ہے۔ بلکہ نارسائی کے طلسم کو کھولنے کی ترغیب ہے۔ خاتون تنقید نگار کرن بن کر جھلملاہٹ پیدا کریں اور سرمایۂ تنقید کی آراستگی میں اضافہ کریں اسی میں عہد کی حسیت ہے۔

آخر پر زیرِ نظر شمارے کے حوالے سے یہ عرض کرنا ہے کہ اس بار چند اہم ادیبوں اور قلم کاروں کے علاوہ کچھ نئے ریسرچ اسکالروں کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے تاکہ ادب میں ان کی نمائندگی بھی کسی نہ کسی طرح ممکن ہو۔ یہ بھی کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور ان میں پڑھنے لکھنے کا ذوق وشوق بڑھ جائے۔

آپ کو یہ شمارہ کیسا لگا۔ اپنے خطوط ارسال کرکے ہمیں ضرور بتائیں۔ آپ کی تجاویز اور آرا کا انتظار رہے گا تاکہ آئندہ دربھنگہ ٹائمز کو خوب سے خوب تر کے سفر پر گامزن کیا جاسکے۔

ہمیں آپ تک یہ بات پہنچاتے ہوئے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ دربھنگہ ٹائمز کی ویب سائٹ http://www.darbhangatimes.in/ کو اب تک 84000 ہزار لوگ وِزٹ کر چکے ہیں۔ ویب سائٹ کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے بھی اپنی تجاویز دیں۔

☆☆☆

☆ ادارہ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' ستیاوتی کالج کے اسوسی ایٹ پروفیسر اور اردو زبان کے معروف ادیب ڈاکٹر شیخ محمد عقیل کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا ڈائریکٹر بننے پر انہیں بہت مبارکباد پیش کرتا ہے۔

☆ ادارہ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' نوجوان خاتون افسانہ نگار شہناز رحمٰن کو اردو زبان میں ان کے افسانوی مجموعے ''نیرنگِ جنوں'' کے لیے ساہتیہ اکادمی کا یووا پرسکار ایوارڈ 2018 ملنے پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

☆ ''دربھنگہ ٹائمز'' کے معاون مدیر غلام نبی کمار کو روزنامہ تعمیل ارشاد کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ''تعمیل ارشاد ادبی ایوارڈ'' دیا گیا جس پر ادارہ انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر

ISSN No. : 2395-2016

طارق متین، بیگوسرائے

حمد

خلوتِ دل ہے تری، قریۂ جاں تیرا ہے
جس میں محفوظ ہوں میں، کُنجِ اماں تیرا ہے
تیری رحمت سے برستا ہے یہاں ابرِ کرم
مسکراتا ہوا یہ باغِ جہاں تیرا ہے
تیرے انوار کے پرتو ہیں یہ خورشید و قمر
میری آنکھوں میں جو روشن ہے سماں تیرا ہے
تیری قدرت سے ہی جلتے ہیں مسافت کے چراغ
منزلیں تیری، ہر اک سنگِ نشاں تیرا ہے
کون ہے چارہ گرِ زخمِ جگر تیرے سوا
میری تکلیف تری، دردِ نہاں تیرا ہے
چشمِ گریاں بھی تری، خندۂ لب بھی تیرا
فصلِ گُل تیری، مرا عہدِ خزاں تیرا ہے
مجھ میں روشن ہے جو قندیلِ سخن تیری ہے
مجھ کو حاصل ہے جو اندازِ بیاں تیرا ہے

☆☆☆

ستیہ پال آنند، امریکہ

نعت رسول مقبول

(یہ نعت بصورت استغاثہ ہے)

اے خاصۂ خاصانِ رسل، ہادئ برحق
حالؔی نے روا رکھا تھا جو طرزِ تخاطب
مجھ جیسے سبک سر کو تو اچھا نہیں لگتا
اے سیّد الابرار ـــــ
''امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے''
اس ''تم'' پہ، ''تمھاری'' پہ، ''تری''، ''تو'' پہ، تو مالکؐ
ہے سخت تعجب کہ اک ادنیٰ سا یہ انسان
کیا آپؐ سے اس درجہ تکلّف سے بری ہے؟
اے سرورِ کونینؐ ـــــ
میں خاکِ کفِ پا بھی نہیں آپ کی آقا ﷺ
میں کیا ہوں، فقط اک کفِ خاشاک، خس و خاک
بے وقعت و ناکارہ و بے دانش و نافہم
اور آپؐ حضور اکمل و سرمد، مرے مالک
میں آپؐ کو ''تو'' کہہ کے پکاروں؟ مری جرأت؟
میں ''تو'' کہوں اس صلے علیٰ، شمس الضحیٰ کو
جس کے لیے حسّان کا لہجہ بھی ہے کمتر؟
اس طرزِ تخاطب پہ زباں میری نہ کٹ جائے؟
اے صدر العلیٰ شہؐ
(ہاں، خاک مرے منہ میں) مگر پوچھ ہی لوں میں
کیا آپؐ شہِ انبیا، کمتر ہیں کسی سے؟
جو آپؐ کو ''تو'' کہہ کے مخاطب ہیں سخن میں
یہ ''افسر الشعرا''، یہ ''غزل گو''، یہ ''بیت بند''؟
اے سیّد الابرارؐ؟

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

ناصر عباس نیّر

دھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا: سلیم آغا قزلباش کی یاد میں

پرسوں سہ پہر سلیم آغا قزلباش کے انتقال کی خبر ملی۔ اب تک یقین نہیں آیا۔ حالاں کہ دنیا میں اگر کوئی بات واقعی یقینی ہے؛ ہر طرح کے شک وشبہے سے بالاتر ہے تو وہ موت ہے، مگر ہم فانی انسان یہ تصور کرنے پر خود کو تیار نہیں کر پاتے کہ ہم اور ہمارے قریب کے لوگ بھی مر جائیں گے۔ موت ہمیشہ ہمیں خود سے دور نظر آتی ہے۔ ان کی بیماری کی اطلاع تھی مگر یہ قطعی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہیں۔ چند مہینے پہلے ان سے فون پر بات ہوئی، انھوں نے سانس کی تکلیف کا ذکر کیا۔ یہ ذکر انھوں نے جس لہجے میں کیا اس سے ان کی بیماری کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا۔ سرگودھا کے احباب کے ذریعے ان کی خیریت کی اطلاع بھی کم ہی ملی کہ سلیم آغا نے گزشتہ کچھ عرصے سے فون سننا اور احباب سے ملنا بند کر دیا تھا۔ یہ واقعی پریشانی کی بات تھی، مگر وہ اس قدر جلد رخصت ہو جائیں گے، اس کا خیال، ان کے انتقال کی خبر سے پہلے ایک لمحے کو بھی نہیں ہوا تھا۔

کوئی اٹھائیس سال پہلے ان سے اس وقت ملاقاتیں شروع ہوئیں، جب ایم اے اردو کے دوسرے سال میں وزیر آغا صاحب کے یہاں سرگودھا اور وزیر کوٹ میں آنا جانا شروع ہوا۔ انھیں ہمیشہ کم آمیز اور کم گو پایا۔ ان سے ملاقاتوں کا شمار نہیں۔ ان سے کچھ عرصہ خط کتابت بھی رہی، مگر اتنے طویل عرصے میں بھی ان سے بے تکلفی نہیں ہو سکی۔ ان سے محض ادب اور ادبی شخصیات پر باتیں ہوتیں، وہ بھی کچھ دیر کے لیے۔ مجھے سرگودھا، وزیر کوٹ اور لاہور میں آغا صاحب کے پاس گھنٹوں بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع نصیب رہا، مگر سلیم آغا ان نشستوں میں بس چند منٹوں کے لیے آتے، حال احوال دریافت کرتے، معاصر ادبی صورتِ حال پر اپنی مختصر رائے دیتے، پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اتنے برسوں میں وہ کبھی کھلکھلا کر ہنسے ہوں، میری یادداشت میں نہیں۔ شروع میں ان کے لیے دیے رہنے سے الجھن ہوتی تھی، اور شکایت بھی پیدا ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہم دوسروں کو سمجھنے سے زیادہ، ان کے بارے میں حکم لگانے کی غلطی کرتے ہیں۔ سلیم آغا حقیقی معنوں میں تنہا تھے۔ انھوں نے غالباً تین شادیاں کیں، تینوں بوجوہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ اولاد کی نعمت سے بھی محروم تھے۔ یہ دکھ معمولی نہیں تھا، اور اس دکھ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی مانند وزیر آغا صاحب بھی شریک تھے۔ (سلیم آغا کی ایک ہی بہن ہے جو عین جوانی میں

بیوہ ہوگئی تھیں جن کے بچوں کی پرورش آغا صاحب نے کی)۔ میں نے ایک بار ہمت کر کے آغا صاحب سے اس موضوع پر بات کی۔ انھوں نے کہا اولاد کی خواہش کا بڑا محرک اپنے نام کی بقا ہے، مگر آدمی کا نام آخر کب تک زندہ رہتا ہے؟ تیسری پیڑھی جانتی ہی نہیں کہ ان کے آبا؟ اجداد میں کون کون تھا۔ وہ ذوق کے اس شعر کے فلسفے میں بھی کم ہی یقین رکھتے محسوس ہوتے تھے۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

آغا صاحب فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے۔ یہ تک کہتے تھے کہ ایک وقت آئے گا جب یہ زبان، ملک، کائنات بھی باقی نہیں رہیں گے۔ اپنی، اپنے سیارے اور کائنات کی کلی فنا کو بھولنا نہیں چاہیے۔ اس سے نظر وسیع ہوتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا رنج جاتا رہتا ہے۔ اس طرح کے فلسفے ڈھارس بندھاتے ہیں، بعض کو وقتی بعض کو دائمی۔ تاہم بلا سے اولاد باپ دادے کا نام روشن کرے یا ڈبوئے، اس سے محبت کا تجربہ زندگی کے اہم ترین تجربات میں سے ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ سلیم آغا کی تنہائی اور لیے دیے رہنے کی ایک ممکنہ وجہ غالباً یہی تھی۔

سلیم آغا ایک بڑے اور صاحب ثروت باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ سب انھیں اسی حیثیت میں ملتے اور پہچانتے تھے۔ وہ خود اس حیثیت کے متعلق کیا جذبات رکھتے تھے، اس کے بارے میں کچھ بھی وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ اپنے جذبات پر ان کے مسلسل ضبط نے اس بات پر دبیز پردہ ڈالا ہوا ہے۔ البتہ انھیں اس بات کا مسلسل قلق ضرور رہا کہ آغا جی (وہ آغا صاحب کو آغا جی کہا کرتے تھے) کو لاہور والوں نے نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ ان کا امیج بھی مسخ کیا۔ اسی طرح آغا صاحب کے انتقال کے بعد جب کچھ لوگوں نے ان کی تنقید پر سرقے کے بے سروپا الزامات لگائے تو بہت دکھی ہوئے۔ یہ وہی لوگ تھے، جو آغا صاحب کے پاس گھٹنوں بہ صد ادب بیٹھتے تھے۔ عابد خورشید اور شاہد شیدائی نے ان الزامات کے مسکت جوابات لکھے۔

سلیم آغا نے ایک اپنی شناخت بنانے کی مقدور بھر کوشش کی اور اس میں بلاشبہ کامیاب ہوئے، اور یہ کوشش انھوں نے آغا صاحب کی مانند ادب ہی کی دنیا میں کی۔ آغا صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ 1957ء میں پیدا ہونے والے سلیم آغا نے اورینٹل کالج سے اردو میں ایم اے کیا۔ اگرچہ باپ بیٹے دونوں نے اورینٹل کالج کے شعبہ اردو سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں، مگر دونوں نے الگ الگ اصناف کا انتخاب کیا۔ آغا صاحب نے اردو ادب میں طنز و مزاح کا انتخاب کیا، مگر سلیم آغا نے اردو افسانے کے جدید رجحانات کے عنوان کو چنا۔ (اس اہم مقالے کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی سے شایع ہوا ہے)۔ آغا صاحب نے نہ صرف خود انشائیے لکھے، بلکہ اردو میں انشائیہ نگاری کو تحریک بھی بنایا۔ سلیم آغا اس تحریک میں شامل ہوئے۔ انھوں نے ''مغرب کے انشائیے'' کے عنوان سے مغربی انشائیوں کے تراجم شایع کیے اور خود بھی عمدہ انشائیے لکھے۔ ''سرگوشیاں''، ''آمنا سامنا'' اور ''نام میں کیا رکھا ہے'' ان کے اردو انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ ''منتخب انشائیے'' اور ''نئے انشائیے'' کے عنوانات کے

تحت اردو انشائیوں کے انتخابات بھی کیے۔ آغا صاحب کے انتقال کے بعد سلیم آغا، شاہد شیدائی کے پرچے ''کاغذی پیرہن'' میں انشائیے کی تحریک کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

آغا صاحب نثری نظم کو شاعری تسلیم نہیں کرتے تھے، اسے ''اوراق'' میں ضرور شایع کرتے تھے مگر نثر لطیف کے عنوان سے۔ سلیم آغا نے نثری نظم کو باقاعدہ اپنے ادبی اظہار کے طور پر اختیار کیا اور اسے نثر لطیف نہیں، نثری نظم یعنی شاعری ہی کہا اور لکھا۔ ''ایک آواز''، ''زخموں کے پرند''، ''یہ نا عجیب بات'' ان کی نثری نظموں کے مجموعے ہیں۔ افسانہ، سلیم آغا کے تخلیقی اظہار کی اہم ترین صنف تھی۔ ''انگور کی بیل'' اور ''صبح ہونے تک'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے کچھ افسانے علامتی تھے مگر بیشتر حقیقت نگاری پر مبنی تھے۔ 'صبح ہونے تک' ان کا فلسفیانہ افسانہ ہے، جس میں انسان، سماج، تاریخ اور کائنات سے انسان کے تعلق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کی جیسی تحسین ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی۔ وہ باقاعدہ نقاد نہیں تھے، مگر کبھی کبھی تنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ 'اوراق' کی ادارت میں بھی شامل رہے مگر پھر مسموم ادبی فضا سے دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے۔ آغا صاحب کے بعد 58 سول لائنز سرگودھا اور 3115 سرور روڈ لاہور میں بالترتیب سرگودھا اور لاہور ادیبوں کو شام کی پرتکلف چائے پر بلاتے رہے، پھر یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ وہ زیادہ وقت اپنے آبائی گاؤں وزیر کوٹ میں گزارنے لگے اور آخر میں بیماری کے شدید ہونے کے بعد لاہور میں۔ ان کا قد آغا صاحب کی مانند نکلتا ہوا تھا، آخری دنوں میں چہرے کے نقوش بھی آغا صاحب کی مانند ہو گئے تھے۔

ان کی نثری نظم 'کیا یہی زندگی ہے!' خود ان کی اور ہم سب کی زندگی کے سفر کا بیان ہے!

تتلی کو چھونے کی کوشش کرنا
چاند میں کسی چہرے کے
نقوش ڈھونڈنا
آنسوں سے
خود اپنے ہی دامن کو
بھگوتے چلے جانا
اور ہوا کے کسی
بے صبرے جھونکے کے ساتھ
بکھرتے اوراق کی صورت
سارے شہر میں ٹھوکریں کھاتے پھرنا
پھر شام ڈھلے
کسی کٹیا میں
دھویں کی بکل مار کر
کھانستے کھانستے سو جانا
کیا یہی زندگی ہے!

☆☆☆

پروفیسر صادق

حفظ اللسان، خالق باری اور محمود شیرانی

نام: سید صادق علی، قلمی نام: صادق، پیدائش: اجین، مدھیہ پردیش 1943، تعلیم: ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، ملازمت: دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی میں بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ اردو خدمات انجام دینے کے بعد 2008 میں مستعفی ہوئے۔ صادق صاحب دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں دہلی لائبریری بورڈ (منسٹری آف کلچر) کے ممبر بھی ہیں۔ پروفیسر صادق شاعر، محقق، ناقد، مصور اور ڈرامہ نگار ہیں۔ دستخط (شاعری)، سلسلہ (شاعری)، نظمیں غزلیں گرد آلود (شاعری)، کشاد (شاعری)، خواب کے جلنے کا منظر (شاعری)، ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ (تحقیق و تنقید)، چراغِ دیر (تحقیق) مالوے کی لوک کہانیاں، نئی مراٹھی شاعری، نئی ہندی شاعری، ادب کے سروکار (تنقید)، چند مضامین (تنقید) عظیم شاعر مرزا غالب (مونوگراف) کنیادان (مراٹھی ناٹک کا ترجمہ) وغیرہ ان کی اردو میں اب تک کی شائع شدہ کتابیں ہیں۔ صادق صاحب کی ہندی کتابوں میں گرتے آسمان کا بوجھ (شاعری)، شبدوں کا جنم دن (کویتائیں)، اردو کی کالی جئی کہانیاں (ترتیب و انتخاب) داغ داغ اجالا (ترتیب و ترجمہ) مہا کوی مرزا غالب (مونوگراف)، زندگی کا ذائقہ (ہندی میں طنزیہ نظمیں)، چراغ دیر (ہندی ترجمہ)، سر پر کھڑا شنی ہے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ہزاروں اسکیچز اور ڈرائنگس، اردو، ہندی انگریزی اور مراٹھی کتابوں اور رسائل و جرائد میں شائع تقریباً ستر ریڈیو ڈرامے آکاش وانی کے مختلف مراکز سے بارہ زبانوں میں براڈکاسٹ، کئی دستاویزی اور ٹیلی فلمیں نیز ایک سریل دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوئے ہیں۔ پتہ: پروفیسر صادق، بی۔33، پاکیٹ۔9، جسولہ، نئی دہلی۔110025 موبائل نمبر: 9818776559

حافظ محمود شیرانی اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) میں اس خیال کا اظہار کر چکے تھے کہ امیر خسرو کی طرف منسوب اور ان کے نام سے مشہور ہندوی تخلیقات قابل اعتبار نہیں ہیں اور خالق باری بھی الحاق و اغلاط سے پُر ایک ایسا ہی منظومہ ہے۔ یہ امیر خسرو کے عہد میں نہیں بلکہ ان کے بہت بعد کے دور میں لکھا گیا معلوم ہوتا ہے۔ خالق باری کے مقطع میں موجود خسرو تخلص کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ امیر خسرو کے علاوہ کسی اور شخص کا بھی تخلص ہو سکتا ہے۔

''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت کے سولہ سال بعد ۱۹۴۴ء میں حافظ محمود شیرانی کی تالیف ''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا سرورق ایسی معنی خیز اور قابل داد عبارت سے مزین ہے، جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ایک سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پورا مافیہہ صرف چند الفاظ میں سرورق پر ہی پیش کر دیا گیا ہے۔ سرورق کا عکس ملاحظہ ہو: سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۲۱۳

حفظ اللسان

معروف بہ
خالق باری
مصنفہ
ضیاءالدین خسرو در ۱۰۳۱ ہجری
(جو عموماً حضرت امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب ہے)
مرتبہ
پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب
شائع کردہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
پہلی بار ۱۹۴۴ء قیمت مجلد عشاریہ بلا جلد چار اعشاریہ
سرورق کی اس تحریر کے ذریعے یہ ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ
۱۔ زیر نظر تصنیف کا نام "حفظ اللسان" ہے۔ (خالق باری نہیں)
۲۔ یہ خالق باری نام سے معروف ہے۔ (یعنی اصل میں حفظ اللسان ہے)
۳۔ اس کا مصنف ضیاء الدین خسرو ہے۔ (امیر خسرو دہلوی نہیں)
۴۔ یہ ۱۰۳۱ ہجری میں تصنیف کی گئی۔ (یعنی امیر خسرو کی وفات کے برسوں بعد لکھی گئی)
۵۔ یہ عام طور پر امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب ہے۔ (لیکن درحقیقت ان کی تصنیف نہیں ہے)
۶۔ اس کے مرتب پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب ہیں۔
۷۔ یہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی ہے۔ (واضح رہے کہ ناشر کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو کا نام کتاب کے معیاری اور معتبر ہونے کا ضامن ہے)

ظاہر ہے کہ سرورق کا ایک ایک لفظ خوب سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ اب مذکورہ کتاب کی فہرستِ مضامین ملاحظہ ہو جو مندرجہ ذیل چار حصص پر مشتمل ہے۔

۱۔ عرضِ ضروری (مشتمل بر صفحات ۰۲)
۲۔ دیباچۂ اول (مشتمل بر صفحات ۴۹)
۳۔ دیباچۂ دوم (مشتمل بر صفحات ۱۵)

۴۔ متن خالق باری (مشتمل بر صفحات ۳۴)

عرض ضروری:

سب سے پہلے عرض ضروری عنوان کے تحت حافظ محمود شیرانی نے اپنی مرتبہ کتاب کو ''خالق باری'' کی ایک قابل اعتماد اور متنقدانہ اشاعت قرار دیتے ہوئے لکھا کہ ''اشاعت ہذا صرف بعض قدیم اور معتبر نسخوں کی قرأت پر بنیاد پاتی ہے۔ اس کا متن اکثر و بیشتر انڈیا آفس کے ایک قدیم مخطوطے نمبر 252 فہرست مخطوطات ہندوستانی کا مقلد ہے لیکن اصل مخطوطے کا رسم الخط میں نے زمانۂ حال کے قاری کی سہولت کے واسطے ترک کر کے رائج الوقت املاء میں بدل دیا ہے''۔

''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' کا دیباچہ اول بقول حافظ محمود شیرانی ''اس عالم گیر اعتقاد کی تردید ہے کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ اس دیباچے میں راقم (محمود شیرانی) نے خالق باری کے متن پر کچھ اعتراض نیز بعض اہل قلم کے بیانات پر تنقید کی کوشش کی ہے''

عالم گیر اعتقاد کی تردید میں محمود شیرانی کا پہلا استدلال یہ ہے کہ دیسی زبانوں میں تعلیم کا رواج ایسے قدیم زمانے (یعنی خسرو) سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو کہا جاسکتا ہے کہ دیسی زبانیں بہت جلد بعد ہماری تعلیم میں ہاتھ بٹانے لگتیں اور ادب ولٹریچر ان میں بہت پہلے سے شروع ہو جاتا''۔

حافظ محمود شیرانی کا یہ استدلال مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ عہد خسرو سے پہلے ہی چند دیسی زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرت، تمل، کنڑ، کشمیری اور گجراتی وغیرہ میں چند معیاری کتابیں لکھی جاچکی تھیں۔ کیا ''امر کوش'' نے اہل ہند کی تعلیم میں معاونت نہیں کی ہوگی؟

اب دیباچۂ اول میں خالق باری کے متن پر کیے گئے اعتراض اور بعض اہل قلم کے روایتی بیانات پر تنقید کی طرف آیئے۔ محمود شیرانی کے اس قول سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روایت نے خالق باری کو حضرت امیر خسرو کی طرف منسوب کر کے ہمیں الجھن اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے ....خالق باری خان آرزو کے زمانے سے لے کر ہمارے اپنے زمانے تک بالاتفاق حضرت امیر خسرو کی طرف منسوب ہے''۔

محمود شیرانی نے عوامی عقیدے کے علاوہ جن بعض اہل قلم کے روایتی بیانات پر تنقید کی کوشش کی ہے، ان کے نام بالترتیب خان آرزو، محمد حسین آزاد، محمد امین عباسی چریا کوٹی، مسعود حسن رضوی اور محمد وحید مرزا ہیں۔ خالق باری کے تعلق سے ان سب کے بیانات اور محمود شیرانی کے استدلال میں اپنے دوسرے مضامین میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ان اکابرین ادب کے بیانات روایتی قرار دے کر نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

خالق باری کے متن کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے محمود شیرانی نے دیباچۂ اول میں اس کے نقائص

ISSN No. : 2395-2016

پر بھی نگاہ ڈالی ہے اور واضح الفاظ میں یہ کہنے کے بعد کہ وہ امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک تصور کرتے ہیں۔لکھا ہے:

''اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون، الفاظ اور وزن میں کوئی قرینہ ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے تلفظ کی کوئی پروانہیں کی گئی۔ بعض الفاظ کا صحیح ترجمہ نہیں دیا۔ عربی، فارسی اور ہندی، مرادف بالالتزام نہیں دیے۔ کبھی فارسی ہندی دے دیے، کبھی فارسی عربی پر اکتفا کی۔ بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں کہ الفاظ برائے بیت خالق باری کا وقیع پہلو بن گئے ہیں''۔

دیباچہ اول کے اخیر میں محمود شیرانی نے خالق باری کے ان تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی فہرست بھی دی ہے جو ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھے۔ ان نسخوں کی مجموعی تعداد ۵۵ ہے۔ ان میں سولہ قلمی اور بقیہ ایسے مطبوعہ نسخے ہیں جو انیسویں اور بیسویں صدی میں برصغیر کے مختلف شہروں اور مختلف مطبعوں سے شایع ہوئے تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے ''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' مرتب کرتے وقت ان تمام نسخوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ ان نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات متن کا بھی انھیں خوب اندازہ ہوگا۔ ایک بڑے اور اہم محقق ہونے کے ناطے وہ اس نکتے سے بھی بخوبی واقف ہوں گے کہ جس تصنیف کے متن میں بمرور زمانہ لاتعداد الفاظ، فقرے اور الحاقی اشعار شامل ہو گئے ہوں، اس کی تنقید سے گریز کیا جانا چاہیے۔

محمود شیرانی نے اپنی مرتبہ کتاب کے آغاز میں ''عرض ضروری'' عنوان کے تحت لکھا ہے کہ اس مرتبے کا ''دیباچۂ دوم انجمن ترقی اردو کے ایک مخطوطے نوشتۂ ۱۱۸۷ ہجری کی سند پر ایک نہایت اہم انکشاف کا مظہر ہے کہ خالق باری جس کا اصل نام ''حفظ اللسان'' ہے۔ بابا اسحاق قنّادی (حلوائی) کی فرمائش پر کسی ضیاء الدین خسرو نے (بعہد جہانگیر) تصنیف کی ہے۔ سال تصنیف ۱۰۳۱ ہجری اس کے مادۂ تاریخ ''تصنیف آخر'' سے برآمد ہوتا ہے۔ یہ اطلاع خالق باری کے تعلق میں نہایت قیمتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بعد کے لوگوں کو غالباً بوجہ اشتراکِ اسمی مغالطہ پیش آیا کہ وہ ضیاء الدین خسرو کو امیر خسرو دہلوی سمجھ بیٹھے''

دیباچۂ دوم کا آغاز حافظ محمود شیرانی کی اس اطلاع کے ساتھ ہوتا ہے کہ انھیں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے سے خالق باری کا ایک مخطوطہ جو ۱۱۸۷ء کا مخطوطۂ سورت (گجرات) تھا، دکھایا۔ اس نسخے کی ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ بھی ہے۔ بقول محمو شیرانی:

> ''اس دیباچے سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے، یعنی یہ کہ کتاب بچوں کو فارسی زبان سکھانے کے مقصد سے لکھی ہے۔ اس کا نام ''حفظ اللسان'' ہے۔ اس نام میں اشارہ ہے کہ کتاب طلبہ کو حفظ یاد کرائی جائے۔ روز مرہ کے استعمال کے عام الفاظ اس میں جمع ہیں۔ بحریں مختلف رکھی ہیں۔ بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر یہ تالیف وجود میں آئی۔ مصنف کا نام

خسرواور لقب ضیاء الدین ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ مشہور یمین الدین امیر خسرو نہیں ہے بلکہ کوئی اور جس کو طوطیِ ہند کے ساتھ نام میں اشتراک کے سوا کوئی اور وجہ مماثلت نہیں''

محولہ تحریر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی نے ''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' انجمن ترقی اردو کے کتب خانے والے اسی مذکورہ نسخے کی بنیاد پر مرتب کی ہوگی لیکن اس مرتبہ کی تیاری میں انھوں نے مزید چند قلمی نسخوں کی امداد لی ہے۔ ان سے مقابلہ بھی کیا ہے اور اصول تحقیق کے مطابق ان کی فہرست مع صراحت مقدمہ دُوم میں پیش کردی ہے۔ مذکورہ نسخوں میں سے نسخہ الف انڈیا آفس لائبریری کا مخطوطہ نمبر 252 (مطابق فہرست ہندوستانی مخطوطات از بلوم ہارٹ 1926) ہے۔ یہ مخطوطہ محمود شیرانی کے بقول ''اگر چہ بے تاریخ ہے لیکن متعدد نسخوں کے مقابلے کے بعد میں (محمود شیرانی) نے اس کو بنیادی نسخہ قرار دیا ہے جو اکثر نسخوں سے رسم الخط کے اعتبار سے قدیم ہے اور بارھویں صدی ہجری کے نصف اول کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے''۔

اسی نسخہ الف کے بارے میں مزید معلومات دینے کے بعد محمود شیرانی نے یہ ضروری اطلاع بھی دی ہے کہ:

''اسی نسخے کے ساتھ کسی نامعلوم مرتب کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ جس میں کتاب کا نام ''مطبوع الصبیان'' رکھا گیا ہے۔ دیباچہ کی ضروری عبارت ہے ''ایں چند کلمہ عربی وفارسی ہر یک با ترجمۂ ہندی برائے تعلیم صبیان ہر طریقِ ریختہ منظومہ بے ساختہ آمد تا خاطرِ ایشاں رغبت نماید یاد گیرند ولغات ہر یک دریا ہندو نام ایں کتاب مطبوع الصبیان نہادہ شد و بر پنجاہ و شش فصل مرتب گردانیدہ آمد''

حافظ محمود شیرانی نے یہ تو بتا دیا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری والے جس نسخے کو انھوں نے بنیادی نسخہ قرار دیا ہے وہ 'مطبوع الصبیان' کا ہے (حفظ اللسان کا نہیں) لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انھوں نے اس نسخے کو بنیادی نسخہ کیوں قرار دیا اور اس سے مقابلہ کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ اگر ان کی مرتبہ کتاب کا بنیادی نسخہ ''حفظ اللسان'' کی بجائے ''مطبوع الصبیان'' کا ہے تو پھر اصولاً اس کا نام 'مطبوع الصبیان معروف بہ خالق باری' ہونا چاہیے تھا۔ بصورت دیگر اس تبدیلی کے تعلق سے انھیں وضاحت کرنی چاہیے تھی۔

حافظ محمود شیرانی کی مشکل دراصل یہ تھی کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کے مخزونہ جس مخطوطے کو بنیادی نسخہ مان کر اپنی مرتبہ کتاب ''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' میں پیش کر دیا وہ ان کے بقول بے تاریخ ہے اور اس پر مصنف کا نام بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس حفظ اللسان کا وہ نسخہ جو مولوی عبدالحق نے انھیں دیا تھا اس میں نہ صرف یہ کہ ضروری اطلاع سے پُر دیباچہ بلکہ مصنف کا نام (ضیاء الدین خسرو) بھی موجود ہے جو محمود شیرانی کو اپنا موقف صحیح ثابت کرنے کے لیے مفید و معاون معلوم ہوا ہوگا۔

''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' کی ترتیب وتصحیح کے کام میں حافظ محمود شیرانی نے انڈیا آفس لائبریری کے ایک اور مخطوطے سے بھی مدد لی ہے، جس مخطوطے کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل دیباچۂ دوم میں نسخۂ ب کے ذیلی عنوان کے تحت دی گئی ہے۔ فہرست ہندوستانی مخطوطات (از بلوم ہارٹ) میں اس مخطوطے کا نمبر 253 درج ہے۔ اس میں اشعار کی مجموعی تعداد 136 ہے۔ یہ اکبر آباد میں لکھا گیا ہے۔ محمود شیرانی نے اس مخطوطے کے خاتمے کی عبارت تو نقل کردی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ صفحۂ آغاز پر اس کا نام خالق باری لکھا ہے یا کوئی اور نام درج ہے۔

دیباچۂ دوم کے مطابق نسخۂ ج محمود شیرانی کا ذاتی (مملوکہ) مخطوطہ ہے۔ یہ نسخہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے کی نذر کردیا تھا۔ اس میں اشعار کی مجموعی تعداد 155 ہے۔ ''بائیس شعر بعد میں کسی نے حاشیے پر اضافے کیے ہیں ان کا قیاس ہے کہ یہ دکن میں لکھا گیا ہوگا۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے ''تمت تمام (شد) نصابِ ہندوی زبان تصنیف امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ بتاریخ بیست وپنجم جمادی الثانی ۱۱۳۵ ہجری''

حفظ اللسان معروف بہ خالق باری: دیباچہ دوم ص ٦٤۔

کہا جاتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی سکّہ شناسی اور کتبہ شناسی کے علاوہ قدیم کاغذ، روشنائی، آرائش اور علمِ خط کی شناخت میں اپنا جواب آپ تھے لیکن حفظ اللسان اور اس کی ترتیب وتدوین میں معاون مخطوطوں کے تعلق سے ان کے کمالات کا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ مخطوطۂ ج کی صراحت میں انھوں نے ابتدائی صفحات کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ خاتمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عنوان ''نصابِ ہندوی زبان'' ہے۔

نسخۂ ''د'' کے متعلق محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''میرا ذاتی نسخہ ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں ہے۔ ناقص الطرفین مگر صحت کے لحاظ سے معتبر ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے وسط کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔''

نسخہ ''د'' اگر ناقص الطرفین ہے تو اس کا عنوان اور مولف کا نام بھی کسی کو معلوم نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں حفظ اللسان کی ترتیب وتصحیح کے سلسلے اس کی مدد کس بنیاد پر لی گئی اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ یہ مخطوطہ بارھویں صدی کے وسط کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے غالباً یہ بھی محض قیاس کی بنیاد پر لکھ دیا گیا ہے کیونکہ مذکورہ نسخۂ 'د' تو بقول شیرانی ناقص الطرفین ہے۔

نسخۂ 'ہ' کے متعلق محمود شیرانی نے لکھا ہے:

''انجمن ترقی اردو کا مذکورۂ بالا نسخہ 8:846، تعداد اشعار 223، فی صفحہ 13 سطر، خاتمہ،

کاتبہ فقیر سید یٰسین ولد سید طاہر عرف خوب صاحب میاں، بن میاں سید یٰسین مرحوم سورت بندر۔تاریخ بیست چہارم، ماہ رجب المرجب ۱۱۸۷ہجری''

دیباچۂ دوم کے مطابق نسخۂ 'و' سید نجیب اشرف (بمبئی) کا مملوکہ اور بقول شیرانی قابل اعتبار نسخہ ہے۔ان کے مطابق:

''منظوم خاتمے میں کتاب کا نام نصاب ظریفی بتایا گیا ہے۔کاتب ایک پارسی ہے۔منظوم خاتمے کے اشعار ہیں:

چو بگرفت ایں نسخہ طرز نوی ز تصنیف آں خسروِ پہلوی
زاتمام عاشورہ یک ہفتہ شد کہ ایں گوہر بے بہا ہفتہ شد
امید است از فضل حق ِ کریم بخوانند وگردند طفلاں علیم
بتاریخ نیکو سرا نجام یافت نصاب ظریفی نکو نام یافت
وقت صد فزوں سی وشش سال بود کہ طبع از خرد دستیاری نمود
کہ صبیاں بر آیند از دام جہل شود فیض والفاظ وا شکال حل

اس خاتمہ پر اگر اعتبار کیا جائے تو ہمیں ماننا ہوگا کہ خالق باری 736 ہجری میں تصنیف ہوئی لیکن ان اشعار کی خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے امیر خسرو کی طرف اس کا انتساب ناممکن ہے''۔

حافظ محمود شیرانی نے محولہ اشعار کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ خالق باری کا کاتب ان اشعار کا مالک ہے۔اس کو امیر خسرو کا صحیح زمانہ معلوم نہ تھا۔اس لیے ۷۳۶ہجری اس نے خالق باری کی تصنیف کا زمانہ مان لیا حالانکہ امیر خسرو اس تاریخ سے بارہ سال قبل یعنی ۷۲۵ہجری میں انتقال فرما چکے تھے۔

(حفظ اللسان معروف بہ خالق باری: دیباچہ دوم ص ۶۶)

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ امیر خسرو کی وفات کے بعد بدلتے ہوئے زمانوں کے ساتھ خالق باری کے متن میں تحریف والحاق کا جو سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے تحت امیر خسرو کے اس منظومے کی تتبع میں جو اور منظومے وجود میں آئے نصاب ظریفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''نصاب ظریفی مشہور بہ خالق باری'' کا کاتب نوروز بن موبدان شاپور جی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔خسرو دہلوی کو خسرو پہلوی بنا دینے کا ذمے دار بھی یقیناً یہی کاتب رہا ہوگا (اس سے قبل بھی ایک مشہور ایرانی مصنف خسرو کو پہلوی قرار دینے کی کوشش کر چکے ہیں) کتاب کے خاتمے کے وہ تمام اشعار جو محمود شیرانی نے سید نجیب اشرف کے مملوکہ نسخے سے نقل کیے ہیں وہ نوروز بن موبدان شاپور جی (کاتب) نے موزوں کیے ہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ممکن ہے یہ

نصابِ ظریفی کے مولف کے رہے ہوں۔ خالق باری کے اشعار ظرافت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خالق باری کے تتبع میں تالیف کی گئی ''نصابِ ظریفی'' کے مؤلف کا تخلص ظریف یا ظریفی رہا ہوگا جس کی مناسبت سے اس منظومے کو یہ عنوان دیا گیا ہوگا۔

''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' مرتب کرتے وقت حافظ محمود شیرانی کے پیش نظر مولوی عبدالحق کے فراہم کردہ مخطوطے کے علاوہ جو مذکورہ قلمی نسخے تھے، ان میں نسخہ 'الف میں کتاب کا نام ''مطبوع الصبیان'' لکھا ہوا ہے۔ نسخہ 'ج کا عنوان ''نصابِ ہندوی زبان'' ہے اور نسخہ 'د کے منظوم خاتمے میں کتاب کا نام ''نصابِ ظریفی'' تحریر ہے۔ یہاں بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب مذکورہ تینوں مخطوطے تین مختلف مولفین کے ہیں اور ان تینوں مخطوطوں کے عنوانات بھی باہم دگر مختلف ہیں۔ ایسی صورت میں ''حفظ اللسان معروف بہ خالق باری'' سے ان کا موازنہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں ان مخطوطوں سے امداد لینا اور مقابلہ کرنا کیا تحقیق کے اصولوں کے مطابق درست عمل قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ حافظ محمود شیرانی کی مرتبہ کتاب ''حفظ اللسان موسوم بہ خالق باری'' کے متن میں یہ روایتی مقطع:

خالق باری بھئی تمام		دو ہوں جگ رہیا خسرو نام

کیسے شامل ہوگیا جو نہ امیر خسرو دہلوی کا کہا ہوا ہوسکتا ہے اور نہ ہی جسے نام نہاد ضیاء الدین خسرو نے لکھا ہے۔ خود محمود شیرانی کے مطابق حفظ اللسان میں ضیاء الدین خسرو کا لکھا ہوا مقطع یہ ملتا ہے:

عاقبت انجام وآخر چیہہ ویورا انصرام
کرد ایں حفظ اللساں را خسرو آخر والسلام

اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی مرتبہ کتاب میں ضیاء الدین خسرو کی حفظ اللسان کے مقطع کو بہ یک جنبشِ قلم کتاب کے متن سے باہر حاشیے میں کیوں پہنچا دیا؟

مجھے یہ بات لکھتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ قارئین کو بھی پڑھتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا لیکن یہ سچ ہے کہ خالق باری کی تحقیق کے معاملے میں حافظ محمود شیرانی کا قلم وہ ضبط و توازن برقرار نہیں رکھ سکا جو اس کا خاصہ رہا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مستعار شاعری: مظہر امام کے حوالے سے

نام: مناظر حسن، قلمی نام: مناظر عاشق ہرگانوی۔ تاریخ پیدائش: 01 جولائی 2018، تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی۔
پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگار، ناقد اور ادیب کے طور پر ہوتا ہے۔ مختلف اصناف پر آپ کی 226 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 36 کتابیں آپ کی شخصیت اور فن پر بھی لکھی گئی ہیں۔ تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور میں آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں اور اسی یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کی نگرانی میں 23 تحقیقی کام مکمل ہوئے جبکہ خود آپ کی شخصیت پر ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں چار تحقیقی کام کیے جا چکے ہیں۔ آپ نے مختلف قومی اور بین الاقوامی سمینار، مشاعروں اور ٹیلی ویژن وریڈیو پروگراموں میں بھی حصہ لیا ہے۔ مختلف رسائل و جرائد سے آپ کی وابستگی ہے۔ خود بھی ''کوہسار'' نام کا ایک معیاری ادبی رسالہ پابندی کے ساتھ نکال رہے ہیں۔ رابطہ مناظر عاشق ہرگانوی 9430966156

بڑا شاعر ہمیشہ اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے اور زیادہ حساس ہوتا ہے۔ مظہر امام کے قیمتی اور انمول تجربے میں حسین، دیدہ زیب اور دلفریب رنگوں کی آمیزش کے ساتھ ان کی اپنی تنقید بھی پنہاں ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں سے ان کے ہمعصر اور ان سے بعد کی نسل کے شاعروں نے بہت اثر لیا ہے اور سرقہ کی حد تک ان کے مصرعوں اور اشعار کو اپنا کر اپنا قد بڑھایا ہے۔ غیر شعوری مشترکات ومشابہات سے کوئی شاعر نہیں بچ سکتا۔ لیکن مظہر امام کی غزلوں سے اثر قبول کرنے والے غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ غزلوں کو ساتھ رکھ کر سرقہ کرتے رہے ہیں، چند مثالیں پیش ہیں:

مظہر امام کی ایک غزل کے یہ تین اشعار ملاحظہ کریں:

وہ روشنی ہے کہ آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دے
سکوت وہ کہ دھماکہ بھی اب سنائی نہ دے

ISSN No. : 2395-2016

ازل کے ٹوٹتے رشتوں کی اس کشاکش میں
پکار ایسی ادا سے مجھے سنائی نہ دے
نکل چکا ہوں میں اپنی کمان سے آگے
تعلقات گذشتہ کی اب دہائی نہ دے

یہ غزل پہلی بار رسالہ ''سطور'' دہلی کے نومبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی پھر ان کے مجموعۂ کلام ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں بھی شامل ہوئی جو ۱۹۷۴ء میں چھپا تھا۔ اس غزل سے متاثر ہوکر پروفیسر عنوان چشتی نے غزل کہی جو رسالہ ''مریخ'' پٹنہ کے جنوری تا اپریل ۱۹۸۶ء میں چھپی۔ اس غزل کے درج اشعار کو مظہر امام کی غزل سے ملا کر پڑھئے:

مرا وجود ہے یا گونجتا ہے سناٹا
بہت ہے شور مگر کچھ مجھے سنائی نہ دے
نظر کے ساتھ ہوا ہے زوال منظر بھی
اندھیرا وہ ہے کہ کچھ بھی مجھے سجھائی نہ دے
شکست نو اب محبت نے کھول دیں آنکھیں
ترے نثار تعلق کی اب دہائی نہ دے

کیا یہ اشعار محض تاثر پذیری کا نتیجہ ہیں؟ میرے خیال میں ہرگز نہیں۔ یہ 'سرقہ' کے ذیل میں آتے ہیں۔!
مظہر امام کا پہلا مجموعہ ''زخم تمنا'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا یہ شعر بیحد مشہور ہوا:

دوستو! اب سحر کو دو آواز
شب کی اک انتہا بھی ہوتی ہے

علقمہ شبلی کا مجموعۂ کلام ''بے چہرے لمحے'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل یہ شعر دیکھئے:

روشنی میں بھٹک رہے ہیں ہم
دوستو! تیرگی کو دو آواز

مظہر امام کی درج ذیل غزل سے پہلے رسالہ ''گفتگو'' بمبئی کے ستمبر ۱۹۷۸ء میں ''سطور'' دہلی کے نومبر ۱۹۷۸ء اور ''سیپ'' کراچی کے اپریل ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ تین اشعار ملاحظہ کریں:

زلزلے سب دل کے اندر ہوگئے
حادثے رومان پرور ہوگئے

دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ
اب کے کیا گزری کہ پتھر ہو گئے
تم کہ ہر دل میں تمہارا گھر ہوا
ہم کہ اپنے گھر میں بے گھر ہو گئے

رحمت امروہوی کی ایک غزل دوماہی ''گلبن'' احمد آباد کے سالنامہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے تین اشعار ہیں:

حادثے جیسے مقدر ہو گئے
اب تو ہم راہوں کا پتھر ہو گئے
پہلے کیسے موم ہو جاتے تھے لوگ
آج کل تو لوگ پتھر ہو گئے
اپنے گھر میں رہ کے بھی زحمت اب ہم
ایسا لگتا ہے کہ بے گھر ہو گئے

دوسرا اور تیسرا شعر اثر پذیری کی واضح مثال ہے۔

میرے خیال میں اثر قبول کرنا برا نہیں ہے لیکن اس کا اعتراف بھی ہونا چاہئے مگر کیا سرقہ کرنے والے اتنی جرأت کر سکیں گے؟ آنے والا وقت انہیں قابل اعتنا سمجھے گا؟ عقل اور تجربہ دونوں حقیقت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مظہر امام کا جادو سر چڑھ کر بولتا نظر آتا ہے۔ ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی کے ''گوشہ یوسف ناظم'' (۱۹۸۳ء) والے شمارہ میں ابوالکلام قاسمی کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا آخری شعر ہے:

وحشتِ دل نے عبث تجھ کو مداوا سمجھا
تو نہ ہوتا تو مرے ساتھ زمانہ ہوتا

ایسا لگتا ہے کہ یہ غزل مظہر امام کی غزل کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے۔ ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں یہ غزل موجود ہے۔ یہی غزل اس سے کچھ عرصہ قبل ''شاعر'' ہی کے ایک سالنامہ میں چھپی تھی جس کا یہ شعر کافی مشہور ہے:

اب تو یہ غم ہے ملاقات ہوئی کیوں تجھ سے
تو نہ ہوتا تو مرے ساتھ زمانہ ہوتا

''برگِ آوارہ'' حیدرآباد کے ۱۹۸۳ء کے ایک شمارہ میں مصطفیٰ مومن کی پابند غزل شائع ہوئی جس کے دو اشعار ہیں:

پھول کا تحفہ نہ ہو راہ کے پتھر ہی سہی
دوستو! ملتے رہو اوروں سے چھپ کر ہی سہی
اک سہارا تو ملے خواب زدہ آنکھوں کو
میری تصویر نہیں سایے کا پیکر ہی سہی

یہ دونوں اشعار مظہر امام کی آزاد غزل سے لیے گئے ہیں۔ ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں یہ آزاد غزل شامل ہے۔ اسے سے قبل رسائل میں شائع ہو چکی ہے:

پھول ہو زیر میں ڈوبا ہوا پتھر نہ سہی
دوستو! میرا بھی کچھ حق تو ہے چھپ کر سہی کھل کر نہ سہی
یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

مظہر امام کی درج ذیل غزل کئی رسائل میں شائع ہوئی اور ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں بھی شامل ہے:

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ گر آیا تو کیا لے جائے گا
اور کیا رکھا ہے میرے پاس لے جانے کو اب
میرا قاتل آئے گا میری دعا لے جائے گا

ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی نے مئی ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں شائع شدہ مصطفیٰ مومن کی یہ غزل ملاحظہ کیجیے:

کیا خبر تھی شاخ سے پتہ اڑا لے جائے گا
جسم کے صندل سے وہ خوشبو چرا لے جائے گا
اب ہمارے جسم کا صحرا ہے اور ویرانیاں
وہ جو آیا بھی تو اس دھرتی سے کیا لے جائے گا

مظہر امام کی یہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے:

سانحہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا

ISSN No. : 2395-2016

''اقدار'' پٹنہ کے جون ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ اس غزل میں یہ شعر بھی تھا:

سیڑھیوں پر اگر یوں ہی چڑھتا رہا
ایک دن اپنے اندر اتر جاؤں گا

''آہنگ'' گیا کے اکتوبر ۱۹۷۱ء ''کتاب'' لکھنؤ کے نومبر ۱۹۷۱ء اور ''تحریک'' دہلی کے ستمبر ۱۹۷۳ء کے شمارے میں صفدر نام کے ایک شاعر کی غزل شائع ہوئی جس میں یہ شعر شامل ہے:

یہ اونچی فصیلوں نے سوچا نہ تھا
میں اپنے ہی اندر اتر جاؤں گا

مظہر امام کی غزلیں، نقوش، لاہور میں شائع ہوتی رہیں۔ ۶۸۔۱۹۶۷ء کے ''نقوش'' میں ان کی دو غزلوں سے خالد رحیم اور پیام فتح پوری نے ۱۹۷۲ء میں براہ راست استفادہ کیا۔ رسالہ ''شاخسار'' کٹک کے شمارہ ۴۰۔۳۹ (۱۹۷۲ء) میں خالد رحیم کی غزل کا شعر ہے:

جو کل ملا تھا سرِ راہ اجنبی کی طرح
مجھے وہ آدمی اپنا دکھائی دیتا ہے

اور ''نقوش'' میں شائع شدہ مظہر امام کی غزل کا شعر ہے:

جس سے کترا کے نکلتے رہے برسوں سر راہ
اس سے کل ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا

مظہر امام کے ایک دوسری غزل کا مطلع ہے:

اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی میری طرف دیکھ کہ میں آیا ہوں

اس کے بھونڈی نقل پیام فتح پوری نے ''شاخسار'' کے اسی شماری میں شائع شدہ اپنی غزل میں کی ہے۔ مطلع ہے:

زخم دل زخم جگر زخم قبا لایا ہوں
زندگی دیکھ کہ کس حال میں میں آیا ہوں

''رشتہ گونگے سفر کا'' میں شامل مظہر امام کی غزل کے یہ چار اشعار اکثر حوالے میں آتے رہے ہیں:

کوئی نگاہ و دل کا خریدار ہی نہ تھا
میں نے دکاں سجائی تو بازار ہی نہ تھا

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور شوق کو آزار ہی نہ تھا
نایاب تھے گہر ہی کی مانند سنگ و خشت
یا اس نگر میں کوئی گنہگار ہی نہ تھا
سب ساتھ لے کے آئے تھے اپنی متاعِ جاں
میری طرح وہاں کوئی دلدار ہی نہ تھا

صادقہ سکندر نوری کی غزل مطبوعہ ''اقبال'' سری نگر ۶ نومبر ۱۹۷۴ء کے یہ اشعار مظہر امام سے واضح طور پر مستعار ہیں:

کوئی ہمارے دل کا خریدار بھی نہیں
ایسی دکاں لگائی کہ بازار بھی نہیں
لے دے کے ایک پیار کی دولت تھی اپنے پاس
ایسے لٹے ہیں اب کوئی گھر بار بھی نہیں
سناٹے گھومتے ہیں صلیبوں کے شہر میں
اب جیسے کوئی شخص گنہگار بھی نہیں
ہر شخص اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کے لائے
ایسا حسیں تو ہائے وہ دلدار بھی نہیں

مظہر امام کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر زبان زد عام ہے:

میں وہی ہوں کہ نہیں غور سے دیکھو مجھ کو
مسئلہ جان کے اک بار تو سوچو مجھ کو

اس شعر کا اثر سلطان اختر کے درج ذیل شعر پر نمایاں ہے:

غور سے دیکھو ہر اک تار نفس پہچانو
میں وہی ہوں کہ نہیں اب کے اسے پہچانو

بعض شعری مجموعوں میں کئی کئی غزلیں ایسی ہیں تو مظہر امام کے مجموعے کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں۔ نئی نسل کے شاعر ایمن جعفری کا مجموعۂ کلام ''عکسِ الہام'' مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آیا۔ مظہر امام کا مجموعہ ''رشتہ گونگے سفر کا'' ۱۹۷۴ء میں چھپا تھا۔ دونوں مجموعوں کی

اکثر غزلوں میں خیال اور بندش کی مماثلت ملاحظہ کیجیے:

کوئی لشکر آئے گا طوفان کی صورت ایام
سر سے وہ خوابوں کا خیمہ بھی اڑا لے جائے گا
(رشتہ گونگے سفر کا۔ص:۴۴)

بڑھ گیا طوفان تو ساری طنابیں توڑ کر
سر سے احساسات کا خیمہ اڑا لے جائے گا
(عکس ابہام۔ص:۲۲)

اس طرح گنے نہ دو یادوں کی شبنم دیر تک
(رشتہ گونگے سفر کا،ص:۴۴)

بے سبب یادوں کے ساحل ٹوٹ کر گرنے نہ دو
(عکس الہام۔ص:۲۲)

سیل صبح اک روز اس کو بھی بہالے جائے گا
(رشتہ گونگے سفر کا،ص:۴۲)

وقت کا سیلِ رواں اس کو بہالے جائے گا
(عکس ابہام۔ص:۲۲)

سچ کے صحرا میں انہیں ڈھونڈ کے تھک ہار گئے
جھوٹ کے شہر میں یاروں کا بسیرا نکلا
(رشتہ گونگے سفر کا،ص:۵۱)

جھوٹ کے دشت سے نکلے تو ہوا یہ معلوم
بند ہے شہر میں سچ کا ہر اک در یارو
(عکس ابہام۔ص:۲۳)

جاتے ہو تو بچوں کو بھی ساتھ اپنے لیے جاؤ
جب موت کے آؤگے تو یہ گھر نہ ملے گا
(رشتہ گونگے سفر کا،ص:۵۴)

جس کو چھوڑ جاتے ہو وہ نشاں نہ پاؤ گے
جب پلٹ کے آؤ گے یہ مکاں نہ پاؤ گے
(عکس ابہام۔ص:۶۰)

لمحوں کی طرح گزری ہیں صدیاں تو بارہا
اک پل بنا ہے کیسے زمانہ کہا نہ جائے
(رشتہ گونگے سفر کا،ص:۶۸)

وہ ایک پل کہ جس میں ہے صدیوں کا اضطراب
لمحہ کہا نہ جائے، زمانہ کہا نہ جائے
(عکس ابہام،ص:۴۱)

اپنا مکاں اجاڑ کے صحراؤں کی طرف
وہ شخص کیوں ہوا ہے روانہ کہا نہ جائے
(رشتہ گونگے سفر کا،ص:۶۸)

بے سمتیوں کے کرب مسلسل سے اوب کر
کب کس طرف وہ ہوگا روانہ کہا نہ جائے
(عکس ابہام،ص:۴۱)

مضمون آفرینی اور معنی آفرینی پر توجہ دی جائے تو مظہر امام سے متاثر ہونے کی لمبی قطار نظر آ رہی ہے۔ مظہر امام کی غزل کا ایک نہایت مشہور شعر ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ مظہر امام کی پہلی شناخت اسی شعر سے قائم ہوئی اور فلم ''گمنام'' کے ایک مکالمے میں بھی ہیرو کی زبان سے یہ شعر ادا کرایا گیا۔ وہ یہ ہے:

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

یہ غزل سب سے پہلے ماہنامہ ''شمع'' اور ''ششما'' (ہندی) دہلی میں فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ایک معروف شاعر اقبال منہاس نے اس شعر کا چربہ اس طرح اتارا ہے:

بھولنے والے! مری سمت ذرا غور سے دیکھ
میں وہی شخص ہوں تو نے جسے چاہا تھا کبھی

ان کی متعلقہ غزل کئی سال بعد ''جمالستان'' دہلی جنوری فروری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

مظہر امام کی ایک غزل ''نقوش'' لاہور میں مئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی جس کا یہ شعر ہے:

وقت کے سورج سوا نیزے پہ کب کا آچکا
آنکھ والوں نے ابھی تک یہ سماں دیکھا نہیں

مشہور شاعر محسن بھوپالی نے قریباً تیس سال بعد اس خیال کو اس طرح پیش کیا:

نظر آتا نہیں دیدہ وروں کو
سوا نیزے پہ سورج آچکا ہے

مظہر امام کے اشعار سے استفادے اور تاثر پذیری کی مثالیں بہت سی ہیں۔ مثلاً ان کی مشہور غزل کا یہ مطلع دیکھئے:

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میری گھر تک بھی وہ گر آیا تو کیا لے جائے گا

معروف ومستند شاعرہ بانو داراب وفا کہتی ہیں:

روٹھ جائے گا تو مجھ سے اور کیا لے جائے گا
بس یہی ہوگا کہ جینے کا مزا لے جائے گا

مظہر امام کا یہ مطلع بھی شہرت رکھتا ہے:

ہے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے
دنیا بہت اداس تھی جب ہم اداس تھے

ایک نئی شاعرہ ریحانہ شاہین کہتی ہیں:

ہر لمحۂ نشاط ہے ماتم حیات کا
دل کیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے

مظہر امام کی ''ردا لے جائے گا'' والی مقبول غزل کو سامنے رکھ کر مہدی پرتاپ گڑھی نے بھی غزل کہی اور ماہنامہ ''روشنی'' میرٹھ کے مارچ ۱۹۷۸ء میں شائع کرائی۔ مطلع ملاحظہ کیجئے:

میرے گھر میں کیا ہے وہ جس کو اٹھا لے جائے گا
ایک درد زندگی ہے اس کو کیا لے جائے گا

''روشنی'' کے اس شمارہ میں مہدی پرتاپ گڑھی کی ایک دوسری غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے:

تاروں کا خون کاسۂ شب میں اچھال دے
اے وقت کچھ تو چہرۂ گیتی اجال دے

یہ غزل ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں شامل مظہر امام کی اس مشہور غزل کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے جس کا مطلع ہے:

بے چہرہ منظروں کو بھی مجھ خود و خال دے
اس تیز روشنی میں اندھیرا اجال دے

اس مجموعہ میں مظہر امام کی یہ غزل بھی ہے جس کا ایک شعر ہے:

ہر ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
امیر وقت کا جو کام ہے نرالا ہے

''برگِ آوارہ'' حیدر آباد کے یکم اگست ۱۹۷۸ء میں شامل نجم عثمانی کی غزل پر اس کا پرتو دیکھا جاسکتا ہے:

ہمارے عہد کا دستور ہی نرالا ہے
سحر کا شام، اندھیرے کا نام اجالا ہے

اسی طرح ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں شامل مظہر امام کی یہ غزل بھی ناقدوں کو متوجہ کرتی رہی ہے جس کا مصرعہ ہے:

ہوں صدائے عصر یعنی گنبدِ فردا میں ہوں

اس غزل کو سامنے رکھ کر مجید عاصم نے ''سر کتا آنچل'' سری نگر کے فروری مارچ ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں یہ غزل شائع کرائی تھی۔ چند شعر دیکھئے:

عزم پنہاں کے سہارے جور کی دنیا میں ہوں
گلستاں کی آرزو ہے اور میں صحرا میں ہوں
یادِ ماضی نکہت آوارہ ہے اور کچھ نہیں!
حال کا بھی ذکر کیا، الجھا غم فردا میں ہوں
پیاس کی گہرائیوں کو ناپنے والا ہے کون
کس قدر تشنہ ہوں لیکن پیار کے دریا میں ہوں

آخری مصرع تو سرقے کی ذیل میں ہی آئے گا۔ مظہر امام کے مجموعہ ''پچھلے موسم کا پھول'' میں شامل ایک غزل کا مشہور مطلع ہے:

تم نے شب ہجراں کی مجھ کو جو دعا دی ہے
میں نے بھی چراغوں کی لو اور بڑھا دی ہے

یہ دوشعر بھی دیکھیے:

شبنم ہو کہ موتی ہو، تاما ہو کہ آنسو ہو
میں نے ترے رستے میں ہر چیز سجادی ہے
کشمیر کی غزلوں پر احسان اسی کا ہے
لفظوں کو بتادی ہے ہونٹوں کو نوا دی ہے

اس غزل سے متاثر ہوکر شبانہ نذیر نے ''بیسویں صدی'' دہلی کے جون ۱۹۹۳ء میں اپنی غزل شائع کرائی تھی:

در کھول کے زنداں کے ہر قید اٹھادی ہے
لیکن مرے ہونٹوں پر اک مہر لگادی ہے
صحراؤں سے ہم گزرے کانٹوں کو لہو دے کر
ہر موڑ پہ منزل کے اک شمع جلا دی ہے
تعبیر ملے شاید اب کل کے مورخ کو
ہم نے نئے خوابوں کی تصویر سجادی ہے

اس سے متاثر ہوکر شہزاد نام کے کسی شاعر نے ''اجالا'' کلکتہ کے ۸/اپریل ۱۹۹۳ء میں یہ غزل شائع کرائی:

شکریہ اس کا، کہ آنکھوں میں نمی رہنے نہ دی
غم نہیں اس کا کہ ہونٹوں پر ہنسی رہنے نہ دی
رخ پہ گو گردِ کدورت بھی جمی رہنے نہ دی
بے کراں افسردگی میں بھی کمی رہنے نہ دی
تشنگی کا پاس بھی رکھا یہ حسنِ احتیاط
بھر دیے سب جام، مے میں سرخوشی رہنے نہ دی

ہر چند اس غزل میں 'دیا' کی جگہ 'نہ دی' کا استعمال ہوا ہے، لیکن خیال اور لفظیات کی مماثلت نمایاں ہے۔

اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مظہر امام کی غزلیں ہمعصروں اور نئی نسلوں میں کتنی مقبول ہیں!

☆☆☆

نظام صدیقی

خواب سراب: ایک فریب شکستہ فوق متنی المیہ ناول

نظام صدیقی الہ آباد اتر پردیش میں یکم جنوری ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں گریجویشن کے بعد پیرس کی ایک یونیورسیٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کی درس وتدریس دیتے رہے۔ ویسے اردو، ہندی، فارسی، فرانسیسی، اسپینی اور انگریزی زبان پر دسترس رکھتے ہیں۔ اردو میں آپ کی دس، انگریزی میں تین اور فرانسیسی میں ایک کتاب کے علاوہ تخلیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اردو میں آپ کی کتاب ''مابعد جدیت سے نئے عہد کی تقلیدیت تک'' پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ ویسے ان کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: ناقد اور شاعر اور ''شکستہ آئینے'' (افسانوں کا مجموعہ) بھی مشہور زمانہ ہے۔ نظام صدیقی کو فرانس کے ایک ادارہ سے عالمی انعام بھی مل چکا ہے۔ اردو ادب کی تمام اصناف میں نئے عہد کی تقلیدیت کا مابعد جدیدیت کے وسیع تر تناظر میں گہرا نوفکریاتی تجزیہ اور تحریر آپ کے ذریعہ ہی آیا ہے۔ ان کی تنقید میں نئی جمالیات، نئی قدریات، نئی علمیات، نئی وجودیات اور نئی عرفانیات کا عمیق ترین مطالعہ اور مکاشفہ ملتا ہے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے مابعد جدید تناظر میں نئے عہد کی تخلیقیت کا آنا طوفیا (Distopia) انیس اشفاق کا تخلیق کردہ ناول ''خواب سراب'' وجود پذیر ہوا ہے جو لکھنو کے شہر آشوب کی روح میں گردش کرتا ہوا ایک بڑا ناولاتی نگار خانہ رقصاں ہے۔ یہ نئی فوق متنی ناولاتی تخلیقیت کا امین ہے اور بیک وقت اردو کی فرسودہ ناولاتی مردہ روایت اور زندہ، متحرک و نامیاتی روایت کی جست گاہ سے یکسر نئی تکنیکی زقند بھر کر نئی اضافی تخلیقیت، نئی اضافی معنویت، نئی اضافی معاصریت اور نئی اضافی فنیت سے ہمکنار ہو گیا ہے۔ ''لکھنوٴ کی عظیم فکشن تثلیث'' قرۃ العین حیدر، نیّر مسعود اور انیس اشفاق پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کا مجموعہ ''کتبے پڑھنے والے'' ناولٹ ''دکھیارے' در شہر دوستداراں (یادنامۂ کراچی) اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ہندی کے افسانہ نگار و ناول نگار نرمل ورما کے فکشنی شہ پارے ''کوے اور کالا پانی'' کے ترجمے بھی اردو دنیا میں خاصے مقبول رہے ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل ان کا تازہ ترین ناول ''پری ناز اور پرندے'' ملا ہے۔

انیس اشفاق کے ناول ''خواب سراب کی نئی فوق متنی ناولاتی تخلیقیت کی تفہیم، تعبیر اور تنویر کے لئے نئی افسانوی اور ناولاتی بین المتونیت کی تکنیک کی آگاہی ناگزیر ہے جو مابعد جدید فکشن کے چند تخلیقی

تصورات میں ایک ہے۔ حقیقی زندگی کا فکشن پریوں اور دیوزادوں کے قصوں، اسطوری فسانوں، داستانوی مختصر اور طویل بیانیوں اور تمثیلوں کے برخلاف جدید کردار کا حامل تھا۔ حقیقت نگاری، رومانویت نویسی کے برخلاف جدید تھی۔ نو حقیقت نگاری کا ارضی عمرانی رویہ، داخلی نو حقیقت کا اکسراتی رویہ، گارسیا مارکیز کی جادوئی حقیقت نگاری یا فریبِ نظر پرور حقیقت نگاری، جارج لوئی بورہس (بورخیز غلط ہے) کثر نتزاکی، حوزے ساراما گو، انالوکالونو، اور ہان پا فک اور میلان کنڈیرا کی میٹا فکشنی حقیقت نگاری (فوق افسانوی اور ناولاتی حقیقت نگاری) ترقی پسندی اور جدیدیت پسندی کے برخلاف مابعد جدید ہے۔ یہ فوق افسانوی اور ناولاتی متن پر زور دیتی ہے جو بنیادی طور پر بین المتونیت پر منحصر ہوتی ہے۔ درحقیقت جدیدیت متن (Text) کو اولین معنویت اور اہمیت دیتی تھی۔ مابعد جدیدیت فوق متن (Meta Text) کو زیادہ معنویت اور اہمیت دیتی ہے۔ خواہ شاعری ہو، خواہ افسانہ یا ناول ہو۔ وہ فوق افسانوی (Meta Fiction) پہلو پر اصرار کرتی ہے۔ اس کے فنی اور جمالیاتی رو سے ایسا متن تخلیق کرنا ناگریز ہے جو کسی دوسرے فن کار کی شہرۂ آفاق تخلیق کو موضوع تحریر بناتا ہو اور ان میں نئے معانی و مفاہیم کی نئی دریافت کی کوشش کرتا ہو اور یہی تکثیری معنویاتی تلاش مدام تلاش فوق متنی افسانوی اور ناولاتی شاہکار کے تار و پود کی تخلیق کرتی ہے اور اس کی مخصوص و منفرد جگمگاتی شناخت بھی بنتی ہے۔ یہ اکثر مفروضہ افسانوی اور ناولاتی حسن پارہ یا صداقت پارہ کی نئی تفسیر، تعبیر اور تنویر کرتی ہے اور اکثر اوقات اس پر خاراشگاف اور زلزلہ پیما نقد و تبصرہ کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر فوق متن اپنی تخلیقی افہام و تفہیم خود تخلیق کرتا ہے۔ اس وجہ سے مابعد جدیدیت بین متنی کارکردگی کو بہت اہمیت دیتی ہے اور بین متن کو ہی حقیقت اور جواز حقیقت سمجھتی ہے۔ اس کی تفہیم و تنقید کے لئے روایتی ترقی پسند تنقید اور روایتی جدیدیت پسند تنقید ناکافی اور غیر معتبر ہے۔ اس کے لئے ''نیو کلیاتی فوق متنی تنقید'' لابدی ہے۔

مابعد جدید فکشن پہلے کے افسانوں اور ناولاتی اسالیب کی بازآبادکاری یا پہلے کی فکشنی تکنیکوں کی باز تخلیق، تشکیل و تعمیر (Pastiche) پیروڈی، ذو معنویت (Fun) اور نشانیاتی و معنویاتی پیچیدہ بیانی یا طرفہ بیانی (Innuenda) سے منور ہوتا ہے۔ اور ہر نوعیت کی الفاظ کی بازیگری اور معنویاتی تہداری اس کی پہچان ہے۔ اس کو فوق متن (Paratext) یا (Surtext) سے ہی موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کلاسیکی متن پر نئی تخلیق کی نو تخلیقیت اور معنویت افروزی ہے۔ یہ اس کی کثیر سطحی از سر نو ابتدا اور از سر نو ذہنی دعوت اور قرآتی شراکت ہے یا پرانے شہ پارے کی بیک وقت از سر نو قبولیت اور نئی معنویت آفرینی ہے۔ یہ نت نئے معانی کے آزادانہ کھیل پر زور دیتی ہے۔

انیس اشفاق کا تخلیق کردہ ناول ''خواب سراب'' مرزا محمد ہادی رسوا کے شہرۂ آفاق کلاسیکی ناول ''امراؤ جان ادا'' کی ردتشکیل کر اس میں نئی اضافی سچائیوں، نئے کرداروں، نئے وقوعوں، نئی کیفیتوں اور نئے معانی ومفاہیم کی نئی دریافت کرتا ہے اور یہی تکثیری معنویاتی اور کیفیاتی تلاش مدام تلاش اس گراں قدر فوق متنی ناول کے تاروپود کی نت نئی تخلیق کرتی ہے اور مابعد جدید تناظر میں نئے عہد کی تخلیقیت کے نئے انوکھے اور البیلے موسموں کا پتہ دیتی ہے۔

''اگر نانی (امراؤ جان ادا) کو پھسلا کر اپنی حویلی سے باہر نہ لایا گیا ہوتا تو.....آج ہم اس حال کو نہ پہونچتے''۔ یہ سن کر میں نے کہا: ''شہبا کی موت کے بعد جب آپ ہمارے یہاں آئی تھیں، یاد ہے؟''

''یاد ہے۔'' سبیلہ نے کہا۔

''تو آپ ہی نے کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا؟''

''جو کچھ ہوا۔ اگر وہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو نہ ہوا ہوتا۔'' یہ سن کر سبیلہ نے میرے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

پھر بولیں: ''ایک بات کہوں''

''کہئے۔''

''اگر آپ نہ ملے ہوتے تو میں......''

''تو میں..............''

''ٹوٹ چکی ہوتی۔ آپ نے ٹوٹنے نہیں دیا۔'' سبیلہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''نانی کا دکھ، اماں (شمیلہ خانم) کی بیماری..... مجھے زندہ نہ رہنے دیتی۔'' یہ جو ہم مہدی گھاٹ سے دریا کے کنارے یہاں تک آئے ہیں، کس لئے آئے ہیں؟''

''کس لئے آئے ہیں؟''

''اپنے روشن دنوں کی یاد تازہ کرنے اور آپ ساتھ نہ ہوتے تو ہم یہاں تک نہ آپاتے۔ چلئے اب ہم اپنا دسترخوان بچھائیں۔'' یہ کہہ کر سبیلہ نے سیڑھیوں کے سامنے ایک سایہ دار درخت کے نیچے وہی چادر بچھائی جو ناشتے کے لئے بچھائی تھی۔ صفحہ: ۴۲۸

جب میں تعریف کر کر کے دو تین نوالے کھا چکا تو سبیلہ نے ایک نوالہ میرے منہ میں رکھتے ہوئے کہا ''یہ شہبا کی طرف سے اس کی روح کو خوش کرنے کے لئے۔''

ISSN No. : 2395-2016

وہ نوالہ بہت دیر تک میرے منہ میں رہنے کے بعد میرے حلق سے نیچے اترا۔ کھانا کھانے کے بعد سبیلہ دریا پر گئیں اور کنارے پر آتی ہوئی موجوں میں گٹوں تک اپنے پاؤں ڈبو کر بولیں: ''جی چاہتا ہے۔ اسی پانی سے گزر کر اس پار ہو آؤں۔'' پھر میری طرف دیکھ کر کہا: ''لیکن اب نہ وہاں رمنہ ہے نہ رمنے کے وہ باسی جن کے لئے ہمارے پرنانا (نواب علی تقی بہادر) یہاں آتے تھے۔'' ص: ۴۲۸

''خواب سراب'' میں زندگی کی بلندیوں، پستیوں، ہمواریوں اور ناہمواریوں کے جدلیاتی منظر نامہ کے اصول حقیقت اور اصول خواب میں ذاکیہ بیگم، جہاں دار بیگم، تقیہ بیگم آدرشی حقیقتوں کی امین نا قابل فراموش عینی کردار ہیں۔ زندگی کی حقیقی جدوجہد میں ان کی کرداری عظمتوں سے انسانی نیکی، قربانی، سچائی اور انسانیت پر ایمان اور بھروسہ تازہ ہو جاتا ہے۔ حالات کی سنگلاخ حقیقتوں سے دوچار کاروبار تمنا میں مبتلا امراؤ جان ادا، امراؤ بیگم، سردار بیگم، پھر ازالۂ صحر کی قتیل امراؤ جان ادا اور ان کی بیٹی شمیلہ خانم کے ناولاتی کوائف سے زندگی کی ناہمواریوں اور المیوں کا جانکاہ احساس اور دردمند شعور بیدار اور متحرک ہوتا ہے۔ اس نوناولاتی رنگ مالا میں شہبا، سبیلہ، ہنگا اور کمو ان دل شکستہ اور فریب شکستہ خواتین کی نئی ''سب ہاری پیڑھی'' ہیں۔ تاہم ان کی روح میں شدید احتجاج، حقیقی مزاحمت اور ناقابلِ تسخیر عقاومت کی جاگرتی کارفرما ہے۔ ان میں کوئی دستکارہ ہے۔ کوئی خود زائیدہ اور خود تربیت یافتہ مصورہ اور صحافیہ ہے۔ کوئی راگ راگنیوں سے آشنا مغنیہ اور سنگیت کارہ ہے ان کی بابت علی حیدر شمیلہ خانم کی بات کاٹتے ہوئے کہتا ہے۔

''ایسی باتیں مت کیجئے۔ میں تو بس ایک بات جانتا ہوں۔''

''کیا؟''

''سبیلہ اور شہبا...... ہنگا اور کمو...... ایسے اچھے دل والی لڑکیاں جہاں بھی ہوں۔ دنیا اچھی لگنے لگے۔ یہ سن کو شمیلہ خانم کے چہرہ پر چمک آگئی۔ ص: ۴۰۳

لیکن ان سب اچھے دل والی لڑکیوں کو جائداد و املاک کے بھوکے سنگ دل رشتہ داروں، سگے سمبندھیوں کی انسانیت کی غیر انسانیت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس ہمہ گیر اور ہمہ جہت اندھیرے کے یلغار میں حکیم صاحب کا انسانیت آگیں اور انسانیت نواز کردار روشنی کا مینار محسوس ہوتا ہے۔ حتی کہ بالآخر ان کے اندر نہایت فطری طور پر زندگی اور موت کی قبولیت کا حکیمانہ شعور و عرفان بیدار ہو جاتا ہے۔ ''خواب سراب'' کرداری ناول ہے۔ یہ جیتے جاگتے کرداروں کا آئینہ خانہ ہے۔ خود علی حیدر زندگی کے موج حوادث سے جوجھتا اور اکیلے پن کی بھول بھلیوں کو جھیلتا لکھنؤ کی عوامی اور تہذیبی زندگی کے نشیب و فراز میں گھومتا ہوا آئینہ شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ مرزا رسوا کے مخطوطات کی تلاش میں اس کا ذہنی سفر مدام سفر

متواتر جاری رہتا ہے۔

''خواب! سراب'' کے تخلیقیت افروز ناول نگار انیس اشفاق انیسیات داں کے علاوہ لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کے عارف بھی ہیں۔ ''مرثیہ کلچر'' کی رسومات، دستوریات، شعریات اور قدریات کے صحیح ادراک وعرفان کے بغیر شہباز، سبیلہ اور علی حیدر کے باطنی ارتعاشات، ارتسادات اور جذباتی وکیفیاتی تحریمات کو صحیح معنوں میں مدروک ومعروف نہیں کیا جاسکتا ہے نہ ہی اس کی نفسیاتی معرفت نصیب ہوسکتی ہے کہ پابندی میں آزادی اور آزادی میں پابندی کی ''انضمام ضدینی کیفیت'' کی حرمت کیا ہے؟ ناموس ایمانی کا تقدس کیا ہے؟ پاس ناموس عشق کا رمز کیا ہے؟ ''خواب! سراب'' کی دل شکستگی اور فریب شکستگی کا عظیم ترالمیہ کیا ہے۔ علی الخصوص محرم کے عاشورے کے دس دنوں میں سیہ پوش مجلسوں میں لکھنؤ کی ثقافتی مقامیت افروزی (Topology) اور علامتی تنویر آفرینی (Tropology) ناولاتی سادگی اور پرکاری کی شان معراج ہے۔ اس میں بین العلومی اور بین الفنونی رتائی کرشموں کا حسن استعمال نہایت کیمیا تاثیر اور باطن افروز ہے۔ محرم کی ماحولیاتی، فضایاتی، علاماتی اور اشاراتی نور آفرینی میں علی حیدر اور سبیلہ کے محسوساتی امتزاز اور لاشعوری حرکات وسکنات کی باطن افروزی کی معنی خیز اشاریات آفرینی معجزہ فن کا برجستہ جلوہ نمو ہے۔

جوئندہ یابندہ کے مصداق ایک دن محسنہ تاجدار بیگم کی حویلی میں ہی ان کے عمو جان مرزا رسوا کے کتاب خانہ کے ڈھیر سے شہبا نے علی حیدر سے قبل مرزا ہادی رسوا کا اولین غیر مطبوعہ مسودہ ڈھونڈ نکالا اور بہت سارے اہم نوٹس بناڈالے جن سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ امراؤ جان ادا فیض علی کے ساتھ لکھنؤ سے کانپور گئی اور وہاں ان سے باقاعدہ نکاح کے بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن فرنگیوں کے ہاتھ فیض علی کے دار ورسن کی آزمائش سے گذرنے کے بعد وہ کانپور سے لکھنؤ واپس آگئیں تھیں۔ لیکن انہوں نے اب مکمل طور پر تائب ہوکر مرنے سے قبل تک گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ کیوں ٹھان لی تھی؟''

جویائے صداقت علی حیدر اپنی سچی لگن اور ذہنی جستجو کے باعث لکھنؤ کے اشرافی اور اجلافی جیتے جاگتے کرداروں علی رضا، نادر آغا سرتاج مرزا، موذن اور پیش امام سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے دبنگ ظہیر حسن ظہیرو، ٹنڈے کبابچی، رحیم نہاری فروش اور کسبی خالدہ کی تماشہ آرائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، بات بات پر بیڑی کا کش لیتی سردار جہاں کی صحیح نشاندہی سے اخیر کار وہ امراؤ جان ادا کی بیٹی شمیلہ خانم اور ان کی نواسی سبیلہ تک پہونچ گیا۔ علی حیدر کی ذہنی اور روحی رفیقہ شہبا کے مانند سبیلہ بھی ناگ پھنی میں الجھی ہوئی سانسوں کے باوجود نہایت ذہنی توانائی کے ساتھ زندگی کا مقابلہ کررہی تھی جبکہ شمیلہ بیگم اپنے شوہر حیدر حسین خاں کی فریب دہی سے دل میں ''چھید ہونے'' کے باوجود ''باز گویائی'' کی خوگر ہوگئی تھیں۔

ISSN No. : 2395-2016

"جب بات کوٹھا چھوڑ کر نکاح میں آنے کی آئی تو مرزا صاحب اماں کو چاہنے کے باوجود ڈھل مل ہو گئے۔ معاملہ آج کل پر ٹلنے لگا اور جب اماں نے کوٹھا چھوڑنے کی زیادہ ضد کی تو مرزا صاحب کنی کاٹنے لگے پھر کوٹھے پر آنا چھوڑ دیا۔ اماں نے ادھر ادھر سے ان تک پیغام پہونچوائے۔ کوٹھے پر نہ آنے کا سبب جاننا چاہا۔ مگر ان کی طرف سے خاموشی رہی۔ مرزا صاحب کی بزدلی اور بے رخی سے اماں ہماری ٹوٹ گئیں اور یہی وہ زمانہ تھا جب ہمارے ابا فیض علی نے کوٹھے پر آنا جانا شروع کیا اور جب انہوں نے سچے دل سے اماں کے ساتھ رہنے کا عہد کیا تو اماں کو جو پوری طرح ٹوٹ چکی تھیں۔ انہیں ایک سہارہ نظر آیا اور وہ ابا کے ساتھ کوٹھے سے نکل آئیں۔" یہ بتا کر شمیلہ خانم نے آگے کہنا شروع کیا: "ادھر مرزا صاحب کو اماں سے کیا ہوا عہد پورا نہ کر پانے کی پشیمانی بہت تھی۔ اس لئے جب وہ کتاب لکھنے بیٹھے تو اپنی پشیمانی کو مٹانے کے لئے قصے میں یہ حصہ بڑھا کر اپنی جگہ نواب سلطان کو رکھ دیا۔ خود کو رکھتے تو خاندانی شرافت پر حرف آتا۔ نواب سلطان میں ساری صفتیں وہی ہیں جو مرزا صاحب میں تھیں۔ شاعری کا شوق، شعر کا سمجھنا، بات بات میں فارسی کے فقرے استعمال کرنا۔ پھر یہ کہ مرزا صاحب ناچ گانے اور شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ سپہ گری میں بھی کم نہ تھے۔ علی مد، بانک اور بنوٹ کے ماہر تھے۔ قصے میں انہوں نے خاں صاحب کا جو حشر دکھایا سو دکھایا۔ اماں کہتی تھیں۔ اصلی دنیا میں بھی کوئی ان کے منہ کو آتا تو منہ کی کھاتا۔ مرزا صاحب نے چھپے ہوئے قصے میں اماں اور نواب سلطان میں جو لاگ لگاؤ والی باتیں دکھائی ہیں وہ بالکل ویسی ہی ہیں جیسی اماں نے ڈھکے چھپے مجھے بتائیں تھیں۔ ویسے ایک نواب سلطان حقیقت میں جو خوشی کے خاص خاص موقعوں پر اپنے یہاں مجرے کراتے تھے۔ لیکن کوٹھے کا منہ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ سرائے معالی خاں کے آگے ان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ انہیں نواب سلطان کے بیٹے خورشید بہادر کے یہاں ایک مجرا میں نے بھی کیا۔" (ص: ۳۴۵)

داستان ہی کے انداز میں پورا قصہ سنا کر شمیلہ خانم بولیں!

"تو ایسے تھے منشی الطاف حسین داستان گو!"

"لیکن آپ نے بھی کمال کر دیا"۔ میں نے کہا ــــــ "پورا قصہ یوں سنایا کہ داستان کا مزہ آ گیا"۔ یہ کہہ کر میں کہیں کھو گیا۔

دن کا دوسرا پہر گزر چکا تھا، سبیلہ کمرہ میں آ چکی تھیں۔ میرے گم صم ہو جانے پر شمیلہ خانم نے پوچھا: "کہا کھو گئے؟"

"کچھ نہیں۔ ماں یاد آ گئیں۔ اسی طرح وہ بھی سناتی تھیں داستانیں۔"

میرے یہ کہنے پر سبیلہ نے مجھے افسردہ نگاہوں سے دیکھا۔

''داستان کی بات نکلی تو اب تمہیں یہ بھی بتادوں کہ نواب خورشید بہادر بھی داستان بن گئے جہاں ان کا محل تھا۔ کچھ ہی برسوں میں وہاں الو بولنے لگے۔ سب کچھ ناچ گانوں اور دوسرے شوق میں اڑادیا۔ سنا ہے نوے کی عمر کے ہیں۔ چلنے پھرنے میں معذور ہیں۔ جہاں ان کا محل تھا وہیں سے کچھ دور ایک شکستہ مکان میں اپنی پوتی کی دال روٹی پر زندہ ہیں۔''

انیس اشفاق مرزا محمد ہادی رسوا کے گندم نما جو فروش اشرافی اقدار کے محافظ خانہ کے محفوظات اور پوشیدہ کرداری تحفظات کی بے محابا ردتشکیل کردیتے ہیں اور ناقابل تسخیر اخلاقی جرأت کے ساتھ امراؤ جان کی بیٹی شمیلہ خانم اور نواسی سبیلہ کی فطری نسوانی مزاحمت، احتجاج اور مقاومت کی شدید آرزومندی کو بھی برافگندہ حجاب کردیتے ہیں۔ یہ امراؤ جان ادا کے حقیقی وجود، حقیقی احتجاجی آواز اور ان کی حقیقی آرزو مندی کے غائب کردینے کی اداریاتی واردات کے خلاف حقیقی انسانی احتجاج کی شدید ترین صدائے بازگشت ہے۔ ۱۹۹۹ء میں شائع شدہ ''امراؤ جان ادا'' ناول کا وہ حصہ ہی اردو داں طبقہ کی یادداشتوں میں بڑی حد تک محفوظ ہے جس کا تعلق انیسویں صدی کے اشرافیہ کے پوشیدہ مفادات اور ''یہ حویلی والیوں کے کوٹھے کلچر'' کی نام نہاد رسومیاتی اخلاقیات سے ہے۔ امراؤ جان ادا کی مصلحت باختہ ''رسوائی تعبیر'' ہی اردوئی قارئین کے اجتماعی شعور میں نہایت پختگی سے کھدی ہوئی ہے۔ اس لئے امراؤ جانیت کی حقیقی نسائی مزاحمتی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی ہے جو اس کے نسوانی باغیانہ کردار کا جوہر اصل ہے۔ وہ کہیں وقت کی مختلف گردشوں کے بعد بے بسی اور بے توقیری کی دیواروں کے پیچھے کھو چکا ہے۔ اس کا نفسیاتی تعلق کرداری تباہی، مظلومیت، عدمیت اور غیاب سے ہے۔ ژاک دریدا اپنے اہم مقالہ ''محافظ خانہ کا بخار! ایک فرویڈی تاثرنامہ'' میں اس امراؤ جانی رویہ کو ''تصور جبلت مرگ'' سے تعبیر کرتا ہے۔''

''خواب سراب'' کے مرکزی کردار علی حیدر نے امراؤ جان ادا کی اصل موت گرفتہ حقیقت اور ان کی ایک اولاد شمیلہ اور ان کی نواسی سبیلہ کے شدید وجودیاتی احتجاجی، مزاحمتی اور مقاومتی رویہ اور برتاؤ کو مرزا رسوا کے ہی دوسرے گم شدہ مسودہ کے نہاں خانہ راز کی محفوظاتی گپھا کے ''پس نوشت'' سے ہی بازیافت کیا ہے جن کو ''شریف زادہ'' بننے کا خبط تھا۔ پورے ناول میں شروع سے آخر تک علی حیدر کی روح تجسس (Sprit of Enquiry) برقرار رہی ہے۔ اس ذہنی تلاش مدام تلاش میں معاون شہبا ایک ناقابل فراموش انتہائی خوددار محنت کش کردار ہے جو اس کی اولین ذہنی اور روحانی رفیقہ ہے اور یوسفہ بھی! ص: ۱۹۲ تا ۱۹۳ خاطر نشان کیجئے۔

ISSN No. : 2395-2016

''میں نے مسودہ اور جو کچھ تم نے کاپی میں لکھا تھا۔ سب پڑھ ڈالا۔'' پھر کہا: ''تم نے جس محنت سے کتاب پڑھی اور جس طرح بدلی ہوئی عبارتوں کو ڈھونڈ کر نکالا۔ وہ تمہیں کر سکتی تھیں۔

یہ سن کر شہبا کے چہرہ پر خوشی کی ہلکی سی لہر آئی۔ (درحقیقت دوسرا گمشدہ مسودہ شہبا نے جہاں دار بیگم کی حویلی کے کتاب خانہ میں علی حیدر سے پہلے ڈھونڈ نکالا تھا۔)

''چلئے محنت سُوارت ہوئی۔''

''بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ میں نے کہا۔'' امراؤ جان کا نواب زادی ہونا، خانم کے خاندان کا حال ،فیض علی کا امراؤ جان کے ساتھ نکاح پڑھوانا، امراؤ کا اولا دوالی ہونا۔ یہ کہہ کر میں نے شہبا سے کہا۔

''آخر کو سردار جہاں کی بات سچ نکلی۔ میرا جی چاہتا ہے۔ ابھی جا کر ان سے بتاؤں۔''

پسِ نوشت! مرزا صاحب! میری زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ میں بہت سے عارضوں میں مبتلا ہوں۔ بہت جلد میری آنکھ بند ہونے والی ہے۔ لیکن خدارا اپنی آنکھیں کھلی رکھئے گا اور گاہے گاہے میری بیٹی شمیلہ کی خیریت لیتے رہئے گا۔ میں اسے ناچ گانے کے پیشے میں نہیں لانا چاہتی۔ میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ وہ بہت دن آرام سے گزارنے لگی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ (ختم شد) ص:۱۹۰)

انیس اشفاق سے امراؤ جان ادا، ان کی اولاد شمیلہ خانم اور ان کی نواسی سبیلہ کی مسلسل بدلتی ہوئی تاریخی اور تہذیبی معنویت کو اکیسویں صدی کے دوسری دہائی کے نئے عہد کی تخلیقیت کے تناظر میں نہایت فطری طور پر حقیقی حرکی تانیثی معنویت بخش دی ہے۔ یہ ابدیت کے صفحے پر خدا کی دستخط ہے۔

علی حیدر نے اپنی ناولاتی تخلیقیت افروزی کے آخری موڑ پر بڑی دلجوئی اور غمگساری سے شمیلہ خانم سے دریافت کیا۔ ''آپ کی ماں کے لکھنو آنے کے بعد..... مرزا رسوا ان سے ملنے آئے۔''

''نہیں۔ میرے ہوش سنبھالتے تو نہیں آئے۔'' شمیلہ خانم نے کہا ___ اور پہلے بھی آئے ہوتے تو اماں جیسے انہوں نے سب باتیں بتائی تھیں، یہ بات بھی بتاتیں۔'' یہ کہہ کر بولیں: ''وہ آتے بھی تو اماں انہیں دروازے سے واپس کر دیتیں۔''

''اور جب آپ بڑی ہوئیں تو آپ سے ملنے آئے۔''

''نہیں مجھ سے بھی نہیں۔'' میں بھی اگر وہ آتے، اماں کی طرف دروازہ نہ کھولتی۔ شمیلہ خانم بولیں۔ ''انہوں نے اماں کا قصہ چھاپ کر اور غلط طرح چھاپ کر اچھا نہیں کیا۔'' پھر بولیں ___ ''یہ جو میں تمہاری کتاب پڑھنا چاہتی ہوں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بھولے سے کوئی ایسی بات نہ چلی جائے جس سے سبیلہ کو تکلیف

ISSN No. : 2395-2016

پہنچے،اسی طرح جیسے اماں کے قصہ سے مجھے پہنونچی ہے۔'' (ص:۴۰۹)

علی حیدر مرزا رسوا کے دوسرے گمشدہ مسودہ کی بازیابی کے بعد امراؤ جان ادا کی بیٹی شمیلہ خانم اوران کی نواسی سبیلہ کی رفاقت سے حقیقی تخلیقی فیضان حاصل کر مرزا رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کی ساخت شکنی کر دیتا ہے تاہم یہ جویائے صداقت علی حیدر شمیلہ خانم اور سبیلہ کی اچانک یکے بعد دیگر کی جاں گسل موت سے یکسر دل شکستہ اور فریب شکستہ ہو جاتا ہے۔ اس بیکراں جان گداز کے باعث وہ ''امراؤ جان ادا گم گشتہ'' کے بجائے اپنی باز تخلیق کردہ ''امراؤ جان بازیافتہ'' کو ان آرزومند ماں بیٹی کے حضور پیش نہیں کر پاتا ہے۔ ستم بالائے ستم ان الم نصیب ماں بیٹی کی تدفین کے سلسلہ میں لکھنؤ کی کربلاؤں اور قبرستانوں کا جغرافیہ، تواریخ اور اقتصادیات کا سفاک ترجیحی نظام اور ان کی پوشیدہ مفاد کی بدترین اشرافی اور اجلافی جنگ حد درجہ صدمہ زدہ مغموم علی حیدر کے لئے انتہائی روح فرسا ہے۔ تاہم اس کی بے لوث انسانی جدوجہد کامیاب ہوتی ہے اور ان مظلومین کا بالآخر شہر خموشاں میں جگہ مل جاتی ہے۔

انجام کار نہایت فطری طور پر علی حیدر بیکراں تنہائی کی دلگداش بھول بھلیوں میں مبتلا تو ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی شستہ اور شائستہ ذات میں اس کی مرحومہ متقی داستان گوا تالیقہ ماں ذاکیہ بیگم کی قلبی اور روحانی کیمیا تاثیر رفاقت کے فیضان سے اس کے وجود کی پوری کھلاوٹ کا تخلیقی امکان بھی پوشیدہ ہے۔ Total Flowering of the Being (کیسر کے گارد)

۴۵۲ صفحات کے اس فوق متونی ناولاتی آفاق کے کارگہہ شیشہ گری کا کام بہت نازک اور مینا کار ہے۔ اس کی بیک وقت جمالیاتی اور قدریاتی مینا کاری ایک انوکھی نوعیت کی حیاتی مسرت (Plaisir) غایت نازک ترین محسوساتی لذت (Juissance) اور کبھی کبھی نشاطِ روح یا کیفِ سرمدی (Bliss) کا زندہ اور دھڑکتا ہوا ادراک وعرفان بھی بخشتی ہے۔ لیکن بیکراں وجودی کرب کو مسلوب بھی نہیں کرتی ہے اور نہ ہی بے پایاں موجودی کرب کا گھٹاٹوپ اندھیرا ''انضمام ضدنیتی سطح پر نازک ترین جمالیاتی مسرت اور محسوساتی لذت کو اوجھل کرتا ہے۔ ''خواب سراب'' اردو کے یادگار ناولاتی ادب میں ایک ناقابل فراموش اضافہ ہے جو ئی رفیع اور برتر صداقت افروزی کی ''چشم بینا'' عطا کرتا ہے۔ علی حیدرِ وجود آزاد کا اعلامیہ ہے۔ نخشتمالی اعلامیہ! یہ نخر البلاغہ کے علی حیدر اور منشی رتن ناتھ سرشار کے ''فسانہ آزاد'' کے تخلیقیت افروز امتزاجیہ ہے اور لازوال فکشنی کردار ہے۔

☆☆☆

پروفیسر محمد ظفرالدین

اُردو شاعری میں خواتین پر تشدد و استحصال

پروفیسر محمد ظفرالدین کا آبائی وطن گیا (بہار) ہے۔اُن کی پیدائش 31 اگست 1965ء کو ہوئی۔ابتدائی تعلیم گیا ہی میں ہوئی۔ہادی ہاشمی ہائی اسکول سے میٹرک اور اور مرزا غالب کالج سے آئی ایس سی پاس کرنے کے بعد دہلی یونیورسٹی کے تاریخی کالج' ذاکر حسین کالج سے بی اے اُردو آنرس کیا۔پھر کروڑی مل کالج سے ایم اے کیا۔دہلی یونیورسٹی ہی سے ایم فل کی تکمیل کی۔1996ء میں اُنہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔اُن کے مقالوں کے موضوعات بالترتیب ''نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری'' اور ''اُردو ناول کے فن اور تکنیک کا تنقیدی مطالعہ'' تھا۔اُنہوں نے اپنے دونوں ہی تحقیقی کام ممتاز ترقی پسند ادیب پروفیسر قمر رئیس کی نگرانی میں مکمل کیے۔اِسی دوران وہ شمالی ہندوستان کے مقبول ترین روزنامے قومی آواز سے وابستہ ہوگئے۔پندرہ سالہ صحافتی تجربے کا سلسلہ اُن کے نئے ذریعہ معاش سے بھی جڑ گیا جب وہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی 1998ء میں اُس کے پبلک ریلیشنز آفیسر کے طور پر وابستہ ہوگئے۔2004ء میں شعبہ ٹرانسلیشن اسٹڈیز میں ریڈر اور 2008ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔فی الحال اِس شعبے میں چوتھی مرتبہ صدراتی ذمہ داری انجام دے رہے ہیں۔اِن دنوں ڈائرکٹر' ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے عہدے پر بھی فائز ہیں جہاں سے اب تک 36 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اُنہوں نے یونیورسٹی میں بعض تدریسی وانتظامی ذمہ داریاں انجام دی ہیں جن میں چند یہ ہیں: ڈین اسکول آف لینگویجز' ڈین اسکول آف ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم' چیف پراکٹر' پی آر او' میڈیا کوآرڈینیٹر' آنریری ویجلنس آفیسر' ڈائرکٹر ڈسٹنس ایجوکیشن' ڈائرکٹر مرکز برائے اُردو زبان'ادب وثقافت' آنریری ڈائرکٹر سنٹرل لائبریری' کنٹرولر آف ایگزامینیشنس وغیرہ۔

''شعر کہنے والی عورت کو اُردو معاشرے نے آہستہ آہستہ اب قبول کیا ہے۔پرانے وقتوں کی بیشتر شعر کہنے والی عورت یا تو بیگمات اور شہزادیاں ہیں یا پھر ان کا تعلق بالا خانوں اور کوٹھوں سے ہے یا وہ دیویاں ہیں یا گڑیاں ہیں۔ایک جیتی جاگتی Living عورت ہمیں نہیں ملتی۔یہ سانس لیتی عورت ہمیں جدید اُردو شاعری میں دستیاب ہوتی ہے۔''

(خوشبوؤں کا شاعرہ۔پروین شاکر ص۔19)

میں نے اپنی بات پروین شاکر کے اِس اقتباس سے شروع کی ہے جس میں اُنہوں نے اظہار اطمینان کیا ہے کہ چلو اب تو معاشرے نے عورتوں کو شاعری کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔ورنہ پہلے اِن کی حالت کچھ اور ہی رہی ہے۔اُردو شاعرات کے آثار ہمیں بہت پہلے سے ملتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے جن شاعرات کا پتہ چلتا ہے اُن میں سے اکثر نے تشدد' گھریلو تشدد اور استحصال کے موضوعات نظم کیے ہیں۔خواتین شعرا نے عورتوں پر ہونے والے مظالم اور استحصال کو کافی نمایاں کیا ہے۔دراصل مہذب' تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ کہے جانے والے معاشرے میں بھی عورتوں پر تشدد کی مثالیں ہر روز کسی نہ کسی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ادیب و

فنکار' جسے معاشرے کا سب سے زیادہ حساس طبقہ قرار دیا جاتا ہے' بھلا اِس صورتحال کا اثر کیوں کر قبول نہیں کرتا۔ خواتین شعرا کو یوں بھی یہ مسئلہ' اُن کا اپنا مسئلہ محسوس ہوا۔ سماج و معاشرے کا کینوس تو کافی وسیع ہوتا ہے' کئی شاعرات نے اپنے قرب و جوانب میں اور اپنے خاندان میں ایسے مسائل کو دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ بعض نے از خود اِن مصائب کو جھیلا ہے۔ لٰہذا فطری طور پر شاعرات کے یہاں یہ موضوع اُن کے فکر کا حصہ بنا اور نظم کے سانچے میں ڈھل کر قارئین کے سامنے آتا چلا گیا۔ البتہ اِن موضوعات پر راست طور پر نہیں بلکہ اکثر و بیشتر جگہوں پر اشاروں کنایوں میں بات کہی گئی ہے' جو دراصل فنِ شاعری کا تقاضا ہوتا ہے اور جس سے شاعرانہ حسن پیدا ہوتا ہے۔

ایسے کسی بھی تشدد کو جو بنیادی یا ابتدائی طور پر عورت کے خلاف اختیار کیا جاتا ہے' قابل مذمت سمجھا جاتا ہے۔ اِسے صنفی تشدد سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس تشدد کا دائرہ اور اس کی قسمیں بے شمار ہیں۔ یوں کہیے کہ ظلم و ستم کے نئے نئے طور ایجاد اور اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس کا سلسلہ گھریلو تشدد سے لے کر باہر کی دُنیاؤں تک جاری رہتا ہے۔ کسی لڑکی نے محبت سے انکار کیا تو اُس کے اوپر تیزاب پھینک دیا جائے کہ اِسے اپنی خوبصورتی پر بہت ناز ہے۔ اب زندگی بھر جب جب اپنے چہرے کو دیکھے گی' مجھے یاد کرے گی۔ چھیڑ خانی سے کون نہیں واقف۔ اور اس لعنت سے کون سی جگہ پاک ہے۔ اسکول کالج ہو کہ بازار' دفاتر ہوں کہ کوئی تقریب و اجتماع۔ ہر جگہ منچلے اور نوکیلے خرام کرتے ہیں۔ جہاں موقع ہاتھ آتا ہے' ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ ان معروف تشدد کے علاوہ اور بھی بے شمار طریقے ہیں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف سرسری اشارے کی خاطر محض عنوانات پر نظر ڈالیے:

Female genital mutilation ʻBreast ironingʻ Foot binding ʻ
Force-feeding, ʻForced abortion ʻForced marriage
ʻForced pregnancy, Forced prostitution ʻ
Human trafficking ʻBride burning, Dowry death, Honor killing,
Femicide, Infanticide, Matricide,

Rape, Gang-rape وغیرہ وغیرہ۔

اُردو شاعرات کے یہاں اِن تمام تشدد کے خلاف احتجاج' غم و غصہ کی لہر اور اپنے وجود کو تسلیم کرانے کے ساتھ عزت نفس کا احساس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ خواتین کی ناقدری' توہین اور کم مائیگی اُنہیں کچوکے لگاتی ہے۔ اُن کے نوک قلم سے پھر ایسے مصرعے خلق ہوتے ہیں:

ہے رے تیری کیا اوقات!
دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
پُرش کی پنسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تُو پہنی گئی

آگے چل کر یہ نظم لڑکے لڑکی کے فرق کی طرف مُڑ جاتی ہے:

جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا
تیرے پھول سے ہاتھوں میں
تیرے قد سے بڑی جھاڑ ہوتی
ماں کا آنچل پکڑے پکڑے
تجھ کو کتنے کام آجاتے
اُپلے تھاپنا.........لکڑی کاٹنا.........گائے کی سانی بنانا.........پھر بھی مکھن کی ٹکیہ
ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پہ رکھی.........تیرے لیے بس رات کی روٹی.........رات
کا سالن روکھی سوکھی کھاتے.........موٹا جھوٹا پہنتے.........تجھ پہ جوانی آئی تو.........تیرے باپ کی نفرت تجھ

سے اور بڑھی پروین شاکر کی یہ نظم 'بشیرے کی گھر والی' (انکار) اسی تسلسل سے آگے بڑھتی ہے اور کسی لڑکی کی زندگی کی پوری کہانی بیان کرتی ہے۔ اسی طرح اُن کی ایک نظم ہے ٹماٹو کیچپ۔ اس نظم میں سارا نام کی ایک شاعرہ' ادیبوں اور دانشوروں کے نرغے میں ہوتی ہے۔ عمر بھر اُس کی جھوٹی تعریفیں کرکے اُس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ سارا نے بھی اُنہیں لوگوں میں اپنے آپ کو گم کر دیا ہے۔ اور یہ سلسلہ اُس کی موت کے ساتھ ہی تھمتا ہے:

وہ ادیب کی جورُو بننے سے قبل ہی.........سب کی بھابھی بن چکی تھی
ایک سے ایک گئے گزرے لکھنے والے کا دعویٰ تھا.........کہ وہ اس کے ساتھ سو چکی ہے
صبح سے شام تک.........شہر بھر کے بے روزگار ادیب.........اس پر بھنبھناتے رہتے
جو کام کاج سے لگے ہوئے تھے.........وہ بھی.........سڑی بُسی فائلوں اور بوسیدہ بیویوں سے
اُوب کر اِدھر ہی آتے.........سارا دن.........ساری شام.........اور رات کے کچھ حصے تک
ادب اور فلسفے پر دھواں دھار گفتگو ہوتی.........بھوک لگتی تو.........چندہ وَندہ کر کے
نکڑ کے ہوٹل سے روٹی چھولے آجاتے

یہ نظم اُس شاعرہ کے استحصال کی مزید داستان بیان کرتی ہے۔ اور اُن بھیڑیوں کے چنگل سے نکلنے کا واحد راستہ اُسے موت کی طرف لے جاتا ہے۔

کشور ناہید بھی بیسویں صدی کی ایک اہم تانیثی شاعرہ ہیں۔ عورتوں کے حقوق' عورتوں کے وقار اور مقام و مرتبہ کے لیے اپنی نظموں کے ذریعے آواز اُٹھاتی ہیں۔ اِس ضمن میں اُن کی معروف نظمیں نیلام گھر' جاروب کش' اے میری قوم! میری بنتی سُن اور مراجعت وغیرہ ہیں۔ اِن نظموں میں کشور ناہید نہ صرف عورتوں کے مسائل بیان کرتی ہیں بلکہ اُنہیں عزم و ہمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ یہ پدری سماج خواتین کو اُس وقت تک عزت و احترام نہیں دے گا جب تک کہ خواتین خود اپنی اہمیت منوانے کے لیے آگے نہیں آئیں گی۔ نظم 'جاروب کش' میں لکھتی ہیں:

دوسروں کی سیوا.........پتھروں کی سیوا کے برابر ہے.........بہن' بیوی اور ماں کے رشتوں

ISSN No. : 2395-2016

کی خاطر جینے والی.........تم اپنے لیے بھی تو جیو!.........دیکھ کنول کا پھول کیسے عالم اور کیسے ماحول میں اپنی انا.........اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے.........تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی

کے غصے بھرے تحکم کو مان کر.........کھڑکی سے جھانک کر مسکراتے چہرے.........کی تلاش سے آنکھیں چرالیتی ہو تم کیوں 35 برس کی عمر کی ہو کر.........خود کو سنوارنا بند کر دیتی ہو.........کہ تمہیں اپنے شوہر کے زہر میں بجھے

فقروں سے طلاق کی بو آتی ہے.........................

معروف شاعرہ ادا جعفری کے یہاں بھی خواتین کے تشخص، انا اور اعتراف ذات کا مسئلہ بار بار آتا ہے۔ اُن کی نظم ''ساز سخن بہانہ ہے'' میں اُن کے احساسات ملاحظہ کیجیے:

کہ لڑکھڑا کے رہ گیا میرا ہر ایک سوال بھی.........مرا ہر ایک خیال بھی.........میں بے قرار و خستہ تن بس اک شرارِ عشق میرا پیرہن.........میرا نصیب، ایک حرفِ آرزو.........وہ ایک حرفِ آرزو

تمام عمر 100 طرح لکھوں..... میرا وجود اک نگاہِ بے سکوں.........نگاہ، جس کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں پڑی ہوئی!''

یہ نظم بھی اسی سمت میں کافی آگے تک جاتی ہے۔

رسول جہاں بیگم مخفی بدایونی بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی شاعرہ ہیں۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں عورت کی اہمیت اور خصوصیات پر زور دیا ہے۔ انتخاب، شاعرات کو دیکھ کر، اور 'عورت' اُن کی اہم نظمیں ہیں۔ نظم 'عورت' کے چند ابتدائی اشعار دیکھیے جس میں اُنہوں نے عورت کی تعریف کچھ اِس طرح کی ہے کہ یہ ایک طرف عورت کی تعریف محسوس ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ ایک طنزیہ نظم معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں کو ہمارے معاشرے میں محض قدرت کا حسین و رنگین شاہکار ہی سمجھا جاتا ہے۔ انسان اور ذی روح نہیں کہ جس کے سینے میں بھی دل ہے اور جسے اپنے بارے میں سوچنے سمجھنے کا حق ہے۔ اشعار دیکھئے:

کیا ہے عورت، صانع قدرت کا رنگیں شاہکار.........نشہ مے کی لطافت، حسنِ فطرت کی بہار غنچہ و گل کا تبسم، موجِ دریا کا خرام.........خود فراموشی کی دعوت، خود فریبی کا پیام کیا ہے عورت ایک رنگیں اور دلکش خواب ہے.........یا نزاکت کے چمن کا اک گل شاداب ہے

ساجدہ زیدی وسیع المطالعہ اور وسیع النظر شاعرہ ہیں۔ اُن کے یہاں قومی اور عالمی مسائل کے حوالے سے نظموں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ اُنہوں نے انسانی رشتوں پر بھی لکھا، اخلاقی زوال پر بھی لکھا، فسادات اور دیگر سماجی مسائل کو بھی موضوع بنایا اور خواتین کے وجود کے تعلق سے بھی اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ وہ اپنی شاعری کا سبب اِن الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

''شاعری کیے بنا میرے لیے زندہ رہنا بہت مشکل ہوتا ہے اور زندگی کا جواز ڈھونڈنا اور بھی مشکل ۔ اب دیکھیے نا اِس دُنیا میں کتنی بے انصافیاں' بدعنوانیاں اور ظلم واستحصال ہے۔ ظلم و جبر کے کتنے بہانے ہیں۔ کتنا جھوٹ ہے۔ کتنا دُکھ ہے؟ کتنا اندھیرا ہے؟ ایسی دنیا میں کسی منصب' کسی عظیم سچائی کی تلاش' کسی عبادت کے بغیر کوئی کیسے جیے؟ میری شاعری' میرے اسی روحانی کرب کا اظہار ہے۔'' (آزادی کے بعد اُردو شاعری میں تانیثی حسیت۔ ص 137)

خواتین کی صورتحال پر اُن کی معروف نظم ''کلیاں' نیلا آسمان' زنجیریں'' ہے جو اُن کے مجموعے پردہ ہے ساز کا' میں شامل ہے۔ یہ نظم اِس طرح شروع ہوتی ہے:

''مرے احساس کی وادی میں کلیاں مسکراتی ہیں..... مگر میں چن نہیں سکتی............
میں لمحوں میں سفر کرتی ہوں............ تابندہ اُفق کے اُس کنارے تک............
جہاں آکاش دھرتی کے لبوں کو چومتا ہے...... سانس لیتا ہے......
مرے ہاتھوں کی ریکھاؤں میں............ جانے کیسی زنجیریں پڑی ہیں............
روزِ اول سے............ میں یہ زنجیر آہن توڑ کر روزِ ابد تک جا نہیں سکتی...... میں کلیاں چُن نہیں سکتی''

نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے' مرکزی کردار میں خود اعتمادی آتی جاتی ہے اور یہاں تک کہ وہ بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے۔ زمانے کی زنجیر سے آزاد ہو کر' مہتاب کی ہم رقص ہو جاتی ہے:

''مجھے جب جب بھی نیلا آسماں حسرت سے تکتا ہے............
میں اپنی آتش دل سے جلا دیتی ہوں............ اس زنجیر کی کڑیاں............
ستاروں تک پہنچتی ہوں............ مدارِ نور میں مہتاب کی ہم رقص ہوتی ہوں۔''

اِس آخری مصرعے کو آرزو اور تمنا سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ جہاں عورت پہنچنا چاہتی ہے' وہ دراصل یہی مقام ہے۔ لیکن اِسے آزادی' ترقی اور معاشرتی تبدیلی کا اشارہ یہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ عورتیں پہلے بے بسی کا شکار تھیں۔ اُن کے لیے مواقع نہیں تھے۔ وہ محض حسرتوں میں زیست کرتی تھی مگر اب اگر وہ چاہے' اور ہمت کرے' تو اُسے مہتاب کی ہم رقص ہونے کے مواقع بھی دستیاب ہیں۔!!!

خواتین کے مسائل اور صورتحال پر فہمیدہ ریاض کی وہ لڑکی' کب تک' لوری بدن دریدہ شفیق فاطمہ شعری کی قید میں رقص' رشتہ کائی بن گیا ہے' چارج شیٹ 1990' سانپ کینچلی شبنم رفیعہ عابدی کی اگلی رُت آنے تک' نئی گھٹائیں اُتر آئی ہیں۔۔۔۔ وغیرہ نظمیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کی شاعرات کے کلام خواتین پر تشدد اور استحصال کے موضوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ البتہ وہ اِس کا اظہار بہت وضاحت اور تفصیل سے نہیں کرتیں۔ شاعری میں'

ISSN No. : 2395-2016

شعری نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ اِن موضوعات کا واضح اظہار غالباً ممکن بھی نہیں۔ لہٰذا اِن شاعرات نے عورت کے مرتبے اور مقام کی بات ہے۔ اُن کے عزت نفس کی بات کی ہے۔ اُن کو سماج میں مساوی اور مناسب مقام دلانے کی بات کی ہے۔ اور اِس حوالے سے صرف مایوس کن نہیں بلکہ اُمید افزا باتیں بھی ہیں۔ صرف مصائب کا بیان نہیں بلکہ عورتوں کو آگے بڑھنے اور ہمت و جرات اور دانشمندی سے کام لیتے ہوئے اپنا مقام بنانے کی دعوت بھی ہے۔

☆☆☆

آفتاب احمد آفاقی

سکندر احمد کی افسانوی تنقید

نام: آفتاب احمد۔ قلمی نام: آفتاب احمد آفاقی، تاریخ پیدائش: 10 جنوری 1965، تعلیم: ایم اے، پی ایچ ڈی، وابستگی: شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس، تصانیف: حالی کی مولاد شریف تعارف وتحشیہ، کلاسکی نثر کے اسالیب، معنی شناس، محمد علی جوہر شخص اور شاعر، مضامین چکبست، شکست کی آواز نئے اطراف کی طرف، اردو ہندی محاورے، قاضی عبدالودود منوگراف، انعامات واعزازات: یوپی، دہلی اور بہار کی اردو اکادمی کے انعامات برائے کتب۔ نگار بنارس، رابطہ: 9450527733

اس نکتے پر جملہ ناقدین متفق ہیں کہ اردو تنقید کے ابتدائی نقوش، تذکروں کی رہین منت ہیں، یہ تذکرے اصلاً شاعر کی مختصر سوانح اور ان کے کلام پر مبنی ہیں۔ ہر چند کہ یہ جدید تنقید یا تحقیق کے اصولوں پر کھرے نہیں اترتے تاہم ان کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ قدما کے نزدیک تنقید کا تصور بہت حد تک شاعری کے معیار ومنہاج اور تعین قدر سے عبارت ہے، یہ ان معنوں میں ایک فطری امر ہے کہ اردو کا ابتدائی ادب بنیادی طور پر شعری ادب ہیں ہے، اردو ہی کیوں دوسری زبانوں کے ادب میں بھی شاعری کو تفوق اور برتری حاصل رہی ہے۔ اردو تنقید کے بانی مولانا حالی نے بھی اپنی شاعری کے لئے ہی مقدمہ لکھا لیکن ان کو یہ احساس ضرور تھا کہ شعر وادب کی تخلیق کے مواد کی فراہمی کا اصل منبع ومحور حیاتِ انسانی ہی ہے۔ چنانچہ ادب کو زندگی کا نہ صرف ترجمان قرار دیا بلکہ اس کے افادی پہلو پر بطورِ خاص توجہ دی۔ موجودہ دور میں حالی کے تنقیدی تصور کے ضمن میں بعض اختلافات کا پایا جانا کوئی عیب نہیں تاہم یہ اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ حالی بنیادی طور پر مشرقی تصورِ نقد کے موئید اور ہمنوا ہونے کے باوجود اس روایت کی توسیع کے خواہاں تھے۔ اپنی حدود میں ملٹن اور ورڈس ورتھ جیسے ادیبوں کا حوالہ دینے کے پسِ پردہ جو مقصد کارفرما تھا وہ ادب میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہی تھا۔

اردو کی یہ خوش بختی رہی کہ محمد حسین آزاد، حالی، امداد امام اثر، اور شبلی جیسے بنیاد گذار ناقدین اسے میسر آئے

ISSN No. : 2395-2016

جن کے ذہنی وفکری برگ و بار مشرقی ادبی ماحول میں پروان چڑھے لیکن مغربی شعروادب کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ان اکابرین پر موجودہ دور میں نوآبادیاتی طرزِ فکر کے اثرات کی نشاندہی بھلے ہی کی جا رہی ہو لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اپنے علمی حدود میں ان بزرگوں نے تنقید کی جو بنیاد رکھی وہ بے حد مضبوط اور پائے دار تھی۔بعد کو اردو تنقید نے مختلف تحریکات ونظریات کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ اپنے دائرہ کار میں بھی اضافے کئے۔اس ضمن میں مغربی افکار وخیالات کے پروردہ ان ادیبوں اور نقادوں کی خدمات کا اعتراف بھی ضروری ہے جنھوں نے اردو تنقید کے معیار و وقار کو نہ صرف بلند کیا بلکہ اس زبان میں فکر ودانش کی ایک نئی طرح ڈالی۔تخلیقی سطح پر بعض نثری اصناف کے تجربے انہی قلم کاروں کے فیضان کا ثمرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ترقی پسندوں نے اصنافِ شعری کے پہلو بہ پہلو نثری فن پاروں کے تعین قدر سے بھی دلچسپی لی،ان ادیبوں کے یہاں فکشن کی تخلیق کے علاوہ تنقید کی ایک صحت مند روایت بھی ملتی ہے جس کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔تاہم فکشن تنقید کی کوئی واضح شعریات مرتب نہ ہوسکی۔اس ضمن میں ممتاز شیریں اور حسن عسکری کی کاوشیں اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ممتاز شیریں نے اپنے مضمون بہ موسوم 'تکنیک کا تنوع' میں پہلی بار افسانے کے فارم اور تکنیک کے فنی نکات پر نہ صرف توجہ دی بلکہ افسانے کے تشکیلی عناصر اور اجزا کی نشاندہی بھی کی۔شمس الرحمن فاروقی کی تصنیف 'افسانے کی حمایت میں' اور وارث علوی کی کتاب 'جدید افسانہ اور اس کے مسائل' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔بعض دوسرے ناقدین مثلاً گوپی چند نارنگ،قمر رئیس اور وہاب اشرفی نے بھی افسانے کے فن اور روایت پر مضامین اور کتابیں لکھیں ہیں لیکن صداقت یہ ہے کہ ان کاوشوں سے افسانے کی شعریات کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ ہی بیانیہ جیسی اصطلاح کی معتبر تعریف متعین ہوتی ہے۔

اس لئے افسانے کی تنقید کے لحاظ سے سکندر احمد کی حیثیت ان معنوں میں اہم ہو جاتی ہے کہ انھوں نے علمی ومنطقی طرزِ استدلال کے ساتھ مشرقی اور مغربی افسانوی بوطیقا کی روح کثیف کر کے اردو میں پیش کیا۔انھوں نے جہاں افسانے سے متعلق نظری مباحث سے دلچسپی لی ہے وہیں اس تصور کے بنا پر اطلاقی تنقیدی نمونے بھی پیش کئے ہیں۔یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ عام طور پر اردو ناقدین،اپنے تصوراتی وعملی تنقید میں مغربی افکار وخیالات کو حوالے کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔علمی اور ادبی سطح پر یہ کوئی عیب نہیں،تاہم کسی قول،تصور یا نظریے کو بغیر تحقیق کیے قبول کرنا مصنف یا قاری کو علمی دھوکے میں ڈال دینے

ISSN No. : 2395-2016

کے مترادف ہوگا۔ سکندر احمد کے تنقیدی افکار بھی مغربی تصورِ نقد سے پروان چڑھے ہیں لیکن ان کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور تصنیف میں بعض مروجہ مفروضات کو تہس نہس کیا ہے اور مغربی بھرم توڑے بھی ہیں۔ واضح رہے کہ عمومی طور پر ژاک دریدا کو ردِّ تشکیل (Deconstruction) کی تھیوری کا بنیاد گذار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن سکندر احمد نے دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ساری اصولی بحثیں حسن بن صباح کی عربی کتاب 'المتونت' میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ دریدا نے اسی کتاب سے بغیر حوالے کے کسبِ فیض کیا ہے۔

سکندر احمد نے "تکلم، بیانیہ اور افسانویت" نیز "افسانے کے قواعد" جیسے بے حد چونکانے والے مضامین لکھ کر اردو افسانے کے تعینِ قدر کی راہیں نہ صرف ہموار کی بلکہ بعض اعتبار سے فکشن تنقید کی نئی طرح ڈالی۔ یہ تنقید بڑی حد تک مغربی تنقیدی اصولوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھی باوجود اس کے انہوں نے مشرقی شعریات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ افسانے کے تعلق سے بیانیہ کو لازمی جز کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ سکندر احمد نے نہ صرف یہ کہ بیانیہ اور افسانویت کے پیچ وخم کو سلجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ بیانیہ کی بدلتی شکلوں کو بھی نشانِ زد کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ متعدد مغربی علما اور دانشوروں کے خیالات کے حوالے سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس سے افسانویت کی بنیاد اور افہام وتفہیم بہ آسانی ہوجاتی ہے؛

"روزمرہ کی زندگی میں ہمارہ سابقہ ایسے بے شمار تحریری نمونوں سے پڑتا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی واقعہ کی ظہور پزیری سے ہوتا ہے تاریخ، واقعہ نویسی، صحافت واقعات پر مبنی ہیں۔ افسانویت کی اصل بھی واقعات پر ہی ٹکی ہوئی ہے۔ کوئی ایسا پیمانہ، کوئی ایسی کسوٹی قائم کی جاسکتی ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ مخصوص بیانیہ افسانیت سے مملو ہے اور مخصوص بیانیہ افسانویت سے عاری ہے یا پھر افسانویت ایک اضافی تصور ہے یعنی کسی بیانیے میں افسانویت نسبتاً زیادہ ہے اور کسی میں کم ہے"

سکندر احمد نے Barbra herrnstein smith کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک صرف ایک واقعے کی ظہور پذیری ہی افسانویت کو جنم دیتی ہے جبکہ Carroll کم از کم دو واقعات کی ظہور پزیری کو لازمی قرار دیتا ہے۔ سکندر احمد نے ان دونوں خیالات کی روشنی میں متعدد سوالات قائم کیے ہیں مثلاً یہ کہ دو واقعے کے درمیان ترتیب، تنظیم اور ربط کی وہ کون سی صورت ہوگی جس کے نتیجے میں افسانویت قائم ہوسکتی ہے۔ مزید یہ کہ ایک بیانیہ کے عدم موجودگی میں کیا کوئی عبارت افسانے کی حیثیت

ISSN No. : 2395-2016

اختیار کر سکتی ہے۔ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ دو یا دہ سے زیادہ واقعات کے مابین ربط کی وہ کون سی صورت ہو جس سے افسانویت وجود میں آئے یعنی موضوع اور واقعات یا صورتِ حال؟

سکندر احمد کے نزدیک ہر بیانیے کی ابتدا تکلم سے ہوتی ہے۔ تکلم کی حیثیت بنیادی ہے یعنی تکلم کے ذریعہ جہاں بیانیہ آگے وقوع پزیر ہوتی ہے اور اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''کوئی واحد طریقہ کار بیانیے کی اصل تک رسائی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بیانیہ پر گفتگو کے لئے متعدد طریقہ کار ہوسکتے ہیں اور ان طریقہ کار کے باہمی ربط سے ایک سیر حاصل مکالمہ قائم ہوسکتا تاہم کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ افسانویت کے حوالے سے دو اور دو چار نہیں ہوسکتے۔ چار ہونے کی بات تو در کنار، دو اور دو پر بھی سوالیہ نشان لگائے جاسکتے ہیں''

اس ضمن میں انہوں نے رولاں بارتھ کے خیالات کو بھی نقل کیا ہے جس کی رو سے ''بیانیہ ہر عہد، سماج اور ہر جگہ موجود ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر شخص کا حوالہ بیانیا ہی ہے۔ بیانیہ ہے اسی لیے میں ہوں۔ بیانیا کی حیثیت بین الاقوامی، ماورائے ثقافت اور ماورائے تاریخ ہے۔ یہ بس موجود جس طرح زندگی موجود ہے۔'' یہاں سکندر احمد یہ بھی سوال قائم کرتے ہیں کہ جب بیانیہ ہر جا موجود ہے تو پھر اس پر علاحدہ گفتگو کی ضرورت کیوں ہے۔ علاوہ ازیں بیانیے کے معیار، عمیق اور سطحی اور بیانیے کی تفریق کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ عہد میں بیانیا بیانیاتی تصور سے تجاوز کر گیا ہے اور دوسرے تصورات کے حدود میں اس طرح داخل ہو گیا ہے کہ اس کی شکل کسی واقعہ یا مجموعۂ واقعات سے نہیں بلکہ موقف (Stance) سے ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے بیانیا کی عظمت سے نہ صرف واقف کرایا ہے بلکہ تکلم، بیانیہ اور افسانویت کے باہمی تعلقات کی نشاندہی کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کسی بھی افسانے کی کامیابی اور ناکامی کے پسِ پردہ ان تینوں اوصاف کی یکجائی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

انہوں نے بیانیہ کیا نہیں ہے جیسے عنوان بھی قائم کیے ہیں گویا بیانیہ کے پیمانے کا تعین، پرکھ یا پیائش بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر متن یا پیش کش کو بیانیہ کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ سکندر احمد نے مغربی نقادوں کے حوالے سے بیانیہ کے وجود میں دو خصوصیات کو لازمی گردانہ ہے۔ اول واقعات کی ظہور پزیری اور دوم ترسیل کا ذریعہ، بیانیہ اور بیان لازم اور ملزوم ہوتے ہیں لہذا یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ بغیر بیان کے بیانیے پر کوئی مکالمہ یا مباحثہ ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ خیالات لائق توجہ ہیں۔

''بیانیہ دراصل انسانی مسائل اور تجربات کا مظہر ہے ایسے تجربے شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتے

ISSN No. : 2395-2016

بلکہ روزمرہ کے واقعات میں شامل رہتے ہیں جن سے انسان دوچار ہوتا رہتا ہے۔ جب متعلقہ تجربات کی ہیت، ماہیت اور معنویت میں دوچند زمانیت اور ترسیل کے ذریعہ ایک بڑے طبقے کو شریک کرنے کی سعی کی جائے تو بیانیہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ مسائل و تجربات سے نبرد آزمائی تو غیر شعوری ہوتی ہے تاہم جب انہیں ان کے تناظر کے ساتھ شیر کرنے کی کوشش کی جائے، تو بیانیہ ہی واحد ذریعہ ہے۔۔۔۔ بیانیہ کا مخاطب تمام دنیا ہے۔۔۔ خود کلامی بھی بیانیا کی شکل تبھی اختیار کرتی ہے جب اس میں دوسروں کو شریک کیا جائے۔ گفتگو اور خود کلامی تکلمِ محض ہیں بیانیہ نہیں۔ اپنے آپ اس میں زمانیت تو ہوسکتی ہے، ہوسکتا ہے دوچند زمانیت بھی ہو تاہم ان کی ترسیل نہیں ہوتی۔ بیانیہ کے ذریعہ انسانی تجربات و حوادث وقت کے تسلسل کے ساتھ وا ہوتے ہیں۔"

اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تکلم بیانیے کی ابتدائی شکل ہے اور انتہائی شکل افسانہ ہے۔ سکندر احمد نے بیانیے میں افسانویت کے معیار کے پہلو بہ پہلو اسکی پیمائش کے امکانات پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انکے نزدیک متعدد طریقے ہوسکتے ہیں۔ اس کا رشتہ سماجی علوم سے بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکے حدود میں جملہ انسانی حرکات و سکنات، تصور و خیالات در آسکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی باک نہی کہ بیانیہ کے تعلق سے جب بھی کوئی مکالمہ یا گفتگو کی جائے گی تو قاری خود ان سے نتائج اخذ کرنے کے اہل ہونگے۔ ہر چند کہ موجودہ دور میں افسانہ کے حوالے سے بیانیہ عصری ڈسکورس کا حصہ بن کر ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ بین العلومی تناظر میں اس پر ادبی گفتگو کی جارہی ہے۔ اور ردو قبول کے عمل سے گزرتے ہوئے مکالمے بیانیہ کے وجود اور معیار متعین کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جارہی ہے۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سکندر احمد نے اردو افسانے کی شعریات کے تعین قدر میں بڑی حد تک حصہ لیا ہے۔ اور بیانیہ کے تعلق سے بہت سے شکوک بھی رفع کیے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ان سے قبل افسانے کے فن اور مبادیات سے دلچسپی نہیں لی گئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فکشن کے تعلق سے بالعموم اور افسانے سے بالخصوص جن ناقدین نے دلچسپی لی ہے انہوں نے بڑی حد تک فکری پہلو پر توجہ دی ہے۔ اور اس لحاظ سے انکی تنقدیں ذاتی پسند و ناپسند کے باعث تاثراتی تنقید کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے تمام تجزیے، تشریح سے آگے نہیں بڑھتے۔ سکندر احمد اس اعتبار سے بھی ہماری توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ انہوں نے اردو میں نہ صرف

ISSN No. : 2395-2016

فن افسانہ کے معیار پر گفتگو کی ہے بلکہ ان عناصر کی نشاندہی بھی کی ہے جو کسی متن کو افسانے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

سکندر احمد نے اردو میں نقد افسانہ کی زبوں حالی پر روشنی ڈالتے ہوئے اسکی روایت کا بھی جائزہ لیا ہے۔ جس کی رو سے افسانے کی تنقید کے دوران، بیش تر ناقدین سہل پسندی کا شکار ہوئے ہیں۔ نتیجتاً انکے تجزیئے خلاصے کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے۔ البتہ وہ شمیم حنفی کی افسانوی تنقید کو اس لحاظ سے اہمیت دیتے ہیں کہ انہوں نے انتظار حسین کے افسانوں کے مطالعے کے ضمن میں نہایت عرق ریزی اور ایمانداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس باریک نکتے کی بھی گرفت کی ہے جو کسی شعر یا افسانے کے فرق و امتیاز کو متعین کرتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ تنقید فلسفیانہ بصیرت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اور بصیرت عمیق مطالعے، گہرے فکر و شعور اور حیات انسانی کے تلخ و شیریں تجربات کی برکتوں کا ثمرہ ہوتی ہے۔ اگر نقاد کسی عصبیت کی عینک سے فن پارہ کو جانچتا پرکھتا ہے تو ایسی حالت میں وہ تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ تنقید کے لیے جہاں فکر و بصیرت کے ساتھ مختلف علوم و فنون پر دسترس ضروری ہے وہیں اصناف کے عناصر ترکیبی اور اصول سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ بدقسمتی سے اردو کے بیش تر ناقدین افسانے کی تنقید کے ضمن میں فن اور تکنیک کی بجائے معانی و مفاہیم میں الجھ کر ہی رہ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ نگار ناقد کی حیثیت مشتبہ ہو گئی ہے۔ سکندر احمد کا یہ خیال بھی بحث طلب ہے کہ تخلیق کار دوسرے افسانہ نگار کے فن پر اظہار خیال کے دوران فکری و فنی معیار کے ساتھ قطعی انصاف نہیں کر سکتا۔ گویا افسانہ نگار ناقد کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

سکندر احمد نے فن افسانہ نگاری کے اسرار و رموز سے نہ صرف یہ کہ گتھیاں سلجھائی ہیں بلکہ اسکے بنیادی عناصر پلاٹ، تھیم، بیانیہ، واقعہ، کردار، درد نگارش، فضا بندی نیز انسانی زندگی اور معاشرے سے اس کے رشتوں کو بھی اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے افسانے میں راوی کے تفاعل کی اہمیت پر بھی گفتگو کی ہے۔ ہر چند کہ افسانہ اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ان میں بعض ایسی خصوصیت در آتی ہیں جس کی بنا پر افسانہ اپنے عہد کے تناظر میں عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کی یوں تصویر کشی کرتا ہے کہ زمانہ بعید کے واقعات کو خود سے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ افسانوی فن پارہ قاری کے لیے ذہنی و فکری آسودگی کا ذریعہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس سے بصیرت بھی حاصل کرتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے زمانہ کی پہچان اپنے معاشرہ کی شناخت اور انسان کی پرکھ کے لئے وہ اسے

ایک معیار کا درجہ بھی دے دیتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مختلف ادبی نظریات سے تعلق رکھنے والے ناقدین خواہ ان کا تعلق علامت نگاری اور تجرید پسندی سے ہو یا قدامت پسندی سے اس نکتے پر بہت حد تک متفق ہیں کہ افسانوں کے مطالعے کے دوران قاری اپنے عصر سے بلند ہو کر دوسرے عصر میں جس وسیلے سے پہنچتا ہے وہ 'کہانی' ہے۔ اگر کہانی واقعات اور کرداروں کی توانائی سے بھرپور ہو تو زندہ رہنے کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔

افسانے کے تعلق سے ایک سوال یہ بھی قائم کیا جاتا رہا ہے کہ اردو افسانے قارئین کے ذہن وفکر کی تشنگی کو کس حد تک سیراب کر رہے ہیں۔ اس نوع کے سوالات تخلیقی کے ساتھ ساتھ سماجی اہمیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے مخصوص سماجی، اور مذہبی رویوں کی مسلط کردہ پابندیوں، سیاسی شعبدہ بازیوں اور غیر منصفانہ تقسیمِ دولت کے نتیجے میں جنم لینے والی بے چینیوں سے متاثر ہونے والی زندگی کی عکاسی کا معیار ہمارے افسانوں میں کیا گیا ہے؟

اس نوع کے متعدد سوالات سکندر احمد نے قائم کیے ہیں۔ اور دلائل کے ساتھ اسکے جواب بھی دیے ہیں۔ سکندر احمد پر کئی ناقدین نے الجھے خیالات اور مغربی تنقیدی تصور کے اثرات کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کلیم الدین احمد کے تعلق سے ایسے الزامات کی کمی نہیں۔ لیکن تمام تر اختلافات کے باوجود انکی تنقیدی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اس طرح سکندر احمد کی تنقیدی نگارشات سے اختلاف کے امکانات کے باوجود یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ انہوں نے افسانے کے فن اور اصول پر جو کچھ لکھا ہے وہ اردو میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔

ISSN No. : 2395-2016

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

بیگ احساس کے افسانے۔انفرادواختصاص

جدید اردو تنقید و تحقیق کی دنیا میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔آپ یکم اپریل 1972ء کو پیدا ہوئے۔1990ء میں مگدھ یونیورسٹی سے بی اے اردو آنرس کیا۔1993ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔1996ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد واپس بہار آکر ہائی اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔ 2003ء سے شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔2006ء میں مگدھ یونیورسٹی سے آپ نے اپنی پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔
ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی اب تک سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں اردو کے نثری اسالیب (1999)، اردو ناول کے اسالیب (2006)، جہانِ فکشن (2008)، متن اور معنیٰ (2014) اور صالحہ عابد حسین (2016) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔آپ کی ادارت میں شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے 'اردو ریسرچ جرنل' کے نام سے ایک معیاری رسالہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔
رابطہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی:8863968168

جن کہانیوں میں دلچسپی، تاثر اور بصیرت ہو وہ مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ بیگ احساس کے افسانے جب نظر سے گزرے تو سنگِ گراں، کھائی، درد کے خیمے، دخمہ، سانسوں کے درمیاں اور دھار جیسی کہانیوں نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ان کہانیوں میں قاری کو مسحور کرنے، متاثر کرنے اور اسے دورُخی قدروں، خود سر حقیقتوں اور بدلتی فکروں سے آگاہ کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔یہ خوبیاں بہت آسانی سے کسی کہانی میں پیدا نہیں ہو جاتیں۔اس کے لئے شرط ہے کہ افسانہ نگار کا اسلوب دلچسپ ہو، اس کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ قاری کو نئے حقائق سے آگاہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔اور بلاشبہ بیگ احساس کے پاس یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔

بیگ احساس کی کہانیاں سماجی شعور کی عکاسی کرتی ہیں اور انسانی نفسیات کی نباضی بھی۔قدروں کی پامالی کا آئینہ دکھاتی ہیں اور تہذیبی و معاشی طور پر زوال پذیر اقلیتی طبقے کے درد و داغ

ISSN No. : 2395-2016

بھی۔ تازہ افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' کے گیارہ افسانوں کو ہی نگاہ میں رکھیئے تو محسوس ہوگا کہ ہر افسانہ اپنی ایک الگ کائنات رکھتا ہے۔ بیگ احساس کے مطالعے کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت، تجربوں کی ہم آہنگی، اسلوب کا انفراد اور کہانیوں کا تنوع دیکھنا ہو تو ان افسانوں سے ایک بار ضرور گزریے۔ 'سنگ گراں'، معاشی قدروں پر ٹکی زندگی، رشتوں کی تلخی اور آرزؤں کے قتل کا منظر نامہ پیش کرتا ہے تو 'کھائی' رشتوں کی بے وقعتی، دفن ہوتی ہوئی انسانی قدروں اور دولت وعیاشی کے برعکس کردار کی سالمیت کی عکاسی کرتا ہے۔ 'سانسوں کے درمیاں' میں محبت و انسانیت کی موت، جذبات کے قتل اور موڈرن زندگی کی ہوسنا کیوں کا تلخ تجربہ نظر آتا ہے تو 'دھار' میں دور جدید کے اُن مسائل کا عکس دکھائی دیتا ہے جن سے آج مسلمان نبرد آزما ہے۔ گویا بیگ احساس کے افسانوں میں موضوعات کی حیرت انگیز رنگارنگی ملتی ہے۔ جدید امریکی انگریز نقاد ایڈگر ایلن پو نے ایک بڑے فنکار کی جو شرطیں وضع کی ہیں ان میں ایک شرط Subjective Diversity یعنی موضوعاتی تنوع ہے۔ پو سے بہت پہلے یہی بات ابن خلدون، قدامہ بن جعفر نے بھی 'کثرت معنی' کی اصطلاح کے حوالے سے کہی تھی۔ بیگ احساس کے افسانوں کا موضوعاتی تنوع ان کے رنگارنگ اسلوب واظہار سے ہم آہنگ ہو کر نہ صرف ایک خاص کیف پیدا کرتا ہے بلکہ افسانہ نگار کے تخلیقی عمل اور اس کی فنکاری سے بھی مرعوب کرتا ہے۔ انہوں نے 'دخمہ' کی گیارہ کہانیوں میں زندگی کے متنوع پہلوؤں کو پیش کر کے کینوس کی وسعت کا بے پناہ خوبصورت مظاہرہ کیا ہے۔ وہ زندگی اور معاشرے کے ہر مسئلے کی تصویر کشی میں مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ کس موضوع کو کس اسلوب یا تکنیک میں بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ کہیں علامتی، کہیں استعاراتی اور کہیں واضح بیانیہ سے کام لے کر اپنی کہانیوں کو غیر معمولی تاثر عطا کرتے ہیں۔

موضوع کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ ''دخمہ'' نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ محفلوں میں گفتگو کا مرکز بھی زیادہ تر کہانی ''دخمہ'' ہی رہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'دخمہ' موضوعی اور تکنیکی طور پر خوبصورت افسانہ ہے اور ہمیں نئے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ مگر فنی طور پر مجھے 'کھائی' زیادہ پسند ہے۔ 'کھائی' صرف کفایت علی کا المیہ نہیں ہے، یہ تین جنریشن اور ایک پورے عہد کا المیہ ہے، جس میں دولت اور شرافت کے مقابلے میں فتح دولت کو حاصل ہوئی ہے۔ شرافت، انسانیت اور کفایت جیسی قدریں مردہ سماج کی نعش پر رکھی برف کی سلیں ہیں جو بڑی تیزی سے پگھل رہی ہیں۔ شوکت علی جاگیردارانہ نظام کے زوال کے بعد بھی اپنی جاگیردارانہ ذہنیت نہیں تیاگ سکے۔ ان کی جھوٹی شان وشوکت زندہ رکھنے کے لئے پورا خاندان استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کفایت علی نے بچپن سے گھر کی

ISSN No. : 2395-2016

یہ حالت دیکھی ہے۔ وہ اپنے نام کے مطابق نہ صرف کفایت شعار ہے بلکہ سوجھ بوجھ، محنت اور خانگی ذمے داریوں کے ساتھ جینے والا ایک سچا اور سیدھا انسان بھی ہے۔ اس کی معمولی سوچ، سیدھی سادی زندگی اور معمولی طرز رہائش باپ کو اہلکارانہ نظر آتی ہے۔ شہزادہ کفایت علی کا بیٹا ہے مگر فکری طور پر وہ شوکت علی کا عکس ہے۔ جاگیردار تو نہیں مگر خلیجی ملک جا کر وہ جاگیرداروں سے زیادہ دولت اور شان وشوکت حاصل کر چکا ہے۔ شوکت علی کو اس میں اپنا عکس دکھائی دیتا ہے اور شہزادہ کو دادا کی جاگیردارانہ ذہنیت میں اپنی پرعیش زندگی کا جواز۔ گویا شہزادہ دور جدید کا جاگیردار ہے۔ دادا اور پوتے کے درمیان کفایت علی عصر حاضر کا ایک عام انسان ہے جو اپنے طرز زندگی سے اس عہد پر آشوب میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کلائمکس اور کہانی کا اصل منطقہ اُس وقت وجود میں آتا ہے جب شوکت علی کی تدفین کے لئے کفایت علی عام قبرستان میں جگہ تیار کروا رکھتا ہے مگر پوتا شہزادہ آکر اپنے پیسے اور رسوخ سے امراء اور خواص کے قبرستان میں قبر حاصل کر لیتا ہے۔ کفایت علی دیکھتا رہ جاتا ہے اور شہزادہ لمبی کار میں سوار ہو کر خطہ صالحین میں دادا کو سپرد خاک کرنے چلا گیا۔ قبرستان میں ہر طرف شہزادہ ہی شہزادہ تھا جس نے شاندار طریقے سے دادا کے آخری رسوم انجام دلوائے۔ کفایت علی دور کھڑا سوچ رہا تھا کہ اُس قبر کا کیا ہوگا جس میں چار پانچ ہزار روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ گھر پہنچ کر محلے کے قبرستان کا آدمی آتا ہے اور پیسے مانگتا ہے۔ کفایت علی اُسے صرف مزدوری کے پیسے دینا چاہتا ہے۔ دونوں میں تو تو میں میں ہوتی ہے۔ آواز سن کر گفتگو میں مصروف شہزادہ باہر آتا ہے اور جھلا کر کہتا ہے کہ بابا گھر رشتہ داروں سے بھرا ہوا ہے اور آپ ایک معمولی سی بات پر الجھے ہوئے ہیں؟ یہ کہ کر وہ پیسے نکال کر دے دیتا ہے۔ کفایت علی روکتا ہے ''تم اسے پیسے کیوں دے رہے ہو؟ وہ قبر ہمارے کس کام آئے گی؟''

شہزادی جھلا کر کہتا ہے ''آپ کے کام آئے گی''۔ یہ جملہ صرف ایک جملہ نہیں ہے، ہماری اُن تمام اخلاقی قدروں اور انسانی جذبوں پر کاری ضرب ہے جو نو دولتیوں کی عیاشیوں اور ظاہر داروں کی فضول خرچیوں کی وجہ سے سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں۔ صارفیت نے گلوبلائزیشن کے نام پر جو کلچر ہمارے سپرد کیا ہے اُس نے عیش وعشرت کے سامان تو فراہم کر دیے ہیں مگر ہم سے ہماری آدمیت، انسانیت اور کردار کی سالمیت چھین لی ہے۔

''سانسوں کے درمیاں'' بھی اسی صارفی سماج کا آئینہ ہے، جہاں رشتوں کی عظمت سکّوں اور نوٹوں تلے روندی جا رہی ہے۔ گلوبلائزیشن کے نام پر ہمیں ایسی آسائشوں اور عیاشیوں کا عادی بنا دیا گیا ہے کہ ہم چادر پھیلاتے ہوئے پاؤں دیکھنے کے قائل نہیں رہے۔ مغربی تہذیب، سوپر مارکیٹ، مال اور وال مارٹ جیسی رنگین دنیاؤں نے ہسپتال، اسکول، کالج اور روزمرہ زندگی کو بھی رنگین عینک سے دیکھنے پر

ISSN No. : 2395-2016

مجبور کر دیا ہے۔اب سادگی، کفایت شعاری اور اخلاص جیسی صفات عنقا ہو گئی ہیں۔ یہ رنگینیاں اور فلموں کے عریاں مناظر ہماری دبی خواہشات کو ابھار کر اُس کی تکمیل کے راستے ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہیں۔اور ہم ساری اخلاقیات کو پرے رکھ کر وہ راستے اپناتے ہیں جو ہماری ہوسنا کیوں اور خواہشوں کو اُڑان بخشیں۔افسانہ کے مرکزی کردار کے والد جب کوما میں چلے جاتے ہیں تو خلیج میں کمانے والے بیٹے کی وجہ سے انہیں ایک ملٹی اپیشلٹی اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ہندستان میں اُن کے ساتھ رہنے والا غریب بیٹا اُس اسپتال اور اس کی آسائشوں کو دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔اُس کی نگاہ میں وہ اسپتال نہیں، فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔چنانچہ پُر آسائش زندگی کے تمام خواب اور دبی خواہشات اچانک جاگ اُٹھتی ہیں اور اُس کی توجہ کا مرکز باپ کم اور اپنی شخصیت زیادہ ہو جاتی ہے۔اس کی جیب خلیج سے بھیجے ہوئے پیسوں سے گرم ہے اس لئے وہ بچوں، بیوی اور اپنے لئے قیمتی کپڑے خریدتا ہے اور دل کو سمجھاتا ہے کہ آخر اسپتال کے ماحول میں ایڈجسٹ بھی تو ہونا ہے۔اُس کے ساتھ بچے اور بیوی بھی لالچ اور ترغیبات کے شکار ہیں اور پرآسائش زندگی دکھا کر رشتہ داروں، دوستوں، سہیلیوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔یہاں تک کہ ایک دن پینگ روم سے ملحقہ واش روم میں نہاتے ہوئے وہ تصور کی ایک الگ دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور بیوی کو بُلا کر اُس دنیا کا لطف حاصل کرتا ہے

"باتھ روم دیکھ کر اُسے گدگدی ہونے لگی۔اس نے گیزر آن کیا۔پہلی بار اُس نے خود کو آئینے میں بے لباس دیکھا تھا۔زمین پر بیچا ہوا آدم۔شاور کھولا۔نیم گرم پانی کی بوندیں ایک بے آواز آہنگ پیدا کر رہی تھیں۔اوپر تک یہ آہنگ پہنچا۔ایک تصویر بنی۔پتہ نہیں کب سے لاشعور میں آکر چھپ گئی تھی۔کوئی میگزین، کوئی فلم کا منظر۔۔۔ایک مرد اور ایک عورت شاور کے نیچے بے لباس نہا رہے تھے۔اسی دھندلی سی کیفیت میں اُس نے کمرے میں موجود عورت کو آواز دی۔بڑے پس وپیش کے بعد وہ تصویر بن پائی۔شاور کی پھوار کے نیچے دو بے لباس بدن۔۔۔۔اس عورت میں کتنا کساؤ ہے۔۔۔۔وہ کسی کی موجودگی کا خوف بھی دلا رہی ہے۔۔۔۔'اگر ابا کی آنکھ کھل جاتی تو؟"

دبی ہوئی جنسی خواہشات کی تکمیل ہو یا اچھے کپڑے، اچھے کھانے کی ترغیبات، بوڑھے باپ کی موت کے راستے پر چلنے والی زندگی کے سائے میں اپنا رنگ بکھیرتی ہیں۔موت کے سائے میں ہوسنا کی، پزّا، برگر اور اسپنج کے گدوں کی خریداری، بیوی کے بال، آئی بروزر، مینی کیور، پیڈی کیور پر توجہ، دراصل انسان، آدمیت اور اخلاقیات کی موت کی علامتیں ہیں۔یہاں بوڑھے باپ کی محبت، رشتے کا تقدس اور احترام بالکل نہیں ہے۔اگر کچھ ہے تو صرف خواہشات کی تکمیل، جنسی جذبوں کی تعبیر اور انسانیت کی موت۔ایسے میں زندگی کی شکست ہوتی ہے اور موت کی فتح، تو تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ افسانہ پڑھنے والوں کو اپنے موجودہ

ISSN No. : 2395-2016

معاشرے، بدلتی ذہنیت اور تغیر پذیر زوال آمادہ سماج کا سچا ادراک کرواتا ہے۔ طنزیہ مکالمے، مناظر کی جزئیات اور پلاٹ کا کساؤ افسانے کو فنی طور پر بھی ایک شاہکار کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

تہذیبی زوال اور سماجی و انسانی نفسیات کی بوقلمونی پر اور بھی کئی افسانے متوجہ کرتے ہیں جیسے شکستہ پر، نمی دانم کہ، رنگِ سایہ اور نجات وغیرہ۔ مگر بیگ احساس کے ویسے افسانے جو سیاست، تشدد اور مذہبی منافرت کا پس منظر لیے ہوئے ہیں، ایک اور ہی جہانِ معنی کی سیر کرواتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف دو کہانیاں ''چکرویوہ'' اور ''دھار'' کو نگاہ میں رکھیے تو آپ افسانہ نگار کی فکری بالیدگی، مشاہدے کے عمق اور ملکی و غیر ملکی مسائل پر نظر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے۔ 'چکرویوہ' میں گجرات فساد، احسان جعفری کی شہادت اور فساد کا شکار ہونے والے افراد کی دہشت، خوف، المیے اور سراسیمہ کیفیات کی عکاسی استعارے اور تمثیل کے سہارے اس خوبی سے کی گئی ہے کہ کہانی معنویت کے ساتھ ہی اپنی تہ داری سے بھی متاثر کرتی ہے۔ دھرت راشٹر اور سنجے کے مکالموں سے یہ تو پتہ چلتا ہی ہے کہ ظلم اور جارحیت کے نمونے اتہاس کے کئی یگوں میں دیکھنے کو ملے ہیں مگر جیسی بے حیائی، بے ضمیری اور جبر موجودہ عہد میں وہ دیکھ رہے ہیں اس کے بارے میں تو انہوں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ افسانہ بظاہر گجرات فساد کا احاطہ کرتا ہے مگر اپنے تمثیلی اور استعاراتی بیانیہ کا سہارا لے کر وہ ممبئی، میرٹھ، مظفر نگر، بھاگلپور اور ہر اُس جگہ کی کہانی بن جاتا ہے، جہاں مذہب اور فرقے کا سہارا لے کر انسانیت اور آدمیت پر حملے کئے گئے ہیں۔ یہاں سفاکی اور شیطانیت کے ایسے مناظر پیدا ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر دھرت راشٹر کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ہیں اور وہ سنجے سے بول اُٹھتے ہیں ''ایسا پہلی بار دیکھا ہے''۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ انہیں معلوم ہے اِس یگ میں کوئی کرشن پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ جسے انہوں نے حکومت کرنے کے لئے بھیجا تھا وہ راجا، راکشش کا روپ دھارن کر چکا ہے اور تاریخ یہ لکھنے کے لئے تیار ہے کہ ''اِس یگ کی شناخت ہٹ دھرمی، بے حیائی اور بے ضمیری ہے''۔ مگر بیگ احساس اِس یگ کو آخری یگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ مستقبل ایسے راجاؤں کا فیصلہ کردے گا، آزادی کا سورج پھر طلوع ہوگا اور بچوں کے معصوم مسکان سے یہ جنت نشاں باغ پھر کِھل اُٹھے گا۔

''دھار'' میں مسلمانوں کے قومی اور بین الاقوامی مسائل کو جس نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے وہ بھی نفرت، تعصب اور ہٹ دھرمی کا ہی زائیدہ ہے۔ داڑھی، ٹوپی اور لباس کو ایک خاص رنگ دے کر دہشت اور خوف سے منسوب کردیا گیا ہے اور شخصیت گھر سے باہر تک ہر جگہ مشکوک بنا دی گئی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک ریٹائرڈ مسلم ہے۔ روشن خیال اور سیکولر۔ ظاہراً بھی نہ داڑھی رکھتا ہے، نہ تسبیح کے دانے گنتا ہے اور نہ ہی پینے پلانے سے گریز کرتا ہے۔ مگر بابری مسجد اور Twin Tower

کے ملبے سے وہ فکر جنم لیتی ہے جو ترقی یافتہ مخلوط آبادی والی پاش کالونی میں بھی زہر گھول دیتی ہے۔'پاکستانی، پاکستانی' بچے ہی نہیں سنتے، وہ ساتھ گھومنے پھرنے والے دوستوں کی خاموش نگاہوں سے خود بھی سنتا ہے تو کالونی چھوڑ کر مسلمانوں کے ایک گھٹیا علاقے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں بیوی برقعہ لگانے لگتی ہے اور بیٹا داڑھی بڑھا کر صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو جاتا ہے۔ مگر اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی کیوں کہ اُس نے تنگ نظری، مذہبی شدت پسندی اور ظاہر داری کو کبھی اپنی شخصیت کا حصہ نہیں بننے دیا تھا۔ یہاں تک تو وہ سب کچھ برداشت کرتا رہا مگر اُسے دھکا اس وقت لگا جب اُس کے صوم وصلوٰۃ کے پابند، گھنی داڑھی رکھنے والے بیٹے کو ایک مغربی ملک کے ایرپورٹ سے ہی صرف اس لئے واپس کر دیا گیا کہ اس حلیے کی وجہ سے وہ کسی دہشت گرد تنظیم کا فرد معلوم ہوتا ہے۔ لڑکا دھیرے دھیرے حلیہ بدلتا ہے اور اس کی داڑھی کم ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں کچھ دنوں کے بعد جب شیونگ کٹ گم ہونے کی وجہ سے اس کی داڑھی کچھ بڑھ چکی تھی وہ شیونگ کٹ تلاش کرتا ہے تو اُس کا بیٹا سامنے آتا ہے۔

''یہ لیجئے آپ کا سیٹ''

'نہیں اسے تم ہی رکھ لو' ۔لڑکے نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اُس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ 'ایسے بھی برا نہیں لگ رہا ہے' ۔اس نے اپنے آپ سے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔''

باپ کو پتہ ہے کہ بیٹا داڑھی کے ساتھ یوروپ میں داخل نہیں ہوا مگر کلین شیو اور جعلی پاسپورٹ سے ضرور داخل ہو جائے گا۔ اور میں جو اپنے محلے اور گھر سے حلیے کی بنا پر بے دخل ہو چکا ہوں، حلیہ بدل کر اِس کا حصہ بن جاؤں گا۔ باپ کی معنی خیز مسکراہٹ ہماری فکر، سیاست اور سماج پر گہرا طنز ہے۔ اس طنز کی دھار قومی اور بین الاقوامی سطح پر پیدا ہونے والی اُس سوچ تک پہنچ رہی ہے جو نفرت، مذہبیت اور فرقہ واریت کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ یہ سوچ وہی ہے جو 'دخمہ' میں میکدہ کو بند کروانے کا سبب بنتی ہے اور 'نجات' میں فرحان کی دیوانگی کا۔ بیگ احساس اس سوچ کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کرتے ہیں اور بڑی فنکاری سے کہانیوں کے بطن سے اُن حقائق سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں جو ملک ہی نہیں پوری دنیا کو تباہی، بربادی اور ہلاکت کی راہ پر لے جا رہے ہیں۔

افسانے اور بھی ہیں جن میں سماج و معاشرے کے ساتھ انسانی نفسیات کی نیرنگیاں دیکھی جا سکتی ہیں مثلاً سنگ گراں، درد کے خیمے، شکستہ پر، اور رنگِ سایہ وغیرہ۔ ان میں ہم محبت، نفرت، انسانیت کے کئی روپ دیکھ سکتے ہیں اور انسانی نفسیات پر مصنف کی گہری نظر کا اعتراف بھی کر سکتے ہیں مگر میں طوالت کے خوف سے انہیں چھوڑتا ہوں۔ آخر میں صرف 'دخمہ' کا ذکر کر کے بات ختم کروں گا جو سب سے مقبول افسانہ ہے اور منفرد بھی۔ اس لئے نہیں کہ یہ مجموعے کا سرنامہ ہے یا اس لئے بھی نہیں کہ اس پر سب

ISSN No. : 2395-2016

سے زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔اس لئے کہ یہ افسانہ اپنے بطن میں تاریخ،تہذیب اور رشتوں کے بہت سارے ڈائمنشن رکھتا ہے اور اپنے گٹھاؤ اور تہہ دار بیانیہ کی وجہ سے ہمیں جہانِ معنی کی سیر کرواتا ہے۔جس مذہبی کٹر پن اور فرقہ واریت کا ذکر اوپر کیا گیا اُسی کا نتیجہ میکدہ کا بند ہونا ہے۔کیونکہ اگر وہ مسجد کے ہمسایہ نہ ہوتا تو شاید نہ بند کیا جاتا۔میکدے کا بند ہونا اور سہراب کا مر جانا ،ہماری تہذیبی قدروں کی موت کی علامت ہے۔جب تک ہم میں رواداری اور صبر و تحمل کا مادہ تھا،سہراب جیسے لوگ زندہ تھے اور میکدوں پر آنچ نہیں آئی تھی۔یہ موضوع نیا نہیں ہے مگر بیگ احساس نے اسے جس پارسی پس منظر اور دخمہ کی تفصیلات کے ساتھ قلمبند کیا ہے وہ اسے انفراد و امتیاز عطا کر دیتا ہے۔دخمہ،چھت کے دائرے،سگ دید،گدھ،پارسی گٹہ،آصف جاہی سلطنت اور شاہی دور کی تفصیلات وغیرہ وہ جزئیات ہیں جن سے اردو قاری کم آگاہ تھا۔بیگ احساس نے اس قسم کے حیران کن حقائق کے ساتھ کہانی کی روح کو مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ ان کے ہی سہارے وہ کہانی خلق کر دی جس کی گرفت میں قاری آخر تک بندھا رہتا ہے۔

بیگ احساس بہت سوچ سوچ کر،ٹھہر ٹھہر کر لکھنے کے عادی ہیں۔وہ جلد بازی کا شکار کبھی نہیں ہوتے۔اس لئے اُن کے افسانوں میں فنی مہارت کا احساس بھرپور ہوتا ہے۔وہ جزئیات کی اہمیت سے واقف ہیں اور غیر ضروری تفصیلات سے گریز کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔اختصار اور ارتکاز جو افسانے کا بنیادی لازمہ ہے،بیگ احساس کے فن میں کچھ زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔وہ کم لفظوں میں بڑی باتیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں،اس لئے اشاروں ،علامتوں اور استعاروں سے معنوی تہہ داری پیدا کر دیتے ہیں۔ناخن کی پالش،بہن کی قبر،مئے کدہ،سگ دید،فرش پر چینی کا گرنا،داڑھی،شیونگ کِٹ،پینگ روم،دھرت راشٹر،بچے،برف کی سِل،قبر اور نعش وغیرہ صرف ظاہری الفاظ نہیں ،ایسے استعارے اور علامات ہیں جن سے معانی اور رموز کے کئی جہان وابستہ ہیں۔ان کے ساتھ تہذیب ،تاریخ،عقائد،نفسیات ،رسومات ،روایات ،سیاست اور انسانی روابط کے بہت سارے متعلقات منسلک ہیں جو ہمیں دور تک اور دیر تک سوچنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔یہ افسانے میں فکری گہرائی پیدا کرتے ہیں اور کفایت لفظی کے ساتھ فنی جامعیت عطا کرتے ہیں۔دراصل بیگ احساس لفظوں کا خلاقانہ استعمال جانتے ہیں۔اس لئے انہوں نے زبان،ہیئت ،بنت اور اسلوب میں کسی قسم کے تکلف ،آورد اور تصنع کو شامل نہیں ہونے دیا۔ہر کہانی اپنے آغاز کا سرا اپنے ساتھ لاتی ہے اور اپنی منطق کی تعمیر خود کرتی جاتی ہے۔افسانہ نگار کا ارادہ ،منشا یا موقف کہانی میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ انہیں الگ کر کے دیکھنے کا جواز ہی نہیں پیدا ہوتا۔افسانے میں موضوع سے زیادہ اہم مسئلہ موضوع کے ساتھ افسانہ نگار کے برتاؤ اور ٹریٹمنٹ کا ہوتا ہے،یعنی کہانی کہنے کے فن کا۔بیگ احساس یقیناً کہانی کہنے کے فن میں ماہر ہیں۔

☆☆☆

غضنفر

گلوں کی خوشبو

غضنفر کا اصل نام غضنفر علی ہے۔ آپ 1953ء میں ضلع گوپال گنج، بہار میں پیدا ہوئے۔ غضنفر علی بحیثیت فکشن نویس اور شاعر ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اکادمی برائے فروغ استعداد اردو اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں وہ بحیثیت ڈائرکٹر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں پانی (ناول)، آسان اردو قواعد (گرامر)، کینچلی (ناول)، کہانی انکل (ناول)، دویہ بانی (ناول)، فسوں (ناول)، مم (ناول)، وش منتھن (ناول)، شوراب (ناول)، مانجھی (ناول) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مختلف اداروں کی جانب سے آپ کو ادبی اور تدریسی خدمات کے لیے اعزازات وانعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

کچھ سالوں قبل دوحہ قطر میں میری بیٹی ڈاکٹر شہناز فرحان کے گھر ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے اور جاتے وقت دو طرح کی خوشبوئیں میرے پاس چھوڑ گئے، ایک برگ گل کی خوشبو تھی جس سے جسم مہکتا ہے اور دوسری گل احساس کی خوشبو تھی جس سے روح معطر ہوتی ہے۔ پہلی خوشبو کارخانہء اجمل انٹرنیشنل میں تیار ہوئی تھی اور دوسری قلب انسان میں کشید کی گئی تھی۔

برگ گل کی خوشبو اپنی بو سونگھا کر بہت جلد غائب ہوگئی مگر گل احساس والی خوشبو نواح جاں میں باقی رہی، یہ دوسری خوشبو غائب کیوں نہیں ہوئی اور یہ آج بھی میرے پاس موجود کیوں ہے اس پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ احساس کے پھولوں سے جو خوشبو تیار ہوتی ہے اسکی مہک کبھی نہیں جاتی وہ مساموں میں مہکتی رہتی ہے اس لئے کہ اس کا عطر زندگی سے کشید کیا جاتا ہے، اس کا ست برگ و بار حیات سے کھینچا جاتا ہے اور زندگی سے کشید کیا گیا ست زندگی کے چلے جانے کے بعد بھی قائم و دائم رہتا ہے برگ و بار حیات کا ست کیسا ہوتا ہے یہ دیکھنے کے لئے آپ کو بھی ان پھولوں کو سونگھنا ہوگا جنھیں میرے نتھنے برسوں سونگھتے رہے ہیں اور جنھیں کئی سال پہلے میرے پاس کوئی چھوڑ گیا تھا، ان پھولوں کو آپ کے سامنے رکھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پھولوں میں دو طرح کے رنگ نمایاں ہیں جو دو طرح کی کیفیات سے

ISSN No. : 2395-2016

دو چار کرتے ہیں، پہلے یہ رنگ دیکھئے۔

وہ جس کے نام کی خوشبو ہے کائنات مری
یہ دیکھنا ہے مری دسترس میں ہے کہ نہیں

☆

نور دیتا ہے دل کی دنیا کو
وہ کوئی آفتاب ہو جیسے

☆

نام تیرا آگیا تھا درمیان گفتگو
میری آنکھوں کے جزیرے میں سمندر آگیا

اس پہلے رنگ کے پھولوں سے ایک ایسا پیکر ابھرتا ہے جس کے نام کی خوشبو سے کسی کی کائنات حیات عبارت ہے، جو کسی کی دنیا کو نور دیتا ہے جیسے وہ اس کے لئے کوئی آفتاب ہو، جو اس کی آنکھوں کے جزیرے میں سمندر کی مانند ہوتا ہے، جس کے خیال کی خوشبو سے بھیگتا ہوا شعر ہر لمحہ نئی حیرتوں میں رہتا ہے، جس کا ذکر ہر گھڑی بے چین کرتا ہے، جس کی یاد ہر لمحہ پریشانی میں رکھتی ہے۔

جس کے نام کی خوشبو سے کسی کی کائنات ہے اس کے ذہن میں یہ سوال کیوں اٹھتا ہے کہ اس کی کائنات اسکی دسترس میں ہے کہ نہیں اور یہ سوال ایک اور سوال کو جنم دیتا ہے کہ دسترس میں کیوں نہیں ہے؟ کیا اس پر کسی کا پہرہ ہے یا اسے خود اس کی کائنات سے دور رکھا گیا ہے، یا درمیان میں کوئی دیوار یا خندق حائل ہے کہ رسائی نہیں ہو سکتی، اس سوال کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مدتوں ریت پر رہا ہے اور ریت والی زمین اس کے گل مراد والی زمین سے کافی دور سرحد پار کسی پردیس میں واقع ہے اور وہاں اسے مسئلہ روزگار لے گیا ہے جو اس کی اپنی زمین کا ایک بڑا مسئلہ ہے ایسا بڑا اور سنگین مسئلہ جو اہل زمین کی قسمت میں بھی بے زمینی لکھ دیتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال سر اٹھاتا ہے کہ کسی کے خیال سے بھیگتا ہوا شعر ہر لمحہ نئی حیرتوں میں کیوں رہتا ہے، شاید اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیرتیں اس وقت سامنے آتی ہیں جب منظر انوکھا ہو جاتا ہے یا موجود منظر سے کچھ ایسے رنگ پھوٹ پڑتے ہیں جن کی توقع نہیں کی جاتی یا جو عقل سے بعید ہوتے ہیں یا جس کا رنگ پل پل بدل جاتا ہو اور یہ بدلا ہوا رنگ آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہو، پتلیوں میں کچھ اور بھر دیتا ہو، نگاہوں کو کہیں اور پہنچا دیتا ہو، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ پیکر کس کا ہو سکتا ہے

جو دسترس میں نہیں ہے تو ظاہر ہے
یہ پیکر اس کا پیکر ہے جو
نظر سے دور وہ سرحد کے پار رہ کر بھی
ہر ایک لمحہ مری چاہتوں میں رہتا ہے

مری چاہتوں میں رہتا ہے یعنی اس شخص کی چاہتوں میں رہتا ہے جو اس سے دور بہت دور چلا گیا ہے، دور کیوں چلا گیا ہے اس سوال کا جواب دوسرے رنگ کے ان پھولوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے

عیش و عشرت کی آرزوؤں میں
مدتوں ریت پر رہا ہوں میں

☆

عذاب ہجر کے لمحات ہم بھلا نہ سکے
دیار غیر میں اک پل سکون پا نہ سکے

☆

کیسی وحشت سما گئی دل میں
اپنے سائے سے ڈر رہا ہوں میں

یہ دونوں رنگ دو کیفیتوں سے دوچار کرتے ہیں، ایک لمس قرب سے اور دوسرا ہجر کے لمس سے۔ایک رنگ یہ احساس دلاتا ہے کہ کوئی کسی کے لئے کس حد تک ناگزیر ہے، کسی کا وجود کسی کے لئے کتنا ضروری ہے، کوئی کسی کے لئے کتنا جاں فزا ہوسکتا ہے، کسی کا خیال کسی کے لئے کتنا روح پرور ہوسکتا ہے؟ اسکی پتلیوں میں کیسا کیسا منظر کیسا کیسا رنگ بھر سکتا ہے؟ کسی کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ کسی کی یاد کسی کو کیا دے سکتی ہے؟

اور دوسرا رنگ ہجر کے کرب میں مبتلا رکھتا ہے وہ یہ دکھاتا ہے کہ جب کوئی اپنی سرحد پار کر کے دیار غیر میں قدم رکھتا ہے تو کن صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اگر وہ دیار کوئی صحرائی علاقہ ہے تو ریت اس کے پیروں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے، لو کے تھپیڑے اس کے جسم اور اس کی آنکھوں پر کس کس طرح وار کرتے ہیں اور ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کو بھی کس حد تک جھلسا دیتے ہیں اسے ایسا لگتا ہے کہ

جب بھی میرے سامنے ہجرت کا منظر آ گیا
یوں ہوا محسوس دل سینے سے باہر آ گیا

اسے ایسا اس لئے بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ جس کو اپنی جان سمجھتا ہے اور جس کے پاس ہمہ وقت ہر لمحہ رہنا چاہتا ہے اس سے جدا ہو کر وہ کوسوں دور نکل آیا ہے وہ بھی ایسی جگہ جہاں

کہیں دیوار کا سایہ نہیں ہے

اس لئے دسترس والا سوال اس کے نزدیک اور اہم اور سنگین بن جاتا ہے کہ وہ جس جگہ پر آ گیا ہے جہاں اس کا سر تو بے سایہ ہے ہی پاؤں بھی گرم ریت پر آ گئے ہیں ایسے میں یہ اندیشہ بڑھ جاتا ہے کہ یہ اوپر نیچے سے دوطرفہ مار کہیں اسے اس قابل ہی نہ رہنے دے کہ وہ اپنی مطلوبہ ذات کو پا سکے وہ ذات جو اس کی کائنات حیات ہے جس سے اس کا وجود قائم ہے، جس سے اس کے ہونے کا جواز ہے، یہ پیکر اس کے

ISSN No. : 2395-2016

محبوب کا بھی ہوسکتا ہے اس مٹی کا بھی جس نے اسے پیدا کیا اور اس کے محبوب کو جنم دیا، یہ کرب کسی ایک کا نہیں بلکہ ہر اس شخص کا ہے جو اپنی زمین سے اکھڑ کر کسی اور زمین پر جا پہنچا ہے، یہ شخص اپنی روداد تو بیان کرتا ہی ہے، اپنے اس بیان میں دوسروں کا ترجمان بھی بن جاتا ہے۔

اس تلاش میں یقیناً آپ کو وہ بھی مل گیا ہوگا جس کے رنگ و بو کی بات ہو رہی ہے یعنی آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ صاحب جو کچھ سال قبل میرے پاس آئے تھے اور اپنی خوشبوئیں چھوڑ گئے تھے، جو زندگی کرنے کی آرزو میں مدتوں ریت پر رہے ہیں، جو عذاب ہجر کے لمحات کبھی بھلا نہ سکے، جو دیار غیر میں اک پل بھی سکون نہ پا سکے، جن کے دل میں ایسی وحشت سما گئی ہے کہ انہیں اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے، جن کا پردیس میں ہر گھڑی ہر لمحہ بیکلی میں گزرتا ہے وہ اشفاق ہیں وہی اشفاق جو اپنے نام سے پہلے احمد لگاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اوروں سے مختلف اور منفرد ہیں، جن کی انفرادیت میں ان کی خوش لباسی، خوش مزاجی، خوش جمالی اور اس صحرائی دیار اور پتھریلی زمین میں ان کی خوش خصالی چار چاند لگاتی ہے اور کسی تابندہ ستارے کی طرح اپنی الگ چمک دمک دکھاتی ہے۔

احمد اشفاق کی یہ خوشبو جو برسوں پہلے مجھے ملی تھی آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کیوں یہ میرے رگ و پے میں آج بھی موجود ہے،

امید ہے کہ اس خوشبو نے آپ کو بھی مہکایا ہوگا اور میری طرح آپ کے اندر بھی یہ تادیر بسی رہے گی کہ یہ خوشبو احساسات کے گلوں سے تیار کی گئی ہے اور جذبات کی بھٹیوں میں پکائی گئی ہے، یہ وہ خوشبو ہے جو روح کو سرشار کرتی ہے اور حواس کو بیمار ہونے سے بچاتی ہے احمد اشفاق کی اس خوشبو میں استواری اور پائیداری اس لئے بھی ہے کہ اسے عمل اخلاص سے بھی گزارا گیا ہے، اس عمل سے جس میں خود کو خاکساری و انکساری کی آگ میں تپانا پڑتا ہے، اپنی انا اور اکڑ کو جلانا پڑتا ہے، آسمان جیسی گردن کو بھی جھکا کر زمین پر لانا پڑتا ہے، جو لوگ احمد اشفاق سے ملے ہیں اور جن کا ان سے سابقہ پڑا ہے وہ میری اس بات سے بھی یقیناً اتفاق کریں گے، جی چاہتا ہے کہ اپنی بات احمد اشفاق کی اس بات پر ختم کروں کہ۔

حسین پھول کھلا ہے جو دل کے آنگن میں

مرے خدا اسے اپنی امان میں رکھنا

☆☆☆☆

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن

انٹرویو نگاری: فن اور روایت

نام -ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن, تاریخ پیدائش 27دسمبر1962 ء, مقامبیونہلی ہونالی تعلق داونگرے ضلع (کرناٹک, تعلیم بی ایس سی، بی۔ ایڈ، یم اے، پی ایچ ۔ڈی, دلچسپی پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا تصانیف سواد شب....... (شاعری...2004)نقد اور نظریات..........(تنقید و تحقیق... 2012)سناٹے بول اٹھے........(افسانے.....2012)نقد و بصیرت.......(تنقید و تحقیق... 2015)پروفیسر ایس یم عقیل: فرد اور فنکار......(ترتیب و تزئین. 2015)سی جی خلیل احمد شریف خلیل: چند یادیں..(ترتیب و تزئین2016)نقد و مقال..........(تنقید و تحقیق.. 2017)نقد و احتساب.............(تنقید و تحقیق.. 2017)پیشہ و پتہ، پرنسپال ایس۔ کے۔ اے۔ یچ ملت کالج باشانگر داونگرے۔ 577001 (کرناٹک)
فون موبائل:09449202211،(دفتر)08192-275049

یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی سماج اور معاشرے سے کٹ کر اور ہٹ کر جی نہیں سکتا۔ یہ عمل اسی وقت شروع ہوا ہے جب کہ وہ غاروں اور پیڑوں کے دامن میں زندگی بسر کرتا تھا۔ خوشی اور غم کے ساتھ ساتھ جذباتی ہونے، کسی چیز یا کسی بات یا کسی شخص سے متاثر ہونے کا عمل بھی اسی وقت سے رہا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی کارگذاریوں کا دوسروں کے سامنے اظہار کرنا اور دوسروں کے حالات و کیفیات اور دیگر معاملات کو معلوم کرنا بھی انسانی فطرت اور تقاضات میں شامل رہا ہے۔ یہ عمل آج بھی ترقی یافتہ صورت حال میں کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے۔ آج بھی جب کوئی آدمی کسی نئے مقام پر جاتا ہے اور کسی اجنبی سے مل کر واپس آتا ہے تو جب تک وہ اپنوں یا دوسروں کے پاس اپنا حال اور کیفیت بیان نہیں کرتا اسے تسلی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اس شخص کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے دوسرے احباب بھی بے چین رہتے ہیں۔ کیونکہ اس عمل سے اس شخص کے بارے میں اور اس مقام کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ جب یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے تو آپس میں بات چیت ہوتی ہے اور نوبت سوال و جواب پر پہنچتی ہے۔ اسی طرح دو اشخاص ایک زمانے کے بعد ملتے ہیں تو وہ بھی آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے سوالات کرتے ہیں جس سے آپسی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایک

ISSN No. : 2395-2016

بچہ سودا سلف لانے کے لئے مارکیٹ جاتا ہے تو اس کے واپس آنے پر ماں اس کے ساتھ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ مثلاً تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ سامان پورا لائے ہو یا نہیں؟ اسی دکان سے لائے ہو یا کسی اور جگہ سے خریدے ہو؟ کتنے روپے ہوئے اور کتنے بچے ہیں؟ جو چیزیں لائے ہو وہ عمدہ ہیں یا نہیں؟ غرض اسی طرح کے کئی سوالات ماں اپنے بچے سے پوچھتی ہے اور بچہ ٹھہر ٹھہر کر سارے جوابات دینے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ عمل ایک Conversation ہے مگر ایسے لگتا ہے گویا ماں اپنے بیٹے کا انٹرویو لے رہی ہے اور بچہ کبھی سہم کر تو کبھی بے جھجک جواب دیتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بڑی شخصیت ہے تو بسا اوقات لوگ اس کے بارے میں تفصیلی معلومات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کوئی اس شخص سے راست طور پر ملے اور اس کے بارے میں خود اسی کی زبانی معلومات طلب کرے اور بذریعہ تحریر یا ٹی۔ وی یا ریڈیو عوام کے سامنے پیش کر دے۔

آج زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے۔ دنیا سمٹ کر ایک بڑی کالونی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں غیر معمولی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ علاوہ ازیں کئی نامور شخصیات اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کا مظاہرہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ سائنسی، سیاسی، اقتصادی، فلمی، کھیل کود اور ادبی دنیا میں کئی درخشاں ستارے موجود ہیں ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لئے لوگ بھی بے قرار اور بے چین ہیں۔ ان شخصیات کے کارنامے اور کارگذاریاں اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ کسی حد تک معلوم ہو جائیں گی مگر ان سے راست ملاقات کر کے ان کے بارے میں انہیں سے سوالات کر کے جوابات طلب کر لئے جائیں تو بہت ممکن ہے کہ ان کی شخصیت کے اہم پہلو سامنے آسکتے ہیں۔ یہ ملاقات ایک خاص مقصد کے تحت ہو اور گفتگو کا کوئی لائحہ عمل ہو اور یہ صرف دو افراد کی حد تک نہ ہو بلکہ اسے جاننے یا پڑھنے والے کئی احباب ہوں تو یہ ملاقات رسمی ہونے کے باوجود غیر رسمی بن جائے گی۔ ویسے ایک خاص مقصد کے تحت ہونے والی ملاقات اور گفتگو عموماً رسمی ہوتی ہے جہاں بہت سے تقاضے درپیش ہوتے ہیں، ایک بنا بنایا ماحول اور فضا ہوتی ہے اور ایک مخصوص لائحہ عمل بھی ہوتا ہے جس کے دائرہ میں بحث ہوتی ہے، ذاتی زندگی کی مشغولیات، کارگذاریوں، کارناموں، پروگراموں اور اسکیموں سے متعلق سوالات ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک فرد سوالات کرتا ہے اور جس سے جانکاری حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے وہ دوسرا شخص جوابات دیتا ہے۔ ان جوابات کو پہلا شخص نوٹ کر لیتا ہے اور اسے تحریری شکل میں عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جسے عوام پڑھ کر اس کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا عمل کو ''ملاقات نگاری'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں دو افراد ملاقات

کرتے ہیں، آپس میں گفتگو کرتے ہیں ایک سوالات کرتا ہے اور دوسرا جوابات دیتا ہے اور پہلا اسے تحریری صورت میں عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ملاقات کے بعد Conversation کے اس عمل کو انگریزی میں Interview کہا جاتا ہے۔

انٹرویو کے لئے ''بلاوا'' کا لفظ بھی آتا ہے۔ حکومت ہو یا کسی فرم یا کمپنی کی جانب سے ملازمت کے سلسلہ میں امیدواروں کی قابلیت اور صلاحیت جاننے کے لئے مقررہ وقت اور مقام پر انٹرویو منعقد کیا جاتا ہے۔ جہاں کئی ماہرین باری باری امیدواروں سے سوالات کرتے ہیں اور صلاحیت معلوم کرنے کے بعد تقرر کرتے ہیں۔ اس قسم کے انٹرویو میں انٹرویو لینے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور انٹرویو دینے والا ایک فرد ہوتا ہے جسے تمام کے تشفی بخش جوابات دینے پڑتے ہیں۔ یہاں اچھے اچھوں کے پیر پھسل جاتے ہیں۔ کیونکہ انٹرویو دینا بھی ایک فن ہے جس طرح انٹرویو لینا ایک فن ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انٹرویو بذاتِ خود ایک فن ہے جس طرح دوسرے فنون ہیں۔ کیونکہ یہاں بھی فنی تقاضے ہوتے ہیں جن کے تحت انٹرویو لینا پڑتا ہے۔

جہاں تک اردو میں انٹرویو کا سوال ہے وہ اب ایک فن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہ فن بھی دوسرے فنون کی طرح انگریزی ادب کی دین ہے۔ اردو میں اسے ''ملاقات نگاری'' کا لفظ آتا ہے مگر یہ لفظ اردو میں رائج نہیں ہو سکا اس لئے ''انٹرویو ہی ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا اور یہی رائج ہوا۔

دراصل ''انٹرویو'' کا لفظ انگریزی ہے اور یہ دو الفاظ یعنی '' انٹر''(Inter) اور'' ویو' (View) کا مرکب ہے۔ 'انٹر' کے معنی تعلق، رشتہ، نسبت، واسطہ کے آتے ہیں اور 'ویو' کے دیکھنا، نظارہ کرنا، نفسیاتی و ذہنی جائزہ، جانچ، امتحان، نظر، منظر، نقشہ وغیرہ کے ہیں۔

لغت میں 'انٹرویو' کے معنی ملاقات، بات چیت کے علاوہ ''کسی شخص سے اخبار میں اشاعت کے لئے ملاقات کے ذریعہ معلومات جمع کرنا'' اور مخصوص موضوع پر تفتیش یا جانچ کرنے کے لئے کسی شخص یا اشخاص سے ملاقات کرنا'' کے آتے ہیں۔

چونکہ لغات میں انٹرویو کا مطلب ''ملاقات'' دیا گیا ہے۔ اگر ہم انٹرویو کو ملاقات مراد لیں تو روز مرہ کی زندگی میں ہر دن ہماری ملاقات کئی احباب سے ہوتی ہے۔ اس لئے ہر ملاقات کو انٹرویو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ بہت سی ملاقاتیں محض علیک سلیک کی حد تک ہوتی ہیں یا تھوڑی دیر تک رسمی یا غیر رسمی بات چیت بھی ہوتی ہے۔ جب کہ انٹرویو کا مقصد باقاعدہ طور پر کسی شخصیت سے طے شدہ وقت اور مقام پر ملنا، اس سے سوالات کرنا، اس کے جوابات حاصل کرنا اور ان کو تحریر میں لانا اور انہیں شائع کرنا ہے۔

غرض انٹرویو کا مطلب وہ تخلیق ہے جس میں انٹرویو نگار کسی مخصوص شخصیت سے ملاقات کرے اور ملاقات کے بعد اہم سوالات اور نکات پر گفتگو کو بنیاد بنا کر موصوف کی شخصیت اور اس کے اوصاف و

خصائل کے علاوہ اس کے کارناموں اور کارگذاریوں کے متعلق معلومات اکٹھا کرے اور انہیں تحریری صورت میں لے آئے۔ جہاں پر انٹرویو دینے والے سے ملنے کے بعد کسی خاص مقصد کے تحت سوالات پوچھے جائیں جن کی بدولت موصوف کی زبانی اس کے اور اس کے کام کاج کے بارے میں معلومات حاصل کئے جائیں۔ اس عمل کے دوران جہاں ایک طرف انٹرویو دینے والے کی زندگی کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف انٹرویو نگار کی زندگی کی جھلکیاں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔

انٹرویو لینے والے کو انگریزی میں Interviewer اور اردو میں انٹرویو نگار، ملاقات نگار ،انٹرویو کرنے والا ،انٹرویو لینے والا ،مصاحبہ نگار اور بھینٹ کرتا جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ انٹرویو دینے والے کو انگریزی میں Interviewee کہتے ہیں اور اردو میں انٹرویو دینے والا جیسے الفاظ سے ہی کام چلایا جاتا ہے مگر اعلیٰ سطح پر انگریزی لفظ انٹرویو ہی استعمال ہوتا ہے دیگر اصناف ِادب کی طرح انٹرویو بھی ایک صنف ہے۔ انگریزی میں اس صنف پر بڑا کام ہوا ہے مگر اردو والوں کی تنگ نظری کہئے یا کم علمی یا لاپرواہی اس صنف کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ کیونکہ ہمیشہ ہم غزل اور افسانہ کے علاوہ قدیم اور مروجہ اصناف کا دامن تھامے چلنے کے قائل ہو گئے ہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب اور اس کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہوئے نئے نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے پیش نظر اپنے آپ کو اس قابل بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ ادھر چند برسوں سے نئے اصناف اردو میں بڑے زور وشور کے ساتھ داخل تو ہو رہے ہیں ان میں بعض اصناف کو قدر و منزلت بھی حاصل ہوئی ہے اور بعض اصناف کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ جہاں تک انٹرویو نگاری کا سوال ہے اردو کے ادیبوں اور ناقدوں نے اس پر کم ہی توجہ دی ہے۔ حالانکہ اردو والوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی کرتے ہوئے بہت سے انٹرویو لئے ہیں اور ان کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے اور انٹرویو نگار بھی بن بیٹھے ہیں مگر ''انٹرویو کے فن'' کا جہاں تک سوال ہے اس پر کام نہیں کے برابر ہوا ہے۔ ''فنِ انٹرویو نگاری'' پر ہمیں انٹرویوز کی کتابوں میں چند تاثرات ،تقریظ ،دیباچوں یا مقدموں کی شکل میں ملیں گے۔ فن پر بات کرنی ہو تو ہمیں بے اختیار انگریزی کی کتابیں چاٹنی پڑتی ہیں۔ لہذا میں بھی یہاں وہی کر رہا ہوں۔

انگریزی میں انٹرویو کی ایک تعریف یہ ملتی ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

''انٹرویو اس ملاقات یا بات چیت کو کہتے ہیں جس میں مصنف، مضمون نگار یا نامہ نگار کسی شخص یا اشخاص سے سوال پوچھ کر کسی اخبار یا رسالے میں اشاعت کے لئے یا ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ کرنے کے لئے مواد جمع کرتا ہے'' (The wendom house dictionary of the English language. Page no.745)

میں یہاں سہولت کی خاطر انگریزی ادب کے ماہرین کی آرا پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ گڈ اینڈ ہیاتھ کے الفاظ میں۔

"Interview is fundamentally a process of social interaction"

کرلنگر فریڈ۔این اپنی کتاب op.cit میں انٹرویو کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"The Interview is face to face inter-personal situation in which one person,the interviewee asks a person being interviewed ,the respondent,questions designed to obtain answer pertinent to research problems."(Kerlinger,Fred N Op-cit P-481)

شارٹر آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں انٹرویو کی ایک تعریف اس طرح ملتی ہے۔

" A meeting of persons face to face ,especially for the purpose of formal Conference on some point.

جان ماڑگے (Jhon modge) انٹرویو کی تعریف یوں بیان کرتا ہے۔

In other words it is a purposiveconversation,whose purpose may vary widely to include, for example,a meeting to select from Candidates for a Vacancy,a meeting to arrange for a certain course of action or a meeting undertaken to collect information." (The tools of Social research ,london-by Madge John page-144)

اکارڈ اینڈ اریمان انٹرویو کے بارے میں رقمطراز ہے۔

Interviewing is a data collection,procedure involving verbal communication between the researcher and respondent either by telephone or in a face to face situation."
(Eckhardt,Kenneth.w&Ermann M David ,Op.cit P222)

ویون پامر کے الفاظ میں انٹرویو کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے۔

The Interview constitutes a social situation between two persons,the psychological process involved requ- iring both individuals mutually respond through the social research purpose of the Interview calls for a varied respond from the two parties concerned.
(Palmer,vivien field studies in Sociaogy-1928 P-174)

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انٹرویو کے لئے دو افراد کا ایک دوسرے کے سامنے یعنی" رو بہ رو" ہونا ضروری ہے اور اس دوران دونوں کا متحرک اور محتاط ہونا بھی ضروری ہے۔لہذا انٹرویو ایک ایسا عمل ہے جس میں دو افراد کوئی مخصوص مسائل اور نکات پر محققانہ اور مدلل بحث

ISSN No. : 2395-2016

کرتے ہیں اور انٹرویو نگار عموماً سوالات میں پہل کرتا ہے اور جوابات فراہم کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ اس موقع پر انٹرویو نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ ایسے سوالات اٹھائے جو انٹرویو دینے والے کی شخصیت اور اس کے کارناموں اور کارگذاریوں سے متعلق ہوں۔ ساتھ ہی اپنے سوالات کے ذریعہ اس کے جذبہ تجسس اور تجربات کی بھی ترجمانی کرے جو انٹرویو دینے والے کے سلسلہ میں جو کیفیت عام ذہنوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے انٹرویو نگار کو چاہئے کہ وہ انٹرویو دینے والے کے سلسلہ میں خوب جانکاری رکھے یعنی اس کی شخصیت، اس کے کارناموں کا علم بھی رکھے، اس کے بارے میں عوام کی رائے کا بھی خیال رکھے اور اس کی زندگی کے اہم نکات بھی معلوم کر لے۔ تب کہیں جا کر وہ اچھے سوالات کر سکتا ہے اور انٹرویو کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔

جس طرح گفتگو ایک آرٹ ہے اسی طرح انٹرویو بھی ایک آرٹ ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص بہت اچھی اور خوبصورت گفتگو کر لیتا ہے۔ اسی لئے انٹرویو نگار کو چاہئے کہ وہ گفتگو پر قدرت رکھے اور وہ انٹرویو دینے والے کے جذبۂ گفتگو کو ابھارے، کیونکہ اچھی باتیں توجہ طلب ہوتی ہیں اور انٹرویو دینے والا اس کی باتوں سے متاثر ہو کر تشفی بخش جوابات دے سکتا ہے۔ بسا اوقات گفتگو کا سلسلہ دراز ہو سکتا ہے۔ اس دوران انٹرویوی کے ذاتی خیالات اور تجربات، اس کے نقطۂ نظر کا اظہار اور اس کی وضاحت خود اس کی زبانی بہتر طریقے پر ہو سکتی ہے۔ جس سے اس کی شخصیت کے نادر پہلو سامنے آسکتے ہیں جسے عوام نہیں جانتے، الجھے ہوئے مسائل بھی سلجھ سکتے ہیں، اگر کسی ادیب یا شاعر کا انٹرویو لیا جا رہا ہے تو اس انٹرویو سے اس کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ تخلیقی، تحقیقی اور فن کارانہ صلاحیتوں کی وضاحت ہو سکتی ہے، فلسفۂ زندگی، فکر و فن اور اس کی ذہنی کیفیت کے نت نئے روپ حاصل ہو سکتے ہیں جو اس کی تحریروں اور فن پاروں سے قاری کے سامنے نہیں آسکے ہیں اور جو تشنہ رہ جاتے ہیں۔

انٹرویو ادبی یا غیر ادبی شخصیت ہی کا نہیں بلکہ کسی کا بھی لیا جا سکتا ہے کیونکہ انٹرویو کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ دورِ حاضر میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ یہاں ہر کوئی انٹرویو نگار ہے اور ہر دوسرا شخص انٹرویوی ہے۔ گھر میں ماں باپ اور بچے، کھیتوں، کھلیانوں اور ملوں میں مالک اور مزدور، اسکول کالجوں میں اساتذہ اور طالبِ علم، بازاروں میں گاہک اور دکان دار، مالک اور نوکر غرض زندگی کے ہر شعبہ میں کوئی انٹرویور ہے تو کوئی انٹرویوی ہے اس طرح ہر جگہ انٹرویو ہوتے رہتے ہیں جسے ہم زبانی انٹرویو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ کسی خاص مقصد یا لائحۂ عمل کے تحت نہیں ہوتے ہیں۔ مگر یہی گفتگو ایک خاص مقصد اور لائحۂ عمل اور کبھی ایک یا کبھی دو یا دو سے زائد افراد کے درمیان کسی خاص مواقع پر ہو اور اسے تحریری شکل دی جائے تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور اسے فن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

انٹرویو میں سوالات کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ سوالات جتنے دلچسپ اور معیاری اور

ISSN No. : 2395-2016

معلوماتی ہوں گے جوابات بھی اسی نوعیت کے ہوں گے۔ اس ضمن میں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سوالات انٹرویو کی جان ہوتے ہیں اور جوابات انٹرویو کی شان۔ انٹرویو میں تین قسم کے سوالات ہو سکتے ہیں۔ ایک تو انٹرویوی کی شخصیت کے متعلق مختلف زاویوں سے معلومات فراہم کرنے کی سعی میں کیے جاتے ہیں جن کے ذریعہ انٹرویو نگار پہلے سے تیار رہتا ہے اور کبھی کبھی سوال نامہ تیار کر کے اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ دوسرے اس کے فن اور عصری مسائل کے حوالے سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں جن کی روشنی میں سیر حاصل بحث اور گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے تحریکات اور فن یا کام کی مجموعی صورت حال پر سوالات کر کے گفتگو کی جاتی ہے جو قومی یا عالمی، ادبی یا نیم ادبی، سیاسی یا سماجی تناظر میں بات ہوتی ہے۔ جب ان تمام امور پر گفتگو ہوتی ہے تو یہ گفتگو دلچسپ اور معنی خیز ہوتی ہے جس کی بدولت ایک طرف مسائل کے حل نکلتے ہیں تو دوسری طرف نت نئے تنازعات جنم بھی لینے کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں۔

انٹرویو کے دوران جو سوالات ہوتے ہیں وہ عموماً وہی ہونے چاہئے جن سے انٹرویوی کا تعلق ہوتا ہے۔ انٹرویوی اگر ادیب ہے تو ادب کے تقاضوں پر بحث ہونی چاہئے، سیاست دان ہے تو سیاسی امور پر اور اگر کسی اور میدان کا ہے تو ضروری ہے کہ اسی کے شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے سوالات ہوں جو عصری تقاضوں کو پورے کرنے والے ہوں۔

حالانکہ عصری مسائل اور عصری معاملات کی نوعیت یکساں ہونے کہ باوجود انٹرویو دینے والے مختلف افراد کے خیالات اور نظریات مختلف ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں جواب دیتے ہیں۔ اگر ایک ہی موضوع اور مسئلہ پر دو چار افراد سے الگ الگ انٹرویو لیا جائے تو ان کے نظریات اور خیالات بھی الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح عصری مسائل اور عصری تقاضات پر جتنی معلومات انٹرویو کے ذریعہ ہوتی ہیں کسی اور طریقہ سے توقع نہیں کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ انٹرویو کے ذریعہ دانشوروں، مفکروں، فلسفیوں اور فنکاروں سے مکالمات کے ذریعہ ایسی فکر انگیز باتیں اگلوائی جاسکتی ہیں جن کا اظہار کسی مضمون، مقالے، یا نجی گفتگو میں ممکن نہیں ہوتا ہے۔

اب اگر ہم ادیبوں یا شاعروں کی بات کریں تو وہ اپنی تخلیقات میں کبھی اپنی ذات سے تو کبھی دوسروں سے مخاطب ہو کر اپنے احساسات، خیالات، تصورات، تجربات اور مشاہدات کو چٹخارے بھرنے والی ادبی اور معیاری زبان میں پیش کرتے ہوئے قاری کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات، تصورات و تخیلات اور تفکرات کو اپنی ذات تک محدود رہنے نہیں دیتے بلکہ اپنی ذات سے اٹھ کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اپنے ذاتی خیالات، تجربات اور مشاہدات ان کے اپنے ہونے کے باوجود اپنے نہ ہوں بلکہ قاری کے ہوں اور اس میں قاری اپنے آپ کو پاتے ہوں۔ یہاں شعرا یا ادبا اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر قارئین کے سامنے اپنی اصلی اور

ISSN No. : 2395-2016

ذاتی کیفیت کی عموماً پردہ داری کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات فن کار کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں چھپانے کی کوشش کرنے کے باوجود اکثر و بیشتر فن میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ فن پاروں میں محض جھلکیاں ہوتی ہیں اور وہ پورے طور پر عیاں نہیں ہو پاتی ہیں مگر انٹرویو کے ذریعہ ان کی ذات اور ان کی زندگی کے احوال اور فن سے متعلق ان کے نظریات اور تصورات ظاہر ہوتے ہیں۔

اس سے قبل یہ کہا جا چکا ہے کہ ادبی انٹرویو میں عموماً تین موضوعات پر بحث ہو سکتی ہے۔ ایک تو اس ادیب یا شاعر کی شخصیت اور اس کے فن سے متعلق مختلف زاوئیوں سے بات ہو سکتی ہے۔ دوسرے ادب اور عصری مسائل سے متعلق اور تیسرے ادبی تحریکات کو زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان مسائل پر بھی بحث ہو سکتی ہے جو فی الواقع آج کے ادیب یا شاعر کو درپیش ہیں، ماضی اور ماضی قریب میں اپنی زبان اور اس کے ادب میں واقع ہونے والے محرکات اور تحریکات اور اپنی زبان کی بقا و بحالی اور اس کے تدارک کے تدابیر اور موجودہ صورت حال پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

انٹرویو کا فن آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ کیونکہ یہاں سب سے بڑی دشواری انٹرویو دینے والے کا انتخاب ہے۔ یہاں یہ ضروری بھی نہیں کہ انٹرویو دینے والا کوئی بڑا آدمی ہی ہو۔ لہذا انٹرویو دینے کے لئے مشہور و معروف شخصیات کا انتخاب کیا جائے وہیں غیر معروف اور بدنام افراد کے انٹرویو بھی بسا اوقات اہم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے انٹرویوز کے ذریعہ ان کے ذہنی افکار اور مسائل سامنے آسکتے ہیں۔ اسی لئے آج کل اخبارات و رسائل اور ٹیلی ویژن چینلوں میں انٹرویو کے مخصوص پروگرام ہوتے ہیں علاوہ ازیں ان کے نمائندے گلی کوچوں اور راستوں میں ہاتھ میں مائک تھامے کئی معاملات و مسائل اور نکات پر آرا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ الیکشن اور کسی سانحہ کے موقعوں پر یہ کیفیت زیادہ ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالانکہ ان کا تعلق تحریر سے کم ہوتا ہے مگر راہ چلتے لوگوں سے رائے طلب کرنا بھی انٹرویو ہی کی ایک شکل ہے چاہے انٹرویو دینے والا قابل اور تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ اور گنوار، نامور شخصیات ہوں یا بدنام زمانہ۔ بہر طور ان افراد کی آرا سے حالات سے واقفیت ہوتی ہے اور بڑی حد تک واقعات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ انٹرویو کی غرض و غایت اشاعت سے ہے۔ انٹرویو دینے والا کسی سماج کے کسی بھی طبقہ اور زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھنے والا کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انٹرویو لینے والا اس سے ایک خاص مقصد کے تحت ملے، اس سے سوالات کرے، جوابات نوٹ کرے اور پھر اس گفتگو کو ٹی۔ وی پر ٹیلی کاسٹ کرے یا ریڈیو میں نشر کرے یا کسی رسالہ یا اخبار میں شائع کرے۔

انٹرویو ایک رسمی ملاقات ہے۔ مگر یہاں یہ ضروری ہے کہ اس دوران ایک رفیقانہ اور دوستانہ ماحول بنا رہے، گفت و شنید میں سلاست اور باہمی اعتماد ہو، کسی قسم کی بناوٹ نہ ہو، انٹرویو نگار کو چاہیئے کہ وہ

گھما پھرا کر سوالات نہ کرے اور انٹرویو دینے والے کو نہ الجھائے بلکہ وہ شائستگی اور ملائمیت کے ساتھ پیش آئے اور اطمینان سے جوابات طلب کرے۔

جس طرح ہر تخلیق کا ایک مقصد ہوتا ہے اسی طرح انٹرویو کے بھی مقاصد ہوتے ہیں۔انٹرویو کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپسی گفتگو سے وہ نکات اور پہلو سامنے آئیں جو نئے ہوں اور عوام انہیں نہ جانتے ہوں۔اس کی ذاتی دلچسپیوں اور خواہشوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں،ان کی باطنی نفسیات کو بھی معلوم کیا جائے۔اس سے انٹرویو لینے والا اور انٹرویو دینے والا دونوں شہرت حاصل کر سکیں گے۔انٹرویو کے ذریعہ کئی باتوں کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے اور کئی نکات پر تنازعات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔انٹرویو کا مقصد کسی مسئلہ پر مختلف شخصیات سے مختلف معاملات کے بارے میں نئی نئی معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔خصوصاً ایسی شخصیات سے معلومات فراہم کرنا مقصود ہوتا ہے تو ٹھوس اور مدلل بیانات کے ذریعہ کسی مسئلہ یا گتھی کو سلجھا سکیں۔ایسی باتیں مطالعہ میں اضافہ کی ضامن ہوتی ہیں۔یہ عمل کسی مسئلہ پر مختلف شخصیات کا ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔خصوصاً ایسی شخصیات کے ذریعہ جو ذہین،چالاک،ذی شعور اور عالی مرتبت ہوتے ہیں اور زمانے کے بدلتے ہوئے سیاسی،سماجی،معاشی،اقتصادی،سائنسی و تکنیکی اور علمی وادبی اقدار کا علم رکھتے ہیں اور اپنے ماحول سے بخوبی واقف ہوتے ہیں وہ انٹرویو نگار کو معلومات فراہم کرتے ہیں انہیں انٹرویو نگار شائع کرتا ہے اور لوگ اس سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

انٹرویو دورِ حاضر میں اتنی شہرت حاصل کر چکا ہے کہ آج کل کسی نہ کسی سیاست دان،فلم اسٹار،سائنس دان،ادیب،شاعر نقاد،ڈاکٹر یا انجینئر کے انٹرویو اخباروں،رسالوں اور ریڈیو یا ٹی۔وی میں پڑھنے اور دیکھنے کو ملتے ہیں۔

انٹرویو چونکہ ایک فن ہے اس لئے ہر ایک فن کی طرح اس فن کے بھی اصول ہیں۔مگر انٹرویو کے اصول منفرد اور جداگانہ ہوتے ہیں اس لئے انٹرویو لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔انٹرویو دینے والے کی شخصیت جتنی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اتنی ہی انٹرویو لینے والے کی بھی ہوتی ہے۔کیونکہ انٹرویو کے طریقۂ کار بدلتے رہتے ہیں۔ایک فلم اسٹار کا انٹرویو لیتے وقت جو طریقہ اپنایا جاتا ہے وہی طریقہ ایک ادیب یا سیاسی رہنما یا صدر مملکت یا کسی ملک کے سفیر کے انٹرویو کے موقع پر روا نہیں رکھا جا سکتا ہے۔افسروں سے بات کرنے اور کسی سیاست دان سے بات کرنے میں لہجہ اور انداز بدل جاتا ہے۔انٹرویو کے لئے چند اصولوں کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔پہلا مرحلہ انٹرویو دینے والے کی رضامندی حاصل کرنا ہے اس کے فوری بعد وقت اور مقام کا تعین ہے۔اس ضمن میں انٹرویو نگار کو یہ کم ہی اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی کا وقت اور مقام دے سکے بلکہ یہ انٹرویو دینے والے پر منحصر ہے۔لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں کا ماحول پرسکون اور اطمینان بخش ہو۔

انٹرویور کو چاہیئے کہ وہ طے شدہ وقت اور مقام پر موقع ومحل کے اعتبار سے مناسب اور موزوں لباس زیب تن کر کے جائے تاکہ اس کی شخصیت جاذب نظر لگے اور اسے نہایت ہوش منداور محتاط رہنا ضروری ہے۔ کمرہ میں داخل ہوتے وقت بے احتیاطی اور لاپرواہی سے کام نہ لے، نہ ہی کوٹھی اور بنگلہ اور وہاں کی قیمتی اشیاء سے مرعوب ہواور نہ ہی ان اشیاء کی توڑ پھوڑ کرے۔ اندر پہنچنے اور ملاقات کرنے کے فوری بعد راست انٹرویو شروع نہ کرے بلکہ آپس میں ایک دوسرے کا تعارف اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی گفتگو بھی کرلیں تاکہ اجنبیت کا احساس باقی نہ رہے۔ اس ضمن میں موسم، صحت، پسند، ناپسند غذا وغیرہ کے بارے میں غیر رسمی باتیں ہوں تو مناسب رہے گا۔ اس کے بعد موضوع سے رغبت دلاتے ہوئے انٹرویو کی طرف مائل کرے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ وہ فوراً ایک خفیہ پولس افسر یا ایک انکم ٹیکس کے نمائندہ کی طرح سوالات نہ کرے اور دروغ گوئی سے بھی کام نہ لے۔ اگر انٹرویو نگار اچانک سوالات کی بوچھاڑ کردے تو انٹرویو دینے والا سٹپٹا جائے گا یا خفا ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غصہ میں آجائے اور انٹرویو نگار پر بھڑک اٹھے اور انٹرویو دینے سے انکار کردے۔ لہذا موقع ومحل کے اعتبار سے انٹرویو دینے والے کی طبیعت کو انٹرویو کی طرف مائل کرنے کے بعد اپنے مقصد پر آئے اور مناسب سوالات سے انٹرویو کا آغاز کرے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھے کہ وہ انٹرویوی کی شخصیت اور اس کے مرتبہ سے مرعوب نہ ہوں اور نہ ہی اس کے سامنے سہم اور سکڑ کر بیٹھا رہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنی شخصیت اور اپنے مرتبہ کا رعب جمانے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود انٹرویو نگار اکڑ کر بیٹھے اور اپنی شخصیت کا رعب جمائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

ایک اچھے انٹرویو نگار سے یہ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں کہ وہ انٹرویو کو جانے سے قبل انٹرویو دینے والے کی شخصیت، اس کے اخلاق وعادات، رسم ورواج، پسند وناپسند اور کام کاج کے بارے میں پہلے ہی سے معلومات فراہم کرے۔ بنیادی معلومات کے بغیر انٹرویو کے لئے ہرگز نہ جائیں ورنہ شرمندہ ہونا پڑے گا اور ممکن ہے کہ ناکامی بھی ہوگی۔ کیونکہ انٹرویو کسی شخصیت کے کارناموں کو پہلے جاننے اور پھر اس کے بعد اس کی زبانی معلومات فراہم کرنے کا عمل ہے۔

انٹرویو کا عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ انٹرویو نگار سوال کرتا ہے اور انٹرویوی جواب دیتا ہے۔ یہاں دونوں کے لئے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی نہایت ضروری ہے۔ سوال کرتے وقت احتیاط سے کام لے اور انٹرویوی کو کنفیوژن میں نہ ڈالے بلکہ سوال کا پس منظر واضح کردے۔ ساتھ ہی گنجلک یا ذومعنی پیدا کرنے والے سوالات سے گریز کرے۔ اسی طرح انٹرویوی کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ راست طور پر صحیح جواب دے اور انٹرویو نگار کو نہ الجھائے۔

ایک اچھا اور کامیاب انٹرویو نگار انٹرویوی کی نفسیات سے آگاہ ہوتا ہے۔ بعض شخصیات خوشامد

پسند اور چاپلوسی پسند ہوتے ہیں تو بعض نک چڑھے ہوتے ہیں اور اپنے خول میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لہٰذا انٹرویو نگار کے لئے یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ شخصیت کو پہچان کر انٹرویو لے۔ انٹرویو کے دوران اس بات کا خیال رکھیں کہ غیر ضروری باتیں نہ ہوں بلکہ موضوع کے اعتبار سے موقع ومحل دیکھ کر گفتگو کرے اور جہاں تک ہوسکے کم بات کرے۔ جواب سن کر خاموش بیٹھنے کی بجائے اس کا تجزیہ بھی کرے اور ذہن میں موجود شک وشبہات کو دور کرے اور صحیح مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ زیادہ خاموشی میں عام طور پر نقصانات کا اندیشہ لاحق ہوسکتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوسکے 'ہاں' یا 'نہیں' میں جواب ملنے والے سوالات سے گریز کرے۔ اس ضمن میں ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے ہی سے ایک سوال نامہ تیار کرلیا جائے۔ اگر ہوسکے تو یہ سوال نامہ انٹرویوی کو پہلے ہی دے دیا جائے تاکہ وہ ان کی روشنی میں جوابات دینے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہ سکے۔ انٹرویو کے دوران جو بھی سوال کرے اس کا مکمل جواب ملنے تک انتظار کرے اور اسے سنے، اس کے بعد اگلا سوال کرے جہاں تک ہوسکے سوال پر سوال نہ کرنے سے گریز کرے اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ انٹرویوی کو کریدنے کی کوشش نہ کرے۔ انٹرویو کے دوران بعض ایسے بھی سوالات آسکتے ہیں جو انٹرویوی کے تحت الشعور یا ضمیر کو ٹھیس پہنچانے والے ہوں جو اس کی ذاتی زندگی سے متعلق ہوں جن کی بدولت وہ مایوس یا غمگین یا جذباتی ہوسکتا ہے۔ اگر ایسی صورت نکل آتی ہے تو گفتگو کے زاویئے بدل دینا چاہیئے اور دوسرے نکات پر انٹرویوی کا ذہن موڑ دینا چاہیئے۔ ورنہ بحث طول پکڑے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ تکرار کی نوبت آجائے۔ لہٰذا انٹرویو نگار کو اپنے مقصد اور مطلب سے مطلب رکھنا چاہیئے۔

انٹرویو کے دوران دونوں کے درمیان صحت مند، خوش گوار اور رفیقانہ ماحول بنا رہے اور دونوں کے دل ایک دوسرے کے تعلق سے صاف رہیں اور دلوں میں کدورت یا رنجش کو جگہ نہ دیں۔ یہاں رفیقانہ اور صحت مند ماحول سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ انٹرویوی کی ہر چھوٹی بڑی اور غلط بات کو انٹرویو رنوٹ کرے اور اسے عوام کے سامنے ''بھگوان'' یا ''غیر معمولی'' شخصیت بنا کر پیش کرے۔

یہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھے کہ انٹرویو کے دوران انٹرویوی کو اکتا دینے اور مایوس کرنے سے باز رہے۔ اگر وقت زیادہ ہورہا ہے اور انٹرویوی بیزار ہوتا دکھائی دیتا ہے تو معذرت چاہتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ اس طرح ختم کرے کہ اسے احساس بھی نہ ہو اور وہ برا نہ مانے، وہ یہ سمجھے کہ انفرادی طور پر ایسا کیا جارہا ہے۔

انٹرویو کے لئے اہم شرط یہ ہے کہ انٹرویو کے دوران باتیں نوٹ کی جائیں۔ اس لئے انٹرویور کو چاہیئے کہ وہ اپنے پاس نوٹ پیڈ یا ٹیپ ریکارڈر ساتھ رکھے کیونکہ سنی ہوئی بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ نہیں رہ سکتی ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی باتوں میں تبدیلیاں بھی آسکتی ہیں۔ اگر باتیں نوٹ پیڈ میں نوٹ کی

جارہی ہیں تو جہاں تک ممکن ہو انٹرویو کے دوران کم اور اہم نکات نوٹ کرلیں اور اشاعت کے وقت تفصیل سے لکھیں۔ اگر ٹیپ کی جارہی ہیں تو پہلے انٹرویوی کی اجازت لیں اور پھر ریکارڈ کریں اور اشاعت کے وقت اہم اور ضروری نکات کو ملحوظ رکھیں۔

انٹرویور، انٹرویوی کے پاس یہ کہنے کے لئے نہیں جاتا کہ اس کی شخصیت ایسی ویسی ہے، اس کے کارنامے اور کارگذاریاں ایسی ویسی ہیں اور اس کا فن ایسا یا ویسا ہے یا اس کے کارنامے یا کارگذاریاں صحیح یا غلط ہیں۔ وہ ان متنازعہ معاملات کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے یا وضاحت طلب کرنے نہیں جاتا ہے بلکہ اس کی شخصیت اور اس کے فن یا اس کی ذہنی کیفت کو جاننے کی غرض سے اس کے پاس جاتا ہے۔ اس دوران اگر کوئی متنازعہ نکات پر بحث ہوتی ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی اشاعت سے پہلے انٹرویوی کی منظوری لے۔ اس ضمن میں ہو سکے تو نوٹ کی ہوئی باتیں اسے پڑھ کر سنائے۔

اس کے علاوہ یہ انٹرویو نگار پر منحصر ہے کہ وہ کن امور اور مسائل پر انٹرویوی سے الجھے اور اختلاف کرے اور اس کی کہی ہوئی ساری باتیں مان لے یا نہ مان لے۔ اختلافات نہ ہوں تو ساری تفصیلات بغیر رکاوٹوں کے کھل کر سامنے آسکتی ہیں مگر اختلافات صحت مند ہوں تو معاملات کے سلجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے اور یہی احسن طریقہ ہے۔

جس طرح انٹرویو کا آغاز کرنا ایک آرٹ ہے اسی طرح اس کو ختم کرنا بھی ہنرمندی کا کام ہے۔ اپنا مقصد پورا ہوتے ہی اچانک انٹرویو ختم نہ کرے۔ ورنہ بہت سے خدشات پیدا ہو سکتے ہیں۔ انٹرویوی یہ سوچے گا کہ اس نے اسے بے وقوف بنایا ہے اور اس کا قیمتی وقت برباد کیا ہے۔ اس لئے احسن طریقہ یہ ہے کہ انٹرویوی بیزار ہونے سے پہلے ہی انٹرویو ختم کردے اگر وہ دوسری بیٹھک کی فرمائش کرتا ہے تو اسے قبول کرے۔ اس کے برعکس جہاں تک ہو سکے ایک ہی بیٹھک میں انٹرویو ختم کرنے کی کوشش کرے۔ لہذا انٹرویو ختم کرنے سے پہلے یہ پوچھے کہ "کیا آپ مزید کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پہلو چھوٹ گیا ہے یا تشنہ رہ گیا ہے؟ جب پوری تسلّی ہو جائے تو انٹرویو نگار نہایت احتیاط برتتے ہوئے شائستگی کے ساتھ انٹرویوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہے کہ "آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے اپنا قیمتی وقت ہمیں عنایت فرمایا اور اپنے بہترین خیالات سے ہمیں نوازا...... شکریہ"

انٹرویو کے خاتمہ کے بعد جو اہم مرحلہ ہے وہ جانچ کا ہے۔ اب انٹرویو نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان بیانات اور معلومات کی جانچ حقائق کی روشنی میں کرے اور یہ دیکھ لے کہ وہ باتیں محض قیاس آرائیاں تو نہیں ہیں۔ اگر انہیں مسائل اور نکات پر اسی انٹرویوی نے کسی دوسرے کو انٹرویو دیا ہے تو اس سے موازنہ کرلے دونوں میں مماثلت یا اختلاف ہے تو غور و فکر سے کام لیتے ہوئے انٹرویو کی روداد تیار کرے۔ اگر ایک ہی شخص کا انٹرویو کئی انٹرویو نگاروں نے مل کر ایک ساتھ لیا ہے تو انہیں باتوں اور بیانات کو ہر ایک اپنے

انداز میں پیش کرے گا اس کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سب آپس میں Cross check کرلیں اور سب ایک نتیجہ پر پہنچیں اور انٹرویو کا خاکہ تیار کرلیں۔اس کے بعد اپنے طور پر مناسب طریقہ سے اسے تحریری شکل دیں۔

سب سے بڑا مشکل کام انٹرویو کو تحریری شکل میں پیش کرنا ہے۔اگر انٹرویو لینے والا کوئی ادیب مضمون نویس یا پیشہ ور انٹرویو نگار ہے تو بہت سی آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔اس کے باوجود کئی دشواریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔کوئی بھی فرد کتنا ہی ذہین اور چالاک ہو اس کا قوت حافظہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو بعض اوقات وہ جواب دے جاتا ہے۔اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ نوٹ پیڈ رکھے اور اہم نکات نوٹ کرے یا جدید الیکٹرانک میڈیا کم سے کم ٹیپ ریکارڈر رکھے اور انٹرویو ریکارڈ کرے۔حالانکہ ریڈیو یا ٹی۔وی کے لئے جو انٹرویو لئے جاتے ہیں ان کا مقصد محض نشر یا ٹیلی کاسٹ کی حد تک ہوتا ہے مگر جو اشاعتی نقطۂ نظر سے انٹرویو لئے جاتے ہیں ان کو تحریر میں لانا اہم ہوتا ہے۔

چونکہ انٹرویو ایک فن ہے اسی لئے فنی تقاضوں کے پیش نظر اسے تحریر میں لانا ضروری ہو جاتا ہے۔یہاں اس بات کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے کہ جس شخص نے انٹرویو لیا ہے وہی انٹرویو تحریر کرے کوئی دوسرا شخص اسے تحریر نہ کرے۔انٹرویو کی روداد لکھنا خود انٹرویو لینے والے کی ذمہ داری ہے۔یہاں بعض امور کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔

ہر صنف کی ابتدا قاری کو اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔لہٰذا انٹرویو کی تمہید بھی زوردار، اثر انگیز، معنی خیز اور توجہ طلب ہونی چاہیئے۔تمہیدی اور ابتدائی جملے کمزور یا غیر دلچسپ یا مبہم ہوں تو قاری کی دلچسپی نہیں بڑھے گی۔تمہیدی جملوں سے ہی انٹرویو نگار کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آسکتی ہیں۔صحافتی انٹرویوز میں بیانات کو الگ الگ پیراگراف میں پیش کرنا چاہیئے۔مگر شخصیاتی انٹرویوز کو سوال اور جواب کی صورت میں پیش کرنا چاہیئے۔ادبی انٹرویو کا آغاز ادبی انداز میں ہو۔ابتدائیہ کی نوعیت انٹرویو دینے والی شخصیت کے مرتبہ اور مقام کے تحت ہو۔اس کے بعد ملاقات کا مقصد اور اس کی تشریح ہونی چاہیئے کہ انٹرویو کب اور کہاں منعقد ہوا یعنی صبح، دوپہر، سہ پہر، شام میں، کس تاریخ کو اور کس مقام یعنی دفتر یا رہائش گاہ پر ہوا واضح کردینا چاہیئے۔یہ بھی لکھ دیا جائے کہ انٹرویو کی تاریخ وقت اور مقام پہلے سے طے تھا یا غیر متوقع طور پر اچانک اس کی آمد پر انٹرویو لیا گیا ہے اور یہ عام انٹرویو ہے یا خاص ہے۔اس کے بعد کن نکات پر سرسری بحث ہوئی اور کن نکات پر خصوصی بحث ہوئی، کن کن پہلوؤں پر تبادلۂ خیال ہوا، انٹرویو کے دوران اس کی ذاتی زندگی کے کوئی خاص گوشے سامنے آئے ہیں اگر وہ ضروری ہیں تو انہیں بھی پیش کرے۔اس کا لہجہ، اس کی ادا اور اس کے بات کرنے کا ڈھنگ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔انٹرویو تنہائی میں ہوا یا محفل میں یا کئی افراد کے درمیان ہوا اس دوران انٹرویو دینے والا ہشاش بشاش تھا یا مضطرب و پریشاں محتاط تھا یا

ISSN No. : 2395-2016

گو اسے بھی پیش کیا جانا چاہیئے۔بعض شخصیات انٹرویو کے دوران اپنے بیانات بڑی خوشی سے دیتے ہیں ،بعض محتاط ہو کر،بعض خوفزدہ ہو کر اور بعض بخیلی سے کام لیتے ہیں کوئی عجیب اور غیر متوقع جواب دیتے ہیں ایسی صورت میں یہ انٹرویو نگار پر منحصر ہے کہ وہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے انٹرویوی کی رائے کو ضبط تحریر میں لائے یا بعض نکات کو چھوڑ دے۔ضروری نہیں کہ ہر ایک بات تحریر میں لائی جائے اور جو غیر ضروری ہیں انہیں حذف کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے ہاں،ہوں،بس،کافی ہے،ایسا نہیں ہے،میرا خیال ہے کہ،چونکہ،بلکہ کے علاوہ میرے سوال کے جواب میں انہوں نے یہ کہا......میرے پوچھنے پر انہوں نے ایسا کہا وغیرہ جیسے بے تکے اور غیر ضروری الفاظ اور جملوں سے احتراز کیا جائے۔

غرض انٹرویو جتنی محنت سے لیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ محنت انٹرویو تحریر کرنے میں لگتی ہے۔وہی انٹرویوز مشہور و مقبول ہوئے ہیں جن کی تحریر دلچسپ اور اثر آفرین ہے۔یہ انٹرویوز قارئین،محققین،ناقدین اور اسکالرز کے لئے ایک بیش بہا اور نادر و نایاب تحفہ ہیں۔اس لئے کہ انٹرویوز فکر انگیز مکالمات پر مشتمل دستاویزات ہوتے ہیں ان میں دانشوروں،مفکروں،ادیبوں،فن کاروں سیاست دانوں کی صلاحیتیں اور کاوشیں ہوتی ہیں۔جن کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔

انٹرویو کا باضابطہ آغاز و ارتقاء مغربی ادب میں انیسویں صدی میں ہوا۔اس صنف کا استعمال مغربی ادب کے اخبارات و رسائل میں خوب ہوا۔ابتدا میں جو انٹرویو نگار مشہور ہوئے ان میں رومن رولاں،لارنس لُڈوک،لوئی فشر،گائی لے ٹیز وغیرہ اہم ہیں۔"پیرس ریویو" نامی رسالہ نے اس صنف کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔اخباری انٹریو یو کا آغاز باضابطہ طور پر امریکہ میں انیسویں صدی کے درمیانی سالوں میں ہوا۔مشہور امریکی صحافی جیمس گارڈن بینٹ نے پہلا انٹرویو لیا۔

اردو میں انٹرویو کا سلسلہ بہت دیر سے ہوا۔سب سے پہلے نریش کمار شاؔد نے اس صنف کو باضابطہ طور پر اختیار کیا۔نریش کمار شاد کے انٹرویوز کو اولیت کا درجہ دیا جاتا ہے حالانکہ ان کے انٹرویوز میں انٹرویو کی تمام خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں اس کے باوجود ان کے تصوراتی انٹرویوز جو غالبؔ اور جوش ملیح آبادی سے متعلق ہیں وہ ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں۔فکر تونسوی سے لیا گیا انٹرویو بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ان کے علاوہ اردو انٹرویو نگاری کے میدان میں جو نام ابھرے ان میں حسن رضوی،سلامت علی مہدی ،م۔افضل،علی حیدر ملک،انور سدید،ندا فاضلی،فیاض رفعت،شاہد صدیقی،طاہر مسعود،حیدر قریشی،مناظر عاشق ہرگانوی،،محمد خالد عبادی،جمیل اختر،عبدالباری اور خالد سہیل کے نام اہم ہیں۔

اردو انٹرویو نگاری کو ایک اہم موڑ دینے میں ایک اہم نام طاہر مسعود کا ہے"یہ صورت گر کچھ خوابوں کے"ان کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے جس میں 17 ادبی شخصیتوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔جن میں فیض احمد فیض ،غلام عباس،سلیم احمد،پروفیسر احمد علی،ممتاز مفتی،قیوم نظر،شوکت صدیقی،اشفاق احمد،ڈاکٹر جمیل جالبی،مشفق

ISSN No. : 2395-2016

خواجہ حسین، کرنل محمد خان، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی سے لئے گئے انٹرویوا چھے ہیں جن سے ان ادیبوں کی شخصیت اور فن کے ساتھ ساتھ محرکات اور ادبی تحریکات سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی بسیار نویس فن کار کا نام ہے۔وہ ہر میدان میں اپنے کرتب دکھانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ان کے انٹرویو کے پہلے مجموعہ کا نام "رو بہ رو" ہے۔جس میں 14 مشہور و معروف ادبی شخصیات سے لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔جن کے مطالعے سے ان کی نظر انتخاب اور ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔اس میں پہلا انٹرویو ڈاکٹر جمیل جالبی سے لیا گیا شامل ہے۔جس میں ان کی ادب سے وابستگی اور تحقیق وتنقید کے موضوعات پر سوالات اٹھائے گئے ہیں۔اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ،گیان چند جین ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، رام لعل ،جوگندر پال ،ڈاکٹر انور سدید،ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شمس الرحمن فاروقی ڈاکٹر فہیم اعظمی اور دیپک قمر سے لئے گئے انٹرویو شامل ہیں۔یہ کتاب صرف انٹرویوز کے لئے مشہور نہیں ہے بلکہ انٹرویو نگاری کے فن کے تعلق سے بھی اعلیٰ مقام رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے انٹرویو نگاری کے فن،اہمیت وافادیت اور مسائل کے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی کے انٹرویوز کا دوسرا مجموعہ "آمنے سامنے" ہے۔اس مجموعے میں بھی "رو بہ رو" کی طرح اکثر انٹرویوز میں تقریباً وہی سوالنامہ دہرایا گیا ہے اور اس میں بھی بعض انٹرویوز کو چھوڑ کر تاریخ ،وقت اور مقام کا پتہ نہیں ملتا۔اس میں بھی انہوں نے 14 انٹرویوز شامل کیا ہے۔جن میں پروفیسر احتشام حسین، میرزا ادیب، محمد علی صدیقی ، پروفیسر عتیق احمد، علامہ ماجد الباقری ،خواجہ عبدالغفور، سلامت علی مہدی ،رشید امجد، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، شین مظفر پوری ، گربچن سنگھ وغیرہ کے انٹرویوز ہیں جوان شخصیات کی روزمرہ معمولات ومشغلات کے ساتھ ساتھ ادبی کارناموں اور کارگذاریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی میدان کا ایک اور نام جمیل اختر ہے جن کی انٹرویو کی کتاب "نوائے سروش" کے نام سے مشہور ومقبول ہوئی ہے۔اس میں 17 انٹرویوز ہیں۔یہ کتاب انٹرویوز کی دیگر کتابوں سے مختلف ہے کیونکہ اس میں انٹرویو نگار مختلف ہیں اور انٹرویوی ایک ہے۔ یعنی تمام انٹرویوز صرف قرۃ العین حیدر سے لئے گئے ہیں ساتھ ہی اس میں شامل انٹرویوز کے عنوانات بڑے دلچسپ ہیں۔اس کے علاوہ یہ کتاب قرۃ العین حیدر پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔پہلا انٹرویو ڈاکٹر جمیل اختر کا ہے جو 89 صفحات پر مشتمل ہے۔جس کا عنوان "عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کرنے کی" کے عنوان سے ہے اور اس میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

دیگر انٹرویو نگاروں میں شفیع عقیل کا انٹرویو (ہمارے ادیبوں کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں) بھی اہمیت رکھتا ہے۔افتخار امام صدیقی کا یونس اگاسکر اور انور قمر کی موجودگی میں لیا گیا انٹرویو (میرے

ISSN No. : 2395-2016

افسانوں میں بہت کافی ویرائٹی ہے)شمس الرحمٰن فاروقی کا (کچھ ناقدین کو زعم ہے کہ وہ ادب کے کنگ میکر ہیں)، ابوالکلام قاسمی کا (میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں) سکریتا پال کا (نقادوں نے فکشن کو سراسر نظر انداز کیا ہے)، ڈاکٹر سہیل احمد خان کا ذولفقار احمد تابش، مسعود اشعر، صفدر میر، نگار عزیز بٹ اور جاوید شاہین کے ساتھ مل کر لیا گیا انٹرویو (سرسید بڑے زبردست قسم کے ریفارمسٹ تھے)، حسن رضوی کا (پاکستان ایک مقدمہ تھا جو قائداعظم نے جیت لیا)، انیس الحق کا یم ایچ عسکری، ہاجرہ مسرور اور احمد علی خان کی شرکت میں لیا گیا (ہندوستان میں اردو سیاست کا شکار ہوگئی ہے)، شمیم حنفی کا (ہمارے اکثر ناقدین لکیر کے فقیر ہیں)، آصف فرقی کا دو مرتبہ لیا گیا انٹرویو ہے لیکن جمیل اختر نے اسے نوائے سروش میں (نقادوں نے خاتون لکھنے والیوں کو اگنور کیا ہے) کے نام سے ایک ہی بنا دیا ہے۔ اسی طرح زبیر رضوی کا (بیشتر نقادوں کو فکشن کی سمجھ نہیں ہے) بھی اہم انٹرویو ہے۔ قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر بھارت ٹائمز کے لئے پرویز احمد کا (عام آدمی میرا موضوع کبھی نہیں رہا)، انہیں دنوں الکا سنگھ کا انگریزی ہفت روزہ ''سنڈے ابزرور'' کے لئے لیا گیا انٹرویو (ہندوستان میں اردو کو پاکستان کے قیام کی سیاسی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے)، اس کے علاوہ شہزاد منظر کا لیا گیا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو'' اردو میں متوازن تنقید بہت کم لکھی گئی ہے'' کے عنوان سے شامل ہے۔

ان انٹرویوز کے لئے تمام عنوانات جمیل اختر کے دیئے ہوئے ہیں۔ جمیل اختر نے جو عنوانات تجویز کئے ہیں وہ دراصل سوالات کے جواب میں قرۃ العین حیدر کے چبھتے ہوئے وہ جملے ہیں جو انٹرویو کے دوران دیئے گئے۔

''داستانِ عہدِ گل'' قرۃ العین حیدر کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ جس میں مضامین اور انٹرویوز شامل ہیں۔ مضامین کے علاوہ اس میں آٹھ انٹرویوز شامل ہیں۔ ان میں سے چھ انٹرویوز جمیل اختر کی مرتب کردہ کتاب ''نوائے سروش'' میں شامل ہیں لیکن دونوں کتابوں میں یہی انٹرویوز متفرق عنوانات کے تحت شائع کئے گئے ہیں۔

''ملاقاتیں'' سید عبدالباری کی کتاب ہے جو صرف انٹرویوز پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں اردو انٹرویو نگاری کی روایت کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں چودہ مختلف اور اہم شخصیتوں سے لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔ اس میں شامل انٹرویوز مرقع نگاری کے زمرے میں آجاتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ان انٹرویوز میں مرقع نگاری کے ساتھ ساتھ منظر نگاری بھی پائی جاتی ہے جس کی بدولت یہ ادبی شہ پاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے عبدالباری نے ''ملاقاتیں'' کو انٹرویو نہیں بلکہ انٹرویوز کی روداد قرار دیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، قائدِ ملّت محمد اسمٰعیل، بیرسٹر یٰسین نوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، بدرالدین طیب جی، مولانا سید

ابوالحسن ندوی وغیرہ معروف و غیر معروف ادبی ،غیر ادبی ،سیاسی اور علمی شخصیات سے لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔

''اردو مراسلاتی انٹرویو'' محمد خالد عبادی کی کتاب ہے جس میں پچیس مشہور و معروف شعراء، ادباء اور فلمی ہستیوں سے لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔ دراصل اس کتاب میں شامل انٹرویوز مراسلاتی ہیں ۔تمام انٹرویوز کے لئے تیار کردہ سوالنامہ ارسال کیا گیا۔لیکن یہ سوالنامہ خوب سوچ سمجھ کر اور نہایت یکسوئی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔جس کے جوابات انٹرویو دینے والوں نے بڑی سوچ ،سمجھ اور غور وفکر کے ساتھ دیا ہے۔ یہاں نہ انٹرویو کا ماحول ہے، نہ منظر اور نہ وقت کی پابندی اور نہ ہی انٹرویوی کا رکھ رکھاؤ۔انٹرویو نگار نے خود یہاں مراسلاتی انٹرویوز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' یہ مراسلاتی انٹرویوز ہیں۔ان میں کسی کے پرخچے اڑانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی 'ریمانڈ' لینے کا انداز اختیار کیا ہے''

اس میں اختر الایمان ،ڈاکٹر صفدر آہ ، جوگندر پال ،دیویندر سر ،رام لعل ،ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ،رضا نقوی واہی ،علی جواد زیدی ،سید منجو قمر ،عزیز قیسی ،علی سردار جعفری ،عنوان چشتی ،کوثر چاند پوری ،ڈاکٹر گیان چند جین ،سلطان محمد خان مخمور سعیدی ،،ندا فاضلی ،وامق جونپوری ،وجاہت علی سندیلوی ،وغیرہ ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ فلمی لائن کے کیدار شرما ،وجاہت مرزا کے ساتھ لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔ان انٹرویوز میں خالد عبادی نے انٹرویوی کا تعارف بھی لکھا ہے۔

''میرے قبیلے کے لوگ'' خالد سہیل کے انٹرویوز اور مضامین کی کتاب ہے۔اس کتاب میں دیگر مضامین کے ساتھ صرف پانچ انٹرویوز افتخار عارف ،اشفاق حسین ،حمیرہ رحمٰن ،نسیم سید صاحبہ اور جاوید دانش سے لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔ان انٹرویوز کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ادیب کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کے تخلیقی سفر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔خالد سہیل نے یہ تمام انٹرویوز اردو کی وادیوں سے دور مغربی سبزہ زاروں یعنی امریکہ میں دورانِ قیام لئے ہیں۔جن میں مقام اور تاریخ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے اور ان شخصیات کی ہجرت ،ان کے مسائل ،ذاتی زندگی ،ادب سے وابستگی وغیرہ کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ان انٹرویوز سے اختر شیرانی کی مشہور نظم '' وہ دیس سے آنے والے بتا'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کیونکہ یہ پانچوں شخصیات مہاجر ہیں جو تلاش معاش کی خاطر ہجرت کئے ہیں۔

''آل احمد سرور ۔شخصیت اور کارنامے'' امتیاز احمد کی مرتب کردہ کتاب ہے۔اس میں خلیل الرحمن اعظمی کا آل احمد سرور سے لیا گیا ایک انٹرویو شامل ہے جس میں سرور کی شخصیت ،تنقیدی شعور ،ذہنی

ارتقاء، ان کی شاعری، اردو زبان وادب، اردو تنقید اور آزادی کے بعد تحقیق وتنقید جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

رحیل صدیقی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے انٹرویوز کا انتخاب کتابی صورت میں ''سوشمس الرحمن فاروقی: محوِ گفتگو'' کے نام انٹرویوز کی ایک مرتب کر کے شائع کروائی ہے۔

ابھی حال ہی میں ڈاکٹر انیس صدیقی اور رحیل صدیقی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے انٹرویوز کا انتخاب کتابی صورت میں ''سوتکلف اوراس کی سیدھی بات۔ فاروقی: محوِ گفتگو'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ 28 انٹرویوز پر مشتمل یہ کتاب انٹرویوز کی دیگر کتابوں سے مختلف ہے کیونکہ اس میں انٹرویونگار مختلف ہیں اور انٹرویوی ایک ہے۔ یعنی تمام انٹرویوز صرف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے لیے گیے ہیں۔ ان انٹرویوز کے عنوانات بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ دراصل ڈاکٹر انیس صدیقی نے جو عنوانات تجویز کئے ہیں وہ فاروقی صاحب کے وہ جملے ہیں جو انٹرویو کے دوران فاروقی صاحب نے کہے ہیں۔

اسی طرح ریاست کرناٹک کے ایک شاعر وادیب اکرم نقاش نے بھی انٹرویوز کی ایک کتاب ''خانۂ تکلم'' شائع کی ہے۔ جس میں کل گیارہ انٹرویوز شامل ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف انٹرویونگار کا اسلوب نگارش قاری کو متاثر کرتا ہے تو دوسری طرف اس میں ادب کے میدان کی سرکردہ ہستیوں کے انٹرویوز لئے گئے ہیں جو جدیدیت اور جدید ادب کے بنیاد گذار اور علمبردار رہے ہیں۔ ان انٹرویوز کی نوعیت شخصی، ٹیلی فونک اور مکتوبی ہے۔ اس کتاب میں بعض شخصیات سے جدیدیت کے ضمن میں چند سوالات دہرائے گئے ہیں لیکن یہ ناگزیر بھی تھا کیونکہ تمام کا تعلق عصر حاضر اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فضیل جعفری، ندا فاضلی محمد علوی اور بلراج کومل سے لئے گئے انٹرویوز خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ انفرادی طور پر لئے گئے کئی انٹرویوز رسائل، جرائد، اخبارات ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ میں ملتے ہیں۔ ان وسائل کی مدد سے بعض انٹرویونگاروں نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان دنوں رسائل وجرائد، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر ان گنت انٹرویوز نشر اور شائع ہورہے ہیں۔ ان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ جن کی تفصیل طویل ہے۔ دور حاضر میں زندگی کے ہر مرحلہ پر انٹرویو ناگزیر ہو چکا ہے اور یہ وبا سماج میں خصوصی طور پر ادب میں زیادہ ہی پھیل چکی ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر محبوب بڑائی کا ایک تصوراتی انٹرویو جو'' انٹرویو'' کے نام سے ماہنامہ''

جمالستان'' دہلی (ڈائجسٹ) جلد۔۲۷شمارہ نمبر۱۲، دسمبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔یہ انٹرویو'' دی جنت ٹائمز'' کے خصوصی نمائندے منکر نکیر نے عاشق سے لیا ہے۔یہ ایک مزاحیہ اور تصوراتی انٹرویو ہے۔جس کے سارے کردار خیالی ہیں مگر بڑا دلچسپ ہے۔جس سے دور حاضر میں انٹرویو کے عام رواج پر روشنی پڑتی ہے۔اس کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔منکر نکیر عاشق سے پوچھتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔اس سوال پر حیران ہو کر وہ جواب دیتا ہے۔

''ارے یہاں بھی انٹرویو کا رواج ہے کیا؟
ہمارے یہاں تو انٹرویو لینا اور دینا ایک عام مرض ہو گیا ہے۔نوکری کے لئے انٹرویو، دامادی کے لئے انٹرویو، داخلہ کے لئے انٹرویو، غرض ہر بات کے لئے انٹرویو......حد تو یہ ہے کہ آج کل ادب کو بھی یہ روگ لگ گیا ہے، دن رات ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو لئے جا رہے ہیں۔''

مذکورہ حوالہ آدھی صدی سے پہلے کا ہے۔جب کہ ذرائع ابلاغ کا اتنا زور و شور بھی نہیں تھا مگر آج کل یہ سلسلہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ ادبی انٹرویوز ہر جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

☆☆☆

ابراراحمد اجراوی

جدید عربی ناولوں کے اردو تراجم

نام: ابراراحمد، والد: عبدالعزیز صاحب، قلمی نام: ابراراحمد اجراوی، وطن: اجرا، مدھوبنی، بہار، حفظ قرآن: مدرسہ فیض الغربا، اجرا مدھوبنی، فضیلت: دار العلوم دیوبند، تدریس: دار العلوم دیوبند، بی اے: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ایم اے: جے این یو، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، نیٹ رجے آر ایف، ۲۰۰۸ء، ایم فل: جے این یو، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، پی ایچ ڈی: جے این یو، نئی دہلی ۲۰۱۶ء، مطبوعہ کتابیں: ۱- اسلام اور مغربی تہذیب (تحقیق وتخریج ۲۰۰۶ء) ۲- تذکیر بسورۃ الکہف (تحقیق وتخریج ۲۰۰۷ء) ۳- نبی رحمت (ترجمہ) ۴- ادب امکان (مجموعۂ مضامین، ۲۰۱۴ء) تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش (۲۰۱۷ء) ۵- عربی ادبیات کے اردو تراجم: تحقیق و تنقید (۲۰۱۸ء)، زیر طبع: ۱- محاکمہ (تنقیدی مضامین) ۲- عربی ناول: تجزیہ اور تقابل ۳- اقبال، اقبالیات اور دیوبند، اسلامی، سیاسی، سماجی، سوانحی اور ادبی موضوعات پر سو سے زائد مضامین ومقالات جو ملک و بیرون ملک کے مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہوئے، دسیوں قومی اور ریاستی سطح کے ادبی اور علمی سیمناروں میں شرکت اور مقالہ خوانی، اعزازات وانعامات: ۱- سیکنڈ پوزیشن، کل ہند مقابلۂ مضمون نویسی (۲۰۰۳ء)۔ ۲- سجاد ظہیر ایوارڈ ۲۰۰۹ء (جے این یو)۔ ۳- ایم اے ٹاپر ایوارڈ ۲۰۱۰ء (دہلی اردو اکادمی نئی دہلی)۔ ۴- بہار اردو اکادمی انعام (۲۰۱۴ء) رابطہ: مقام و پوسٹ اجرا، وایا ریام فیکٹری، ضلع مدھوبنی بہار، ۸۴۷۲۳۷ موبائل: 08651708079 ای میل: abrarahmadijravi@gmail.com

ترجمے نے دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ترجمہ کے ذریعے مختلف قوموں کے درمیان علمی، ادبی، صنعتی، تجارتی، معاشی اور سماجی میدان میں لین دین کا عمل انجام پاتا ہے۔ ترجمے کی راہ سے، دو مختلف کلچر اور متفرق تہذیب وثقافت اور سماجی پس منظر کی حامل قوموں کے مابین مفاہمت وموافقت اور ارتباط واختلاط کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور دو متصادم تہذیبیں مخالفت اور معاندت کے رویے سے گریز کر کے، اتحاد اور مفاہمت کے راستے پر چل پڑتی ہیں۔ ترجمے کی مدد سے ہم ایک دوسرے کو ان کی تہذیب، ان کے رہن سہن، ان کی معاشرت اور ان کی فطری اور سماجی ضروریات کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔ اگر ترجمے کی سہولت موجود نہ ہو تو دنیا کا ایک کنارہ دوسرے کنارے سے کٹ کر رہ جائے گا اور ہمہ

گیر عالمی ترقی کی رفتار ماند پڑ جائے گی۔ دو زبانوں کے درمیان لسانی اور فکری روابط استوار کرنے اور ان کے درمیان مضامین و موضوعات کی سطح پر اخذ و قبول کے دائرے کو وسیع کرنے میں بھی ترجمہ کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ لیکن ہر قسم کے مواد کے ترجموں کو ایک خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ علمی، فنی، تکنیکی اور سائنسی کتابوں اور ادبی کتابوں کے ترجمے کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ ادبی کتابوں کے ترجمے سے نہ صرف یہ کہ مترجم منہ زبان کے موضوعات و مسائل، فکری و فنی سروکار اور اس کے طرز و اسلوب سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے، بلکہ اس زبان کی ادبی سرگرمیوں اور وہاں کے لسانی منظرنامے پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔

سامی زبان کے خاندان سے تعلق رکھنے والی عربی ایک قدیم مہذب اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس نے دنیا کی بہت سی زبانوں پر لفظیات اور تشبیہات و محاورات کے حوالے سے اپنے حیرت انگیز نقوش ثبت کیے ہیں۔ اردو نے بھی، اپنے مزاج و مذاق کو برقرار رکھتے ہوئے عربی زبان سے خوشہ چینی کی ہے۔ اردو نے عربی زبان کے الفاظ کو ہی نہیں اپنایا، بلکہ اس کے رسم الخط، اصوات، قواعد، تلمیحات و تشبیہات اور اصطلاحات تک کو کہیں بعینہ تو کہیں معمولی رد و بدل کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ اردو کا دامن جس طرح دیگر عالمی زبانوں انگریزی اور فرانسیسی کے ترجمے سے مالا مال ہے، اسی طرح عربی نثر و نظم کے ترجموں نے بھی اس کے ادبی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

عربی اردو ترجمے کی ابتدا کے حوالے سے کسی حتمی تاریخ کا تعین ذرا دشوار ہے۔ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ عربی اردو ترجموں کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا ہے۔ ترجموں کا یہ شروعاتی کام مذہبی کتابوں کے ترجمے سے ہوا، جن میں کلام خداوندی قرآن کریم کا ترجمہ سرفہرست ہے۔ شاہ رفیع الدین اور ان کے بعد شاہ عبد القادر کے قرآن کریم کے تراجم عربی اردو ترجمے کے باب میں نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں ترجمے کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا۔ جہاں کئی عربی کتابوں کو اردو کا لباس عطا گیا۔ اس کام کو دہلی کالج نے بھی آگے بڑھایا۔ اس تعلق سے سب سے نمایاں کام دارالترجمہ عثمانیہ کا ہے، جہاں تقریباً ۴۰۰ کتابوں کو اردو کا لباس عطا کیا گیا۔ ترجمہ شدہ کتابوں میں عربی کتابوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ اس دور کی اکثر کتابوں کا تعلق یا تو مذہبیات سے تھا، یا پھر وہ تاریخ و ثقافت، علم نجوم، علم ریاضی، علم کیمیا، علم طب اور دوسرے علوم و فنون سے تعلق رکھتی ہیں۔ ادبی ترجموں پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔

اردو پر دوسری زبانوں خصوصاً عربی کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ اردو نے ابتدا ہی میں الفاظ و معانی اور

ISSN No. : 2395-2016

موضوعات کی سطح پر اتنی جلد اسی لیے ترقی کی کہ اس نے دوسری زبانوں کے الفاظ، تراکیب، تشبیہات و استعارات اور موضوعات سے خوشہ چینی شروع کردی تھی۔ اکتساب کا سب سے بہتر اور مستحکم ذریعہ ترجمہ ہی تھا، جس کے واسطے اردو کے موضوعاتی اور لسانی سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ پھر جب اردو ایک ہند آریائی زبان کی شکل میں ملک کے طول وعرض میں بولی جانے لگی اور اس نے لنگوا فرنکا کی حیثیت اختیار کرلی، دوسری زبانوں سے ترجمے کی مقدار و معیار میں نمایاں اضافہ ہوا۔ دوسری زبانوں سے ترجمے کے لیے ماہرین اور مترجمین کی جماعت تیار کی گئی، کئی حکومتی اور نیم حکومتی ادارے قائم ہوئے، ابتدا میں یہ ترجمے مذہب واخلاق، دعوت وارشاد اور اسلامیات و مذہبیات تک محدود تھے، تخلیقی اور ادبی شہ پاروں کو بہت کم منتقل کیا جارہا تھا، کیوں کہ اس زمانے میں ایشیائی زبانوں میں زبان وادب کی سطح پر تبدیلی کی لہر زیادہ تیز نہیں تھی اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس زمانے میں جو افراد اور جو ادارے عربی سے اردو ترجموں کی خدمت پر مامور تھے، یا آزادانہ طور پر یہ خدمت انجام دے رہے تھے، ان کا تعلیمی اور تدریسی تعلق اسلامی درس گاہوں اور تربیتی اداروں سے تھا، جو ایک خاص مقصد تعلیم وتربیت کی غرض سے اسلام اور اسلامیات کے موضوع پر منتخب کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے، ان مذہبی کتابوں کے ترجمے کا ایک بڑا مقصد دعوت وتبلیغ اور وعظ وارشاد تھا، تاکہ ہندستان اور ایشیا کے وہ لوگ، جو عربی زبان سے ناواقف ہیں، اسلامی تعلیمات سے اپنی مادری زبان میں واقف ہوسکیں۔ لیکن جب ایشیائی زبانوں میں مغربی ادب کی طرح نئی اصناف نے جنم لیا، نومولود زبانوں نے بھی ترجمے کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھ لیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عربی زبان میں ناول نگاری کی ابتدا کا زمانہ وہی ہے، جب اردو میں اس صنف کی بنیاد ڈالی جارہی تھی۔ عربی زبان میں بھی اس نئی صنف کی بنیاد انیسویں صدی کے نصف آخر میں پڑی۔ مصر اور شام کی سرزمین اس کے آغاز وارتقا کا گہوارہ ثابت ہوئی۔ یورپ سے آنے والے صنعتی انقلاب، مصر میں پریس کی آمد، اخبارات ورسائل کی اشاعت، نئے تعلیمی اداروں کے قیام جیسے سماجی عوامل نے ناول وافسانہ جیسی اصناف کے لیے فضا ہموار کی۔ جب مڈل کلاس کے نوجوانوں نے زیادہ سے زیادہ نئی تعلیم گاہوں کا رخ کرنا شروع کیا اور بیرونی ممالک سے ان کے تعلیمی تعلقات استوار ہوئے، تو انھیں اپنے فکر ونظریات سے ہم آہنگ نئے قسم کے ادبی زاد کی تلاش ہوئی۔ ان کے لیے فکشن اور قصے کہانی نے فکری تسکین کا سامان فراہم کیا۔ کیوں کہ ناول وافسانہ میں ان کے حقیقی مسائل کی ترجمانی کے نقوش بہت گہرے ہوتے تھے، جو

ISSN No. : 2395-2016

ان کے دل و دماغ کو بہت اپیل کرتے تھے۔

مشہور عالم نوبل ایوارڈ یافتہ عربی ناول نگار نجیب محفوظ (۲۰۰۶-۱۹۱۱ء) کے ناول 'السکریہ' کا جواردو ترجمہ (شوگر اسٹریٹ، مترجم: ظفر امام) حال ہی میں شائع ہوا ہے، وہ عربی اردو ترجموں کے باب میں ایک خوش گوار اضافہ ضرور ہے، مگر یہ ترجمہ انتہائی ناقص اور عربی متن سے مزاحم ہے۔ دوسری بات یہ کہ السکریہ کے صرف ایک حصے کا ترجمہ کیا گیا ہے، السکریہ صرف ۳۶/ابواب پر ہی مبنی نہیں، بلکہ یہ ایک ضخیم ناول ہے۔ درمیان میں ۳۴/ویں باب کا ترجمہ بھی چھوڑ دیا گیا ہے اور عربی متن میں باب کے جو نمبرات درج ہیں اس کے برخلاف اردو ترجمے میں نمبرنگ کردی گئی ہے۔ جس سے قاری کو تقابلی مطالعے کے دوران ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مترجم نے صرف انگریزی متن کو سامنے رکھا ہے، ناول کے اصل عربی متن کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے تھا، کیوں کہ عربی متن سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے عربی عبارتوں کی صحیح ترجمانی نہیں ہوسکی ہے، اور اس کی وجہ سے کہانی اور مکالمے میں جھول پیدا ہوگیا ہے۔ عربی کردار کے ناموں کا ایسا ناقابل فہم ترجمہ کیا ہے، جس سے مترجم کی عربی اور اسلامی تہذیب سے ناواقفیت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ترجمہ سے زیادہ متن کے پیراگرافس کی تلخیص پر ارتکاز کیا گیا ہے۔ اگر مکمل کتاب کا عربی اور انگریزی دونوں متون کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر اور قریب المتن ہوتا۔ اس سے نہ صرف کہانی میں روانی، ارتباط اور تکملیت کا عنصر برقرار رہتا، بلکہ یہ عربی اردو تراجم کے باب میں بھی ایک شاہکار کہلانے کا مستحق ہوتا۔

آئین نو، نجیب محفوظ کے ہی ابتدائی دور کے کامیاب ناول 'القاہرۃ الجدیدۃ' کا ترجمہ ہے۔ مترجم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے استاد شعبۂ عربی ڈاکٹر فیضان بیگ ہیں۔ انھوں نے راست طور پر عربی متن کی مدد سے بہت عمدہ اور کامیاب ترجمہ کیا ہے، ترجمہ میں عربی متن کا اعتبار و وقار بھی مجروح نہیں ہوا ہے اور اردو کے مقبول اور روایتی انداز بیان کے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی اس ترجمے کی خوبی ہے کہ اسی میں کسی بھی زبان کا مزاج و مذاق متاثر نہیں ہوا ہے۔ کسی بھی لفظ کے ترجمے سے انھوں نے انحراف نہیں کیا ہے۔ جس سے اس کلیہ کی تردید ہوتی ہے کہ اردو زبان عربی متن کے شانہ بشانہ چلنے سے قاصر ہے۔ اردو کا قافیہ کسی نازک موقع کی ترجمانی کے موقع پر بھی تنگ نہیں ہوا ہے۔ ترجمہ لفظ بہ لفظ ہے، مگر بامحاورہ، رواں اور سلیس ترجمہ ہے، جس سے مترجم کے دونوں زبانوں کے ذریعۂ اظہار اور دونوں کے مترادفات پر عبور کا پتہ چلتا

ہے۔ انھوں نے عربی اور اردو دونوں متون کو ترجمے کے پل سے گزار کر اتنا ہم آہنگ کر دیا ہے کہ اگر دوزبانوں کے لسانی تقابل کی سطح سے جائزہ لیا جائے تو ایک قسم کی حیرانی ہوتی ہے کہ عربی جیسی وسیع اور کثیر الالفاظ زبان کو کس طرح اردو کے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ موصوف نے اس ناول کی ترجمانی کا کام زمانہ طالب علمی میں ہی مکمل کر لیا تھا، مگر جب تدریس کے زمانے میں تجربات کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی تو وہ از سر نو ترجمہ ہو گیا۔ تاہم عربی ناول کے عنوان کے ترجمے میں اتنی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ تھی، اگر اس کا لفظی ترجمہ 'نیا قاہرہ' کرتے تو زیادہ بہتر، مطابق متن اور حسب حال ہوتا۔ اور اس ناول کی کہانی میں دوسری عالمی جنگ کے بعد، مصر کے جس پر آشوب اور جاں گسل عہد کی عکاسی کی گئی ہے، اس کی طرف بھی با معنی اشارہ ہو جاتا۔ اور یہ ترجمہ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے کا مصداق بن جاتا۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی (۱۹۲۴-۱۸۷۶ء) کے ناول ''ماجدولین'' کا ترجمہ (شہناز) بھی ادبی اور تخلیقی ترجمے کے ذیل میں آتا ہے، ترجمہ بہت با محاورہ اور روزمرہ کے قریب ہے۔ یہ کام عربی اردو کے اداشناس ادیب و مترجم حبیب اشعر دہلوی نے انجام دیا ہے، یہ ترجمہ، بہت عمدہ حرف بحرف اور قابل ستائش ہے۔ مترجم نے کردار کے ناموں میں جو تبدیلی کی ہے وہ اس زمانے کے مزاج کو پیش نظر رکھ کر گیا ہے، جب اردو میں صنف ناول کو خالص مشرقی لباس میں پیش کرنے کا رجحان عام تھا اور جب کسی اجنبی زبان کے تخلیقی شہ پارے کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا تو اس پر ہندستانیت کا رنگ چڑھانے کی روایت کی پاس داری کی جاتی تھی۔ موجودہ گلوبلائزیشن کے عہد میں، جب کہ سرحدوں کی دیواریں منہدم ہو چکی ہیں، کسی زبان کے متن میں آنے والے ناموں کو بدلنے کی حمایت نہیں کی جاتی۔ نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی کر کے اس کے زمان و مکان اور فضا کو کوئی مخصوص رنگ دینے کی کوشش کو سراہا جاتا ہے۔ آخر ایک زبان کے کردار اور ماحول و فضا کو دوسری زبان کے مطابق کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ ترجمے کا مقصد ایک زبان کے ادب کو دوسرے متنی اظہار کے توسط سے اس ادب کے قاری اور شائقین کے درمیان متعارف کرانا ہوتا ہے، تاکہ وہ اس سے ادبی اور لسانی سطح پر استفادہ کر سکیں اور اس کی مفید جہات سے خوشہ چینی کرتے ہوئے اپنی زبان کی خامیوں کی تلافی کر سکیں۔ مترجم نے جو اس ناول کے مسیحی کرداروں کو اسلامی کرداروں کا پیکر عطا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ موجودہ تنقیدی تناظر میں مناسب نہیں۔ اسی طرح مسیحی فضا پر اسلامی اور تخیلی فضا کا لبادہ اڑھانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اسی کوشش میں جرمنی کے موسیقار اعظم بیتھوون کی آخری زندگی کے حالات پر مشتمل پورے ایک باب کو ہی مترجم نے حذف کر دیا ہے۔ جس سے ہیرو کی موت کو پر اثر بنانے میں مدد لی گئی تھی۔

نام ور نثر نگار طہٰ حسین (۱۹۷۳-۱۸۸۹ء) کے ناول 'الوعد الحق' کا ترجمہ ''وعدۂ برحق'' بھی عمدہ اور رواں ترجمہ ہے۔مترجم اپنے دور کے عربی اردو کے اداشناس مولانا عبدالمجید حریری ہیں۔عربی الفاظ کا شکوہ اور اس کا اسلوب اردو میں بھی زندہ اور توانا ہے۔مترجم نے عربی محاوروں کا ٹھیٹھ اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے، جس میں اصل کی تخلیقیت بھی برقرار ہے۔تاہم انھوں نے کہیں کہیں عربی عبارت سے انحراف کیا ہے اور اس میں اپنے ذہن رسا کی گل کاری بھی کی ہے اور زیب داستاں کے لیے ترجمے میں اردو کے محاورات و ضرب الامثال اور فارسی اردو کے اشعار کا اضافہ بھی کیا ہے، یہ سارے اضافے اپنے سیاق وسباق کے حسب حال ہیں، مگر اس کا عربی متن کی لفظیات سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ صرف ترجمے میں اپنی اردودانی کا زور دکھانے کے مقصد سے کیا گیا ہے۔

خلیل جبران کے عربی ناول "الاجنحة المتكسرة" کے ترجمے ''ٹوٹے ہوئے پر'' میں بھی اصل عربی متن کے اسلوب اور الفاظ کی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔عربی کا زور اور اس کا اثر وتاثر اردو میں بھی منتقل ہو گیا ہے۔کیوں کہ مترجم کو عربی اردو کے مترادفات اور جملوں کی ساخت پر زبردست گرفت حاصل تھی۔یہ خلیل جبران خلیل کے ابتدائی دور کے مشہور المیہ ناول ''الاجنحة المتكسرة'' کا ترجمہ ہے۔مترجم حبیب اشعر دہلوی ہیں۔جنھیں عربی اردو ترجمہ نویسی پر بڑی مہارت حاصل تھی۔یہ ترجمہ بھی حبیب اشعر کے سابقہ ترجمے کے ہم پلہ ہے اور اس میں بھی الفاظ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے بڑا با محاورہ اور معنی خیز ترجمہ کیا گیا ہے۔ہر جملے اور اقتباس کا ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جس سے بہتر ترجمے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔عربی اور اردو دونوں متون میں معانی اور مفاہیم کی سطح پر بڑی یکسانیت اور مماثلت ملتی ہے۔عربی کی تشبیہات اور محاوروں کا ایسا سلیس اور رواں ترجمہ کیا گیا ہے جس کو ترجموں کے باب کا سرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔مگر ترجمہ کرتے ہوئے کہیں کہیں متن کے حدود اربعہ سے تجاوز بھی کیا ہے۔

عبدالقیوم فہمید نے عراقی حکم راں صدام حسین کے اخیر وقت کے ناول ''اخرج منها یا ملعون'' کا 'ملعون کا انجام' کے عنوان سے جو ترجمہ کیا ہے، وہ بہت ہی آزاد اور متن سے دور ہے۔عربی اردو متون کا تقابل کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ پیراگراف اور اقتباس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے مفہوم اور ماحصل کو اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے، جو اس نقطۂ نظر سے تو ٹھیک ہے کہ ناول کے ترجمے میں اردو کی تخلیقی اور ادبی شان

برقرار ہے، مگر عربی متن کی حرمت کے زاویہ سے دیکھا جائے تو اس میں بھی وہی سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا عربی متن کا اس کی لفظیات کی پابندی کرتے ہوئے بامحاورہ ترجمہ نہیں کیا جاسکتا؟۔ دوسرے مترجمین نے دشوار گزار عبارتوں کو بھی اردو کے پیمانے میں کامیابی کے ساتھ منتقل کیا ہے، جو دوسرے مترجمین کے لیے مشعل راہ ہیں۔ عبد القیوم فہمید نے اتنا آزاد ترجمہ کر کے ترجموں کے باب میں کوئی قابل تقلید مثال قائم نہیں کی ہے۔

پاکستانی مترجم محمد عمر میمن نے مصری ناول نگار علاء اسوانی کے دو ناولوں کا کامیاب ترجمہ کیا ہے اور وہ دونوں میں ہی عربی کی تعبیرات کو اردو کا جامہ عطا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ عربی ناول ''الــذی اقتــرب ورأی" (اوراق عصام عبد العاطی) کا ترجمہ ہر لحاظ سے عربی زبان و بیان اور عربی اسلوب سے مماثلت اور موافقت رکھتا ہے۔ عربی کے اثر و تاثر، اور اس کی طاقت و قوت کو پوری طرح اردو میں منتقل کرنے کی مترجم نے کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے کسی لفظ کے ترجمے سے خواہ وہ عربی متن میں زائد ہی کیوں نہ معلوم ہو، اعراض و انحراف نہیں کیا ہے، اس کو اردو متن میں نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے۔ بہت سے عربی اردو مترجمین جو عربی متون کا ترجمہ کرتے وقت یہ عذر لنگ پیش کرتے ہیں کہ عربی ایک وسیع اور مجمع الابحار زبان ہے جس کو اردو کے تنگنائے میں بند نہیں کیا جاسکتا، انھیں اس ناول کے ترجمے کا ایک بار ضرور مطالعہ کرنا چاہیے کہ مترجم نے کتنی ریاضت اور مشقت کے بعد اردو کی نارسائی کی شکایت دور کی ہے اور اس کو ایک قد آور زبان کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ عربی میں فی زمانہ بڑے پیمانے پر جو کلوکیل Colloquial بولی استعمال کی جاتی ہے، اس کا بھی صحیح اور کامیاب ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی عربی کی غیر فصیح عبارتوں کو بھی اردو میں بے کم و کاست منتقل کر دیا ہے۔ ترجمہ بہت بامحاورہ ہے اور اردو کی سلاست پر بھی حرف نہیں آیا ہے۔ علاء اسوانی کے ایک اور ناول "عـمارة يعقوبيان" کا ترجمہ بھی محمد عمر میمن نے ہی کیا ہے، اس میں بھی لفظ بہ لفظ بامحاورہ اور سلیس ترجمہ کیا گیا ہے اور یہاں بھی دونوں متون ترجمہ اور اصل میں زبان و اسلوب کی مشابہت کو بہت حد تک برقرار رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسا لفظ اور ترکیب نہیں جس کو صحیح اردو متبادل مفہوم کے جامہ میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ عربی اور اردو دونوں متون اپنے اثر و تاثر اور الفاظ و تراکیب اور محاورات و تعبیرات کے تبادلے کے حوالے سے ہم رشتہ نظر آتے ہیں۔ عربی متن میں جو جزئیات اور تفاصیل در آئی ہیں،

انھیں ایک ایک کر کے کتنی مہارت کے ساتھ اردو کا قالب عطا کیا گیا ہے۔

محمد اجمل کمال کا ترجمہ خیمہ (الخباء: میرال طحاوی) بہت حد تک عربی متن کے قریب ہیں، کیوں کہ انھوں نے صرف انگریزی متن پر اعتماد نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے اوریجنل متن عربی کو بھی سامنے رکھا ہے۔ جس کے سبب ان کے ترجموں میں تخلیقی اور ادبی شان پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ترجمہ زبان و اسلوب کے لحاظ سے عربی متن سے مماثلت اور مواصلت رکھتا ہے۔ لفظوں اور مخصوص ترکیبوں کو اردو کا لباس عطا کرنے میں کسی تاویل یا توجیہ سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ عربی کی وسعت دامانی کو اردو کی تنگ دامانی میں انتہائی آسانی کے ساتھ منتقل کر دیا گیا ہے۔ طرز و اسلوب میں کہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، یا عربی کا زور اور اس کا شکوہ کہیں مدھم نہیں پڑتا۔ لیکن انھوں نے بھی بعض مخصوص الفاظ کے ترجمے میں فحش غلطی کی ہے۔ طوالت کے خوف سے مثالیں نہیں دی گئی ہیں۔

جن ترجمہ شدہ ناولوں کا ہم نے تقابلی مطالعہ کیا ہے، اس میں معدودے چند مترجمین ہی ترجمے کے لوازم سے انصاف کر سکے ہیں۔ اکثر مترجمین ناول کی تخلیقیت کو اردو میں منتقل کرنے میں ناکام رہے ہیں، انھوں نے عربی کہانی کی تفہیم کو اپنی منزل کا نشان تصور کر لیا ہے۔ ان کے ترجموں کو تلخیص اور خلاصہ کا نام دینا زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ عربی کے مقابلے میں اردو ایک جوئے کم آب ہے، مگر ایک ماہر اور زیرک ترجمہ نگار ایک ترقی یافتہ زبان سے استفادہ کر کے دوسری زبان کے خلا کو پر کر سکتا ہے۔ ان تمام ترجموں کے تقابلی مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر مترجمین نے صرف نفس کہانی کی تفہیم و ترسیل اور ناول کے مرکزی خیال کو ہی اپنی آخری منزل باور کر لیا ہے۔ ان کے ترجموں کو 'ترجمہ' کا نام دینے کے بجائے کہانی کا لب لباب اور خلاصہ کہنا زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ لیکن پاکستانی ترجمہ نگار کی اکثریت نے عربی ناولوں کا ایسا بامحاورہ، رواں اور روزمرہ کے قریب ترجمہ کیا ہے، جس میں عربی الفاظ و تراکیب کی پابندی کے ساتھ، اس کے اسلوب کی مشابہت اور اس کا اثر و تاثر بھی برقرار ہے۔ اور وہ اردو کے مزاج و مذاق سے بھی بہت حد تک ہم آہنگ ہے۔ پاکستانی مترجم و قلم کار محمد عمر میمن اور اجمل کمال کے تراجم واقعی قابل تعریف ہیں، جن میں عربی متن سے مکالمہ اور مخاطبہ کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اور ترجمے کے سلسلے میں ماہرین کے نزدیک جتنے اصول و نظریات مروج و مستعمل ہیں، ان پر کاربند رہے ہیں۔ فیضان بیگ کا ترجمہ آئین نو

ISSN No. : 2395-2016

ایسا ترجمہ ہے، جس کو کم از کم ہندستان کی حد تک، عربی اردو تخلیقی ترجموں کے باب کا سرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن نجیب محفوظ کے دوسرے ناول ' السکریہ' کے ترجمے میں عربی متن کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، صرف انگریزی متن کو سامنے رکھ کر ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جس سے عربی متن کا وقار و اعتبار مجروح ہوتا ہے۔ حبیب اشعر دہلوی اور مولانا عبدالمجید حریری کا ترجمہ بھی متن سے بہت قریب اور عربی انداز تحریر اور اس کی محاوراتی زبان سے مطابقت رکھتا ہے، اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ نہ صرف عربی زبان کے ماہر اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی آشنا تھے، بلکہ اردو کا بھی ادیبانہ ذوق رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے متبادل اظہار اور طرز تعبیر سے بخوبی واقف تھے۔

لیکن ان تمام ترجموں کا ایک بڑا اور قابل ذکر فائدہ یہ ہے اس کے ذریعے عربی ادب کے عصری منظرنامے، غالب ادبی رجحان اور شعر و ادب کی دنیا میں وہاں پرورش پانے والی فکر و ثقافت سے واقفیت اور آگہی کا دروازہ کھلتا ہے۔ ان ترجموں کی مدد سے اردو معاشرے کو ان تخلیقی اقدار و روایات کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے، جو عرب معاشرے کا جز ہیں۔ عربی ناولوں کے ان ترجموں کو پڑھ کر اردو زبان کے خلا کو پر کرنے اور اس کے قابل تقلید پہلو کو اپنی زبان کی نثری اور شعری تخلیقات میں برتنے میں بھی خاصی مدد ملتی ہے۔ عرب اور برصغیر کے ماحول اور فضا میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں مشرقی اقدار و روایات کے پاس دار ہیں اور ایک ملک کا ادبی رجحان دوسرے ملک کے ادبی رجحان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان ترجموں کے ذریعہ ہمیں عربی ادب کے دریچوں میں جھانکنے کا زریں موقع میسر آتا ہے اور اس کی صاف ستھری ہوا سے اردو زبان کے جسم و جاں میں تازگی اور توانائی آتی ہے۔ اگر ترجموں کو نفس کہانی کی ترسیل تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اس کو تخلیقی روپ دے دیا جائے، تو اس سے نہ صرف زبان و بیان کا ایک نیا سانچہ دوسری زبان کے ہاتھ آتا ہے، بلکہ وہ ترجمہ تخلیقی اوصاف کا بھی حامل ہو جاتا ہے اور اس سے زبان و ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔

ہندستان میں عربی اردو ترجمے کا کام ابھی بہت سست رفتار ہے۔ عربی زبان سے تراجم کے معاملے میں سرد مہری کی فضا قائم ہے۔ ہندستان کے بالمقابل دوسرے ممالک میں عربی داں حضرات عربی سے اردو ترجمے کے شعبے میں کافی سرگرم اور متحرک ہیں۔ پڑوسی ملک پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں نے عربی تخلیقی

اصناف کو بڑے پیمانے پر اردو کا قالب عطا کیا ہے۔ اکیسویں صدی کی ترقیات نے دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے، انھیں سمجھنے اور ان سے علمی، ادبی اور تہذیبی اور تجارتی استفادے کی راہیں تیزی سے کھلی ہیں۔ ذرائع نقل وحمل کی سہولتوں اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے سرحدوں کی دوری پاٹ دی ہے۔ ایسی صورت میں ترجمے کی اہمیت الم نشرح ہے۔ قصے کہانیاں صرف وقت گزاری کا ذریعہ نہیں، بلکہ ان کے ذریعے ایک قوم دوسری قوم سے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب سے آشنا ہوتی ہے۔ ان کے دکھ درد، ان کے عام مسائل، ان کی روزمرہ کی ضروریات اور ان کے طرز بود و باش کا علم ہوتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اردو کے قلم کاروں نے روسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے ادبی ذخیرے کو اردو میں منتقل کرنے میں بڑی تن دہی اور جاں فشانی کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن ۲۱ رممالک کی پہلی اور پانچ ممالک کی دوسری سرکاری زبان عربی کے ترجمے کے تعلق سے، انھوں نے لاپرواہی برتی ہے۔ عربی ادب کے ترجموں کے حوالے سے ان پر جمود طاری رہا ہے۔ بعض اردو داں ادیبوں کے لیے عربی زبان سے ناواقفیت قابل قبول عذر ہوسکتا ہے، لیکن جو حضرات اردو کے ساتھ عربی کی نہ صرف شد بد، بلکہ اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے بھی اس سمت میں کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی، یہ بڑا حیرت انگیز سوال ہے۔ نئی نسل میں دنیا کے سارے علوم وفنون اور جدید ترقی یافتہ زبانوں سے واقفیت کی دیوانگی کی حد تک لگن پیدا ہوئی ہے، عربی زبان کی کشش نے نئی نسل کا دامن دل اپنی طرف کھینچا ہے۔ عربی زبان سے واقفیت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی مادری زبان اردو میں اس کے ادبی شہ پاروں کو منتقل کرنے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں عربی اردو ترجمہ نگاری پر جو پیش رفت ہوئی ہے، وہ بڑی قابل قدر ہے۔ کئی مشہور عربی ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کو اردو کا قالب عطا کیا گیا ہے، جو ہمیں ذولسانی تقابلی مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ ☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

غلام نبی کمار، جموں وکشمیر

''فصیلِ شہر سے'' کے ورقِ گمشدہ کا شاعر: پرویز مانوس

نام:۔غلام نبی، قلمی نام:۔غلام نبی کمار، پیدائش: 14 / مارچ 1987 مستقل رہائش:۔کمار محلہ چرار شریف، ضلع بڈگام، جموں وکشمیر، تعلیمی قابلیت: ایم اے (اردو)، بی ایڈ، ایم ایڈ، ایم۔فل، یو جی سی نیٹ، جے آر ایف، ISLET ایم فل (اردو): یونیورسٹی آف دہلی، موضوع: دہلی یونیورسٹی سینٹرل لائبریری میں موجود رسائل و جرائد کا وضاحتی اشاریہ، نگراں: پروفیسر ارتضیٰ کریم، پی ایچ ڈی (اردو، جاری):۔یونیورسٹی آف دہلی، موضوع: زبیر رضوی کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ، نگراں: ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، زیر طبع کتابیں: (1) اردو کی عصری صدائیں (تحقیق و تنقید) (2) قدیم وجدید ادبیات (تحقیق وتنقید) (3) کلیات زبیر رضوی

اعزازات: (۱) مولانا الطاف حسین حالی ایوارڈ، مالیر کوٹلہ پنجاب (2) مظہر امام ایوارڈ، دربھنگہ بہار (3) تعمیل ارشاد ادبی ایوارڈ، کشمیر

مصروفیات: مدیر:۔کتابی سلسلہ ''پنج آب'' مالیر کوٹلہ، پنجاب، معاون مدیر: سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' اور سہ ماہی ''تحقیق''، دربھنگہ، ایڈوائزری بورڈ ممبر ماہنامہ 'سبق اردو' الہ آباد

وابستگی: صدر شیخ العالم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، سرینگر، جنرل سکریٹری: مرکز عالمی اردو مجلس، دہلی

پتہ: کمار محلہ، چرار شریف، بڈگام۔191112 (کشمیر)

فون نمبر: 7053562468 ای میل: kumarnabi.gnk@gmail.com

خطۂ کشمیر کے مایہ ناز شاعروں میں ایک اہم نام پرویز مانوس کا ہے۔ جو گزشتہ کئی برسوں سے جنتِ کشمیر کی ادبی وتخلیقی زمین کو زرخیز کرنے میں محوِ عمل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جموں وکشمیر کا ہر خطہ اور ہر ایک علاقہ دیکھا، ان تمام خطوں اور علاقوں کا تہذیب وتمدن اور رہن سہن دیکھا، یہاں کے لوگوں کا مزاج اور کردار دیکھا نیز ان کی زبان کو سمجھا۔ پرویز مانوس ایک حسّاس اور دردمند فن کار ہیں۔ اسی حسّاسیت اور دردمندی نے انہیں یہاں کے لوگوں کے حال واحوال، جذبات ومحسوسات، افکار وخیالات اور دکھ درد سے آشنا ہونے کا موقع فراہم کیا۔ پرویز مانوس کی سوچ اور ان کا ذہن کشمیر کی مظلوم قوم کے مزاج اور کردار و افعال سے مانوس اور میل کھاتا نظر آتا ہے، شاید اسی وجہ سے انھوں نے اپنا تخلص مانوس اختیار کیا ہو۔ پرویز مانوس ایک پیدائشی تخلیق کار ہیں۔ اس لیے ان میں تخلیقی صلاحیت فطری طور پر موجود ہے۔ وہ فطرت د

قدرت اور عصری تقاضوں کے مطابق شاعری کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ان کے شعوری وجدان پر عصری حالات غالب ہو جاتے ہیں جنہیں وہ اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں اور شعری قالب میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ وہ غیر فطری اور غیر شعوری طور پر شاعری کرنے والوں کی فہرست میں شمار نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی تک بندی موصوف کی فطرت میں ہے۔ چنانچہ پرویز مانوس کی شاعری میں وہ درد، وہ جذبہ اور وہ احساس سمٹ آیا ہے جو اسے قاری کے قریب تر کر دیتا ہے۔ دراصل یہی چیز کامیاب شاعر کی ضمانت دیتی ہے۔ پرویز مانوس راست بیانیہ کے شاعر ہیں۔ وہ بے بیکانہ لہجے میں شعر کہتے ہیں جس میں سچے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔

پرویز مانوس ہمہ جہت و ہمہ رنگ شاعر ہیں۔ وہ بیک وقت کئی اصناف پر دسترس رکھتے ہیں۔ کشمیر کے اردو شعرا میں وہ ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ترجمہ نگاری میں بھی موصوف کمال کا عبور رکھتے ہیں۔ پرویز مانوس نے ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ میدانِ ادب اطفال کے بھی ماہر ہیں۔ جس میں ان کی بچوں پر نظموں اور کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اگر پرویز مانوس کی لسانی جہت کے تعلق سے گفتگو کی جائے تو وہ اس معاملے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ اردو، انگریزی، پہاڑی، کشمیری اور پنجابی زبانیں جانتے ہیں اور ان میں خامہ فرسائی بھی کرتے ہیں۔ پرویز مانوس کے اب تک چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جس میں ''بیتے لمحوں کی سوغات''، ''موسم اڑان کا''، ''چاند، لمس، گلاب'' اور زیر نظر مجموعہ ''فصیلِ شہر سے'' قابل ذکر ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی شعری تصانیف میں ''چندا ماما دُور کے'' اہم ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں پرویز مانوس کے کئی افسانوی مجموعے اور اردو میں ہی کئی زبانوں کے تراجم پر مبنی کتابیں بھی شامل ہیں جو اس کثیر الجہت شخصیت کی ادبی خدمات کی غماز ہیں۔

پرویز مانوس ایک زود گو شاعر ہیں اور زود گوئی میں کشمیر کے موجودہ اردو شاعروں میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اردو کے شعری میدان میں ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں ہے جو اپنی دنیاوی مصروفیت یا کاہلی کے سبب بہت کم لکھ پاتے ہیں اس لیے وہ عمر بھر نہایت قلیل شعری سرمایے کو لے کر جیتے ہیں اور اسی کو سند کا درجہ دلانے میں ہمیشہ تگ و دو میں رہتے ہیں۔ ایسے شاعر خداداد صلاحیت کے مالک، غور و فکر اور تدبر کے حامل نیز دن رات محنت و ریاضت میں صرف کرنے والے زود گو شعرا کی شاعری پر انگلی اُٹھاتے ہیں کیونکہ وہ ان سے آگے نکلنے کی دوڑ میں ہوتے ہیں۔ اس خیال اور وہم میں جینے والے شاعر کبھی کامیاب کی

ISSN No. : 2395-2016

سیڑھی نہیں چڑھتے سکتے۔جموں وکشمیر کے کثیر اللسانی، کثیر التصانیف اور متنوع جہت کے بزرگ اور نوجوان اردو شعرامیں پرویز مانوس بھی شمار ہوتے ہیں۔جو یہاں کے ادبی حلقے میں بے حد مقبول بھی ہیں۔پرویز مانوس تواتر کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ان کا لہجہ معتدلانہ اور متوازن انداز کا ہے جس میں وہ یکساں انداز تخاطب کو برتتے ہیں۔پرویز مانوس ایک منفرد لب ولہجے کے شاعر ہیں وہ عصری حالات وواقعات کو بیشتر اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

پرویز مانوس ''فصیلِ شہر سے'' کے ورقِ گمشدہ کا شاعر ہے۔کیونکہ وہ ''فصیلِ شہر سے'' صدا دیتے ہیں جہاں کے مظلوم اور بے بس لوگ دردوکرب کی زندگی گزارتے ہیں۔جن کے سروں پر آئے دن مصیبتوں کے پہاڑ اور خطرات کے کالے بادل منڈھلاتے رہتے ہیں۔اس معنوں میں پرویز مانوس کی شاعری یہاں کی مصیبت زدہ عوام کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے جو ان کے حقوق اور ان کے ساتھ ہورہے استحصال کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔''فصیلِ شہر سے'' کا شاعر بہت جرأت مندانہ طریقے سے حق کی آواز بلند کرتا ہے۔راقم الحروف انہیں اس لیے ورقِ گمشدہ کا شاعر قرار دیتا ہے کیونکہ وہ کشمیر کے حسین و قدرتی مناظر کی تعریفات سے ہٹ کر ایک اہم عصری موضوع کو اُبھارتا ہے۔جس کے پیچھے یقیناً ایک جرأت منداور نڈر انسان کی شخصیت پنہاں ہے۔پرویز مانوس سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اقدار کی گراوٹ سے متعلق بیباکی اور ہنرمندی سے لکھتے ہیں۔ظاہر ہے اس کے پسِ پشت بھی ایک تخلیق کار کی تخلیقی فن کاری ہی کام آتی ہے۔جس میں اسے مختلف فنّی امور کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔وہ اپنی شاعری کو استعاروں، علامتوں اور تشبیہوں کے ذریعے بھی قاری تک پہنچاتے ہیں لیکن موجودہ عہد کا ہر انسان چونکہ ان مسائل سے خود بھی جوجھ رہا ہے اس لیے شاعری میں اشاروں کنایوں کے ذریعے کی گئی باتیں بھی اس کے دل ودماغ پر بھار معلوم نہیں ہوتیں۔اس طرح شاعری کے صحیح مفہوم کی ترسیل قاری تک بہ آسانی ہوجاتی ہے۔''فصیلِ شہر سے'' پرویز مانوس کا غزلوں پرمبنی مجموعہ ہے۔جس کی تمام غزلیں قاری کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہیں۔مانوس کی شاعری سے چند شعر قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ان اشعار سے ان کے شعری اختصاص اور موضوع سے بخوبی آگہی حاصل ہوتی ہے ملاحظہ فرمائیں

کچھ صدائیں اُٹھتی ہیں اکثر، فصیلِ شہر سے
دیکھتے ہیں روز اجڑے گھر فصیلِ شہر سے
ہوگئی ہے سُرخ ہر چھت بستیوں کی آج پھر
کس نے پھینکا ہے موت کا خنجر فصیلِ شہر سے

امیر شہر کرنے آگیا زخموں کا سودا
میں اپنے جسم کو کشمیر کرنے جا رہا ہوں

پرویز مانوسؔ کی شاعری میں درج بالا قسم کے متعدد اشعار ہیں جو ان کی فکری، فنی اور موضوعی رنگ و آہنگ کا پتہ دیتے ہیں۔ اس طرح کے یا ان جیسے دیگر اشعار کی روشنی میں یہ کہنا قطعی غلط نہیں ہوگا کہ مانوسؔ کی شاعری میں حقیقی معنوں میں کشمیریت رچی بسی ہے۔ ان کی شاعری کشمیری قوم کی کرب انگیزی کو بیان کرتی ہے۔ پچھلی ساٹھ ستر دہائیوں سے کشمیری عوام کو جس اذیت ناک زندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ سب مانوسؔ کی شاعری میں جلوہ گر ہوا ہے۔ مانوسؔ کی شاعری میں براہِ راست کشمیری حالات منعکس ہوئے ہیں۔ ان کا شاعرانہ روّیہ انہیں اپنے معاصر شعرا سے الگ کرتا ہے اور جس احساس اور جذبہ و خیال کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے، شاید ہی آج تک اس نوعیت کے جذبات کا اظہار ریاست یا ریاست سے باہر کسی شاعر کے یہاں کشمیر کے تعلق سے بیان ہوئے ہوں۔ اس وصفِ شاعری کی بدولت بھی وہ اپنے ہم عصر شعرا سے سبقت لے جاتے ہیں۔ مانوسؔ نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے وہ انہیں بھیانک حالات کا چہرہ دیکھتے آئے ہیں۔ انھوں نے لوگوں کو جس طرح درد سہتے اور زخم جھیلتے دیکھا ہے اسی کی ہو بہو، مکمل اور بھرپور تصویر اپنی شاعری کے ذریعے ابھاری ہے۔ یہ مانوسؔ کی زندگی کا عبوری دور کہلاتا ہے، جس کی جھلک عصرِ حاضر میں بھی مسلسل دیکھنے کو مل رہی ہے اور یہ زمانہ واقعی میں مانوسؔ کی زندگی میں ناقابل برداشت تھا۔ ان بھیانک یادوں اور لرزہ خیز واقعات کے چونکہ مانوسؔ خود بھی مشاہدہ کار ہیں اس لیے ان کے ذہن و دل پر ان بھیانک اور خوف ناک حادثوں کی جو تصویریں ثبت ہوئی ہیں، اُن کا عکس مانوسؔ کی شاعری میں بخوبی نظر آجاتا ہے۔ اردو میں بعض شعرائے کرام نے عشقیہ شاعری کی ہے اور بعض نے دورد وغم کی شاعری کی، بعض شعرا نے اپنی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز کو رقم کیا اور بعض کی شاعری محض احساس اور خیال تک محدود رہی۔ اسی طرح بعض شعرا کے یہاں حقیقی اور مجازی دونوں رنگ ملتے ہیں۔ پرویز مانوسؔ کا وصف یہ ہے کہ ان کا خیال معاشرے سے پنپتا ہے اور جس معاشرے میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ زخم خوردہ ہیں اور اذیت بھری زندگی سے دوچار ہے۔ اس لیے ان کے یہاں احساس اور جذبہ درد سے معمور نظر آتا ہے۔ جس کو وہ شعری سانچے میں ڈھال کر اجاگر کرتے ہیں۔ مانوسؔ کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

وہ میرے نام اشکوں کے سمندر بھیج دیتا ہے
گلابوں میں چُھپا کر درد اکثر بھیج دیتا ہے

ISSN No. : 2395-2016

جو قطرے کے لیے ترسا رہا تھا عمر بھر ہم کو
وہی اب قبر پرزم زم کی گاگر بھیج دیتا ہے
نہیں مانوسؔ انداز ہمارے عزم کا اس کو
سجا کے وردیوں میں جو ہمیں ڈر بھیج دیتا ہے

اس غزل کے باقی اشعار بھی معنی آفرینی سے پُر ہیں۔اس غزل میں کچھ شعر ایسے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر کے کسی ایسے شخص کے ساتھ مراسم ہیں جس کے وہ بہت قریب ہے، جو اس کا آشنا بھی ہے اور اس کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کرتا ہے۔جو ایک طرف اپنے آپ کو امن و پیام کا پیمبر ظاہر کرتا ہے تو وہیں دوسری طرف وہ ترقی و کامرانی اور شادمانی کا پیکر معلوم ہوتا ہے۔لیکن حقیقت یا اصلیت زیادہ دیر تک پردے میں نہیں رہتی۔ایک دن اس کا فاش ہو ہی جاتا ہے کہ شاعر کی سلامتی اور ترقی کا خواہاں شخص دراصل اس کے پیٹھ پیچھے اس کی تباہی و بربادی کی منصوبہ بندی کر رہا ہوتا ہے۔درحقیقت یہاں شاعر کسی انفرادی شخص کی اچھی بری شخصیت کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ علامت کے درپردہ آج کی انسانی فطرت کو طنز کا نشانہ بنا رہا ہے۔جو دورِ حاضر کی انسانی فطرت کا شیوہ بن گیا ہے۔ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں اہمیت اور قدر نہ جان اس کو مختلف قسم کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچاتا رہتا ہے۔جبکہ دنیا میں اذیتیں پہنچا کر اس کی موت کے بعد وہ اپنے گناہوں کا مداوا اور توبہ کرنا چاہتا ہے۔اس کے برعکس اگر جیتے جی وہ اس حقیقت کو سمجھ پاتا تو وہ خوشی اور چین وسکون کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔آخر الذکر شعر جو اس غزل کا مقطع بھی ہے، میں شاعر نے وردیوں کے لفظ کو علامت کے طور پر بے حد خوبصورت انداز میں برتا ہے۔کشمیر میں وردیوں سے متعلق مفہوم کو سمجھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔مانوسؔ کی قوتِ فکر تخیل کی بلندی کو چھوتی ہے۔انھوں نے شاعری میں استعاروں اور علامتوں کی خوب دنیا آباد کی ہے۔ان بعض خصائص کی بنیاد پر وہ شاعری کو حسن اور چاشنی کی آمیزش سے خوبصورت استعارہ بنا دیتے ہیں۔پرویز مانوسؔ "فصیلِ شہر سے" کے تعلق سے اپنے اشعار میں قارئین سے یوں مخاطب ہیں:

یہ بستی خونچکاں ہونے لگی گر روز یونہی
ہنسیں گے بیٹھ کر آدم کی لاشوں پر' پرندے
رونق بھرا جو شہر تھا ویران ہے کل سے
نرغے میں درندوں کے یہ زنداں ہے کل سے

کس کے خوں میں گہری ہے سرخی کس کا لہو ہے پانی سا
شہر کا شہر ہے ڈوبا جس میں ایسا مقتل دیکھ لیا
لہو سے ہر گلی رنگین ہے گلپوش وادی کی
اسے اب دیکھنے والے نگر کہنے سے ڈرتے ہیں

پرویز مانوسؔ کی شاعری کو احتجاجی شاعری کا نام دیں یا اسے مزاحمتی شاعری سے تعبیر کریں، بات ایک ہی ہے کہ مانوسؔ ایک حقیقت پسند غزل گو شاعر ہیں۔ جو سچائی کو ابھارتے ہیں اور بڑی جرأت مندی سے اس کو مشتہر کرتے ہیں۔ مانوسؔ حالات کا بغور اور فکر مندی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ موصوف شاعر نے وادی کے خون چکاں اور خوں بہا حالات کی مؤثر انداز میں عکاسی کی ہے۔ مانوسؔ کی شاعری وادی کی ابتری اور بدحالی کی بہترین مثال ہے۔ وہ قلم کو جنبش دیتے وقت زیادہ سوچتے نہیں اور ایمانداری کے ساتھ سامنے کے حالات کو رقم کردیتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی میں خارجی اور باطنی کیفیات دونوں درآئی ہیں۔ اس وجہ سے بھی ان کا قلم توانا ہوگیا ہے۔ مانوسؔ کا ایک ایک شعر درد والم اور آہ بکا کی نم ناک داستان بیان کرتا ہے۔ وہ روز کی قتل و غارت گری اور ظلم و جبر دل سے برداشتہ ہوگئے ہیں۔ بے گناہ لوگوں کے قتلِ عام، شہروں کی ویرانی، انسانی جان و مال کے سوداگروں، سیاسی مکاروں، انسان کے روپ میں بہروپیوں، امیر شہر کی بے حسی اور تنگ دلی، بے شمار خاندانوں کے بجھتے چراغوں وغیرہ کو دیکھ کر شاعر کا دل اُکتا گیا ہے۔ مذکورہ بالا کے علاوہ مانوس کی درجنوں غزلیں وادی کے دہشت خیز حالات کی عکاس ہیں۔ مانوسؔ کی نظر صرف وادی تک ہی محدود نہیں ہے وہ دوراندیش شاعر ہیں۔ اس لیے وہ بین الاقوامی سطح کے حالات کو بھی وہ وقتاً فوقتاً زیر قلم لاتے رہتے ہیں۔ گجرات کے سانحہ تک کو انھوں نے اپنے شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جو تاریخ کے سیاہ ترین صفحات کا حصہ بن گیا ہے۔ اس طرح کے کئی سیاہ صفحات کو مانوس نے پلٹا ہے اور قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ مانوسؔ کا انفرادی رنگ ہے اسی انفرادیت نے انہیں ورقِ گمشدہ کا شاعر بنادیا۔ چنانچہ وہ ان جیسے کئی اوراق کو پلٹنے کی بیباکانہ سعی کرتے ہیں۔ مانوسؔ کی شاعری انسان کی عیاری اور مکاری سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے یوں اس احساس کا اظہار کرتے ہیں:

رُسوا تجھے جو کرتا ہے مانوس
لانا نہ اس کا نام بھی اپنی زبان پر
نہ میں غربت سے ڈرتا ہوں نہ لاچاری سے ڈرتا ہوں
فقط اس دور کے آدم کی عیاری سے ڈرتا ہوں

ISSN No. : 2395-2016

عمر بھر کرتا رہا غصب جو حق لوگوں کا
وہ بھلا کیا کسی مفلس کو نوالے دے گا

پرویز مانوس نے دنیا اور یہاں کے لوگوں کو بہت خوبی سے پرکھا ہے۔انھوں نے لوگوں کے حرکات و سکنات،ان کی سوچ وفکر اور افعال و کردار کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔وہ سب پر بے جا الزام عائد نہیں کرتے لیکن ان کی نظر میں ایسے مکار،جعلساز اور فریبی لوگوں کی دنیا میں کمی بھی نہیں ہے جو ہمیشہ سے سیدھے سادے لوگوں کو اپنی حرص و ہوس کا نشانہ بناتے آئے ہیں۔اس سماج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو معصوم اور بھلے لوگوں کو رسوا کرتے ہیں اور ان کا حق چھینتے رہتے ہیں۔یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو زندگی بھر لوگوں کو جھانسہ دے دے کر اپنا کام نکالتے رہتے ہیں۔دراصل مکاری اور فریب کاری کو ان جھانسے باز لوگوں نے اپنی زندگی کا شیوہ بنایا ہوتا ہے۔مانوسؔ کا ان سب لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔اسی لیے وہ بے حد دیانت داری سے ان سب کو اپنی غزل کا موضوع بناتے ہیں۔مانوس نے انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔جس میں غربت و افلاس بھی ایک اہم موضوع ہے۔موصوف شاعر نے غریبوں اور مفلسوں کی درد انگیز ترجمانی کی ہے۔چند شعر دیکھئے:

مفلسوں کے گھر میں خوشیوں کا عجب انداز تھا
عید کے دن ان کی آنکھوں کو ہی نم دیکھا گیا
مُفلسی اس کو بہا کر لے گئی لہروں کے ساتھ
پھر بھی وہ ہمت سے دریا پار کرنا چاہتا ہے
گر جاتے ہیں زرداروں کے جو خوانِ کرم سے
مُفلس کے یہاں اتنے بھی دانے نہیں ہوتے

درج بالا اشعار سے مانوس کی تخلیقی حسیّت،ذہنی اپج اور شعوری پختگی و دانستگی ظاہر ہوتی ہے۔انھوں نے شاعری کو محض ایک موضوع تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وہ اسے جاویدانی بخشنے میں لگے ہوئے ہیں۔شاعری کو جاویدانی تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب اس میں سماج کے ہر طبقۂ فکر کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔یہ عنصر مانوس کی غزلوں میں ہمیں صاف نظر آ سکتا ہے۔ہمارے یہاں ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جو اپنے آپ کو قد آور شاعر گردانتے ہیں علاوہ ازیں ایسے شاعروں کی بھی ہمارے یہاں کثرت ہے جن کے اشعار قارئین کے ذہنوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔بالاتر اس معاملے میں کہ ان کے اشعار کا مفہوم سمجھنے سے قاری معذور ہوتا ہے۔کیونکہ ان کے اشعار صحیح خیال کی تفہیم سے قاصر ہوتے ہیں۔جبکہ ان کے خیال

ISSN No. : 2395-2016

میں ''قاری کو تذبذب میں ڈالنے کا یہ خیال بھی اچھا ہے''۔ جب عام قاری جستجو کے بعد بھی ان کے اشعار کی تفہیم کرتے کرتے کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا تو وہ ایسی شاعری کو الہامی شاعری قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے کم تر شاعر کو برتر شاعر بنا دیا جاتا ہے۔ پرویز مانوس نے سماج کے سب سے عام طبقے کو بھی اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے مفلس و نادار، مزدور و لاچار اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے دکھ درد تک کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ مانوس کی غزلیں سچائی کا آئینہ ہیں جو ہمیں صحیح معاشرے کی تصویر دکھاتی ہیں۔ مانوس بزرگوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ان کے قد، دعاؤں اور گھر میں ان کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں۔ شاعر کی نظر میں بزرگوں کا اونچا مقام ہے۔ مانوس ایک گھر میں بزرگوں کی موجودگی کو باعث رحمت و فضیلت تصور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض شعر دیکھئے:

جس گھر میں بزرگوں کے ٹھکانے نہیں ہوتے
اُس گھر میں تو رحمت کے خزانے نہیں ہوتے
شہرت نہ قدم چُومتی ہرگز میرے یارو
ماں باپ کے فرمان جو مانے نہیں ہوتے

پرویز مانوس ایک دیدہ ور اور جہاں دیدہ شاعر ہیں۔ وہ ایک گھر میں بزرگوں کی غیر موجودگی کے تعلق سے بڑی صاف گوئی سے لکھتے ہیں کہ وہ گھر رحمت کے خزانے سے محروم ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ اسی گھر کو اپنی رحمتوں اور فضیلتوں سے محروم رکھتا ہے جو گھر بزرگوں سے خالی ہو اور جس میں بزرگوں کی توہین کی جاتی ہو۔ مانوس بھی یہی کہتے ہیں اور واجب لفظوں میں حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی بھی شخص کی کامیابی کا راز اس کے والدین کی رضامندی اور فرمانبرداری میں مضمر ہے۔ مطلب دھندلا کا نہیں بلکہ صاف ہے کہ کامیابی اور شہرت اسی کے قدم چومتی ہے جو اپنے والدین کے رتبے اور مرتبے کو سمجھتا نیز ان کا خدمت گزار بھی ہو۔ مانوس نے ایک عورت، ایک ماں، ایک بیٹی، ایک بہن کے جذبات، دردمندی اور شائستگی کو نہایت سلیقہ شعاری سے بیان کیا ہے۔ مانوس کے یہ شعر اس کی عمدہ مثال ہے:

باپ کے مرنے پہ بیٹے خوش ہوئے اس دور میں
ڈوب کر غم میں مگر کچھ بیٹیاں رونے لگیں
پھر سے اک ناداں ماں نے آج روٹی کے عوض
بھوکے بچوں کو تصور میں کھلائی چاندنی

پرویز مانوس نے جہاں امیر شہر کی ہستی کی عیش پرستی اور امیر گھرانوں کی خوش حال زندگی کا ذکر کیا ہے وہیں

ISSN No. : 2395-2016

موصوف نے نچلے طبقے کے جھونپڑی میں زندگی گزر بسر کرنے والے کی بے بسی کا بھی احاطہ کیا ہے۔انھوں نے جہاں امیر شہر کے بچوں کی عیش وطرب سے سرشار زندگی کی جھلک دکھائی وہیں ایک غریب اور دُکھیاری ماں کی ناچاری اور مجبوری کا پہلو بھی اجاگر کیا ہے۔ مانوسؔ نے یہ بھی دکھایا ہے کہ بیٹیاں بیٹوں کی بہ نسبت کس حد تک اور کس قدر اپنے والدین سے محبت وقربت رکھتی ہیں۔آج کے معاشرے میں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اونچے طبقوں اور معاشی طور پر خوش حال لوگ ناک اونچی کر کے چلتے ہیں۔ایسے خاندانوں میں بچیوں یا بیٹیوں کی پرورش اور تربیت کیسے اور کس ماحول میں کی جاتی ہے وہ کسی سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔اس کے برعکس غریب گھرانوں کی بیٹیوں پر سیدھے سادے چال وچلن کے باوجود تہمتیں لگائی جاتی ہے اوران کی کردارکشی جاتی ہے۔چھپر میں رہنے والے والدین اپنی کنواری بیٹیوں کے عصمتوں کی حفاظت اوران کے تئیں کتنے فکرمند رہتے ہیں۔مانوسؔ کے مذکورہ بالا ایک شعر سے اس کی خوب منظرکشی ہوتی ہے۔مانوسؔ نے بچوں کے حوالے سے درجنوں شعر کہے ہیں۔جو بچوں سے ان کی دلچسپی، احساسات اور دردوتکلیف میں مبتلا زندگی کا حوالہ ہیں۔کچھ شعر قارئین کی بصارتوں کی نذر:

فسادی تاک میں سب ہیں لگائے کان میں آہٹ پر
میں ایسی رات میں بچے کی کلکاری سے ڈرتا ہوں

جس گھر میں کبھی کھیلتے تھے چاند سے بچے
اُس گھر کا بھرا صحن بھی سُنسان ہے کل سے

غنیم وقت نے جب سے بصارت چھین لی ان کی
یہ بچے تو قمر کو بھی قمر کہنے سے ڈرتے ہیں

مانوسؔ نے متذکرہ بالا اشعار وادی کے پس منظر میں کہے ہیں۔جو بالکل وادی کے بچوں کے جذبہ واحساس کو ہی نمایاں کرتے ہیں۔پرویز مانوسؔ نے عشقیہ اور رومانی شاعری بھی کی ہے اوراس میں بھی موصوف کی فنی اور تخلیقی ہنرمندی ظاہر ہوتی ہے۔مانوسؔ نے اپنی غزلوں میں متنوع موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ان کی غزلیں فنی خوبیوں سے بھی معمور ہیں۔موصوف شاعر کا شاعرانہ اسلوب قابل داد ہے۔ایک ایک شعر ازبر کرنے کو جی چاہتا ہے۔وہ شاعری میں لفظوں کا جھال نہیں بنتے جس کو بعض نئے شاعروں نے اپنا شیوۂ گفتار اور خصوصی اختصاص بنایا ہوا ہے۔پرویز مانوسؔ ایک معتبر شاعر ہیں۔جن کی غزلیں ان کی معتبریت کی بہترین مثال ہیں۔

☆☆☆

کتنے ہی اسرار ورموزان کے سامنے کھل گئے، دنیا کی بے ثباتی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی، قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں ان کے لیے عبرت کا سامان بن گئیں، احکاماتِ الٰہی سے انھوں نے سبق حاصل کیا، مناظرِ فطرت اور حیات بعد الممات کو محسوس کیا، نیز انسانی زندگی کے کرب واضطراب اور مسائل کو قریب سے دیکھا، جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن رشد وہدایات اور علوم ومعلومات کا خزانہ ہی نہیں، سرچشمہ ہے اور حیاتِ انسان کے لئے جامع دستور کہ اس کو جتنی مضبوطی سے تھاما جائے گا، اسی قدر کامرانی کی منزلیں طے ہوں گی۔ یہ مصرع ان کی اسی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے:

تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

''میں نے اِس کتاب کے اندر امتوں کی تقدیر کو پنہاں دیکھا ہے''

اقبال چاہے تعلیم کی بات کریں یا معاشرت ومعاش کی، مساوات یا رواداری کی، خودی یا اسرارِ خودی کی، کامیابی یا آزادی کی، تصوف یا جوانوں کی بیداری کی، اس کے پیچھے قرآن کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کے اہم موضوعات میں 'خودی' کو سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔

اقبالؔ نے اپنی فارسی اور اردو شاعری میں 'خودی' کے بیان کو بڑی وضاحت اور گرمجوشی کے ساتھ بیان کیا ہے اور 'فلسفۂ خودی' پر اپنی ساری توانائی اور صلاحیت صرف کردی ہے۔ کیوں کہ جس 'خودی' پر اقبال زور دیتے ہیں وہ دراصل عوام الناس کی زندگی کا حاصل ہے۔ اقبال کے 'فلسفہ خودی' کے پیچھے علمائے اسلام کے مواعظ، انسانی مقام ورتبہ سے متعلق مختلف مفکرین وفلاسفہ کے نظریات اور مولانا رومی کے احساسات بھلے ہی نظر آئیں مگر ان کے 'فلسفۂ خودی' پر سب سے زیادہ اور اولین اثرات قرآن کے ہیں بلکہ وہی اقبال کے فلسفۂ خودی کا مصدرِ اول ہے۔

خودی سے متعلق اقبال کے خیالات قرآن کے ذریعہ پیش کردہ انسان کے مقام ورتبے اور اس کی حیثیت ومنصب کی تشریح معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال نے بیان کیا ہے کہ 'خودی' سے کیا مراد ہے؟ خودی کا دائرہ اثر کیا ہے؟ کس طرح 'خودی' کے ذریعے کامیابی اور ترقی کی اعلی منزلوں کو طے کیا جاسکتا ہے؟۔ مثلاً 'خودی' کی حقیقت اور اس کی تاثیر کو بیان کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں:

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

ان دو اشعار میں اقبال نے خودی کے اثر کو بھی بیان کردیا اور خودی کے اس راز کو بھی وا کردیا

ہے جو زندگی کے اندرون اور بیرون پر مبنی ہے۔ بظاہر 'درونِ حیات' اور 'بیداریٔ کائنات' دو الفاظ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں معانی کا ایک جہان آباد ہے اور اندرون میں جھانکنے اور بیرون پر نظر رکھنے سے رازِ حیات اور رازہائے کائنات سے آگہی حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر انسان اپنے اندرون میں غوطہ زن ہوجائے تو زندگی کا سراغ بھی پاجائے اور عروج کے زینے بھی چڑھ جائے۔ اس لیے اقبال دنیا کو تسخیر کرنے کے لیے 'خودی' کے ہتھیار کو استعمال کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اشعار دیکھئے ۔

خودی کے زور سے دنیا پہ چھاجا
مقامِ رنگ و بو کا راز پاجا
برنگِ بحرِ ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

اقبالؔ کا خیال ہے کہ انسان 'خودی' کی وساطت سے خدا کی ترجمانی کا بھی فریضہ انجام دے سکتا ہے جو اس کے مقام اور کامیابی کی ایک اور منزل ہے۔ اسی لئے اقبالؔ خوبصورت پیرائے میں بنی نوع انساں کو 'خودی' کا ہمراز بن جانے کا درس دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا ، خدا کا ترجماں ہوجا

اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے اقبالؔ خودی کی بلندی، اس کی گہرائی، اس کی عظمت، اس کی شوکت اور اس کی وسعت کی پیمائش کے بیان کی کوشش میں یوں گویا نظر آتے ہیں ۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

....

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اِک بوند پانی میں بند
اَزل اس کے پیچھے اَبد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف وہ 'خودی' کی عظمت و شوکت کو شاعری کے حجاب میں محجوب

ISSN No. : 2395-2016

کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کی حقیقت و ماہیت سے پردہ بھی اٹھاتے جاتے ہیں تاکہ انسان خودی کی جمالیات کا مشاہدہ کر کے بہ صد ہزار شوق اس کا قُرب حاصل کرنے کا آرزومند ہو جائے اور اس میں اپنی ہستی کو فنا کر دے۔ کہتے ہیں۔

کھلے جاتے ہیں اَسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیثِ لَن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

اقبالؔ کے خیال میں 'خودی' کا صحیح علم انسانی زندگی کو انقلاب سے ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد انسان کو اپنی حقیقت کا ادراک اور خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور اگر خودی عشق کے بحرِ بیکراں سے ہمکنار ہو جائے تو پھر اس کی تاثیر کیا ٹھکانہ! اقبال کے الفاظ میں۔

خودی ہو علم سے محکم ، تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم، تو صورِ اِسرافیل

اقبالؔ نے 'خودی' کے وجود، اہمیت اور اس کی تاثیر کے اثبات میں فارسی و اُردو میں ہزاروں اَشعار کہے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اقبال کے نزدیک 'خودی' وہ شے ہے جو انسانی زندگی کے لیے صرف عارضی افادیت کی حامل نہیں بلکہ اس کی ابدی سرخروئی کی ضمانت ہے اور جس کے بغیر اصل کامیابی کا تصور نہیں ابھرتا۔ کیوں کہ انسان اپنی معرفت کے بعد ہی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اِس چند روزہ زندگی کے آگے بھی بہت کچھ اس کے لئے موجود ہے۔ درج ذیل اشعار میں اقبال نے اُسی طرف اشارہ کیا ہے:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی ، آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فُغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں۔

اقبالؔ نے فارسی میں 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی'، نیز اردو میں سینکڑوں اشعار کے توسط سے پوری انسانیت کو یہ پیغام دیا ہے کہ 'خودی' کے بغیر نہ انسان اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے، نہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور نہ کائنات کے اسرار کی دریافت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

خودی میں گم ہے خدائی، تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

خودی جس نے اقبال کے ذہن وقلب پر سکہ جما کر ان کی فکر کو اپنا اسیر بنالیا اور ان کی شاعری وفن پر چھا گئی، وہ کہاں سے آئی، کس نے اقبال کو خودی کی طرف متوجہ کیا؟ اس کا جواب ایک ہی ہے اور وہ ہے ''قرآن''۔ اقبال نے خود اس کا اعتراف 'اسرار خودی' میں اس طرح کیا ہے:

گر دِلم آئینۂ بے جوہر ست
در بحر فم، غیرِ قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رُسوا کُن مَرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مَرا

اقبال کے 'فلسفہ خودی' کے گہرے مطالعے سے خود پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک 'خودی' کے کیا معنی ہیں اور اس سے ان کی کیا مراد ہے؟ اقبال کے نزدیک خودی سے مراد تکبر، غرور، خود پسندی نہیں، بلکہ 'عرفان نفس' یعنی اپنے آپ کو پہچاننا ہے۔ انسان خود کس مقام پر فائز ہے۔ خالق نے کیسی کیسی صلاحیتیں اس کو ودیعت کی ہیں، اپنا خلیفہ ونائب اور اشرف المخلوقات بنا کر کس طرح اسے دیگر تمام مخلوقات کے مقابلے میں ممیز کر دیا ہے۔ اگر انسان یہ جان لے کہ وہ زمین میں اپنے رب کی خلافت وترجمانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو شیطانی قوتیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی، وہ کسی ایسے عمل کا مرتکب نہ ہوگا جو مقامِ انسانیت اور نیابتِ الٰہی کے منصب کے منافی ہو۔ سچائی یہ ہے کہ جب بھی انسان اَقدار کا مخالف، بداعمالیوں کا مرتکب اور نفسانی خواہشات کا پیروکار ہوا تو اس کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ اس کا اصل مقام اس کے سامنے نہ تھا۔ ایسے ہی جب بھی انسان نے اپنے معبودِ حقیقی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اس کے احکامات کی کھلے یا چھپے نافرمانی کی تو وہ بھی اس لئے کہ اس کی اپنی ذات اور حقیقت پردۂ اخفا میں تھی۔ اسی لیے اقبال نے پوری طاقت کے ساتھ خوی کے ذریعے بنی نوع انساں کو اپنی معرفت کا سبق پڑھایا ہے تا کہ وہ شیطانی طاقتوں کو مات دیدے اور ہر امتحان میں ثابت قدم رہ کر مردِ مومن بن جائے۔ اس پورے درس کا سر چشمہ قرآن کی متعدد آیات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ''جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ یقیناً میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں'' (سورہ بقرہ، پارہ:۱، رکوع:۴)

مقام فکر ہے کہ انسان کا کتنا عظیم مرتبہ متعین کیا گیا کہ بے شمار مخلوقات میں بنی نوع انساں کے علاوہ کسی اور مخلوق کو اتنا اہم رتبہ نہیں دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان فرشتوں کو بھی نہیں جو ہمہ وقت اطاعتِ الٰہی میں غرق رہتے ہیں اور مرضیِ مولا کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتے لیکن کیا انسان اللہ کی خلافت کے فرائض

ISSN No. : 2395-2016

انجام دے رہا ہے؟ کیا اس کا عمل، اس کا کردار ایسا ہے جو ساری کائنات کے مالک و بادشاہ کی نیابت کے منصب کی ترجمانی کرتا ہو؟ انسان اپنے مقام سے بیزار کیوں ہے؟ دراصل معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقام سے واقف ہی نہیں۔ اسی لئے اقبالؔ 'خودی' کے ذریعے اِنسان کو خود اُسی سے متعارف کراتے ہیں کہ انسان خودی کی جتنی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا، اسی قدر اس کے مرتبے بلند ہوتے جائیں گے۔ کہتے ہیں:

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثر، آہِ رسا دیکھ

....

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

'خودی' سے اللہ راضی ہوتا ہے اور اس کے مقام کو بلند کردیتا ہے، پھر وہ جو چاہتا ہے، عطا کرتا ہے، اسی کو اقبالؔ لطیف انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے ،بتا تیری رضا کیا ہے

معرفتِ الٰہی کے بعد ایک طرف انسان عشقِ حقیقی میں ڈوب جاتا ہے اور دوسری طرف اس پر خشیتِ الٰہی طاری ہوجاتی ہے۔ جب یہ کیفیت سامنے آتی ہے تو وہ اپنے رب کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں اس کا رب ناراض نہ ہوجائے۔ مذکورہ بالا شعر اِسی حقیقت کی تشریح ہے اور اس کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور یہ نعمت اس شخص کو حاصل ہوسکتی ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ (سورہ نمبر ۹۸، آیت نمبر: ۸) خودی سے متعلقہ اقبال کے اشعار اور قرآن کی مذکورہ آیات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا اولین اور بنیادی مصدر و مآخذ قرآن ہی ہے۔

☆☆☆

کامران غنی صبا، معاون مدیر سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز

اردو شاعری میں نظریۂ کفر والحاد

نام: کامران غنی، قلمی نام: کامران غنی صبا۔ تاریخ پیدائش: 22 نومبر 1989۔ تعلیم: ایم اے (جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی)، بی ایڈ (جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) پی ایچ ڈی جاری (پٹنہ یونیورسٹی)۔ نیٹ، سی ٹیٹ، بی ٹیٹ۔ وابستگی: معاون مدیر سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز، معاون مدیر سہ ماہی تحقیق، مدیر اعزازی اردو نیٹ جاپان، ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ماہنامہ کائنات، کولکاتا، معاون مدیر ماہنامہ نیا کھلونا کولکاتا، انچارج ایڈیٹر ادب ایڈیشن روزنامہ پندار پٹنہ۔ انعامات واعزازات: اردو نیٹ جاپان، روزنامہ تاریخ انٹرنیشنل فرانس، المنصور ایجوکیشنل ٹرسٹ دربھنگہ، اکبر رضا جمشید ایوارڈ پٹنہ، عوامی اردو نفاذ کمیٹی پٹنہ۔ تصنیف: پیامِ صبا (شعری مجموعہ)۔ رابطہ: 9835450662

اردو شاعری اپنے متنوع موضوعات اور نیرنگئ خیال کے باعث ہر عہد میں مقبول رہی ہے۔ عہد قدیم سے عہد وسطی تک اور پھر عہد جدید میں زندگی کے تمام موضوعات کا احاطہ اس صنف مین ہوتا رہا ہے۔ اردو شاعری میں مذہبی افکار وخیالات کے علاوہ سماجی ومعاشی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا تو حسن وعشق کی باتیں منظر عام پر آتی رہیں۔ غرض بدلتے ہوئے زمانے اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ اردو شاعری نے اپنے فکر وتخیل کو بھی تبدیل کر کے پیش کیا۔ اس میں شبہ نہیں شاعری نے انسانوں کی طبیعت اور مزاج پر اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ بعض شعراء کے صوفیانہ کلام نے یکسر مزاج زندگی کو تبدیل کر دیا، وہیں رزمیہ کلام نے فولادی طاقت کے جوہر نمایاں کیے۔ حسن وعشق کی باتیں اور مجازی شاعری نے تو وہ اثرات مرتب کیے کہ واعظ وناصح حضرات بھی اس کے اسیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اسی طرح اردو شعراء نے جن دیگر موضوعات پر قلم اٹھائے ان کے اثرات ہمارے معاشرے پر بلا واسطہ یا بل واسطہ طور پر مرتب ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی میں اردو شعرا اور ان کے اشعار نے جو جوش وولولہ پیدا کیا اس کے کون انکار کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اردو شعرا اور ان کے اشعار میں قارئین کے اذہان کو تسخیر کرنے کی ساحرانہ طاقت ہوتی ہے۔ اب یہ شعراء حضرات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال

کس نہج پر کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری شاعر کے احساسات وجذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کسی شاعر کا کلام اس کے شعور وفکر کا غماز ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے ہم کسی شاعر کو صوفی شاعر کہتے ہیں تو کسی کو شاعرِ انقلاب، کوئی فلسفیانہ خیالات کی پیشکش کرتا ہے تو کوئی حسن وعشق کے قصے بیان کرتا ہے۔ غرض یہ کہ شعرا نے اپنے مخصوص فکر ونظر کی ترجمانی اپنے کلام کے ذریعہ پیش کر کے معاشرے پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ ہم یہ بات پہلے ہی کہہ چکے ہیں ادب کا تعلق زندگی سے ہے اور شاعری جو فنون لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے، بالواسطہ یا بلا واسطہ ہمارے معاشرے پر اپنا بھرپور اثر ڈالتی ہے۔ ادب کے متعلق مفکرین اور ناقدین میں یہ اختلاف پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے کہ ادب برائے زندگی ہے یا زندگی برائے ادب؟ میرے خیال میں زندگی ادب کے لیے ہو یا ادب زندگی کے لیے دونوں ہی صورت میں معاشرے کی صحیح تشکیل وتعمیر لازمی ہے۔

میرا موضوع اردو شاعری میں کفر والحاد سے ہے۔ عہد قدیم کے نامور شعراء نے اس موضوع کو اپنے کلام میں جگہ دینے سے گریز کیا ہے۔ اردو ادب کے آفاقی شاعر اسد اللہ خاں غالب کے کچھ اشعار سے ان کی شوخی طبیعت کا پتہ تو ضرور چلتا ہے لیکن ان کے اشعار کو ہم کفر والحاد پر مبنی نہیں کہہ سکتے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مذکورہ اشعار کے علاوہ بھی دیوان غالب سے اس نوعیت کے بے شمار اشعار نکالے جاسکتے ہیں۔ ان اشعار کا مقصد محض شوخی وظرافت تک محدود ہے۔ کیوں کہ غالب کے ہی صوفیانہ اشعار بلندیٔ فکر میں اس درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں کہ کہیں سے بھی ان کا عقیدۂ توحید متزلزل معلوم نہیں ہوتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
کل کے لیے نہ آج کر خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

متاخرین شعراء کے یہاں بھی ''ہلکی پھلکی'' شوخی تو ضرور ملتی ہے لیکن کفر والحاد اور قاری کو شکوک وشبہات میں ڈالنے والے اشعار سے پرہیز کیا گیا ہے۔

ترقی پسند تحریک شروع ہونے کے بعد اردو ادب خاص طور پر اردو شاعری میں کفر والحاد پر مبنی مضامین اس طرح شامل ہونے لگے گویا کفر و الحاد کی تبلیغ و تشہیر ہی اس تحریک کا مقصود ہے۔ن۔م۔راشد، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری وغیرہ وہ شعراء ہیں جو اس صف میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اس ساحرِ بے نشان کا
جو مغرب کا آقا ہے
مشرق کا آقا نہیں ہے
(ن۔م۔راشد)

عقائد وہم ہیں مذہب خیال خام ہے ساقی
ازل سے ذہن انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
(ساحر لدھیانوی)

یہ شاعری ہے عرش کی بازی گری نہیں
یعنی خدا نخواستہ پیغمبری نہیں
شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ
شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا
(جوش ملیح آبادی)

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
(فیض احمد فیض)

عہد جدید میں کہ جب مادیت اپنی حدود سے باہر نکل چکی ہے اور اس نے پورے معاشرے اور شعبہ ہائے زندگی کے تمام امور کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے تو بھلا اردو شاعری اس سے کیسے مبرا ہو سکتی ہے۔آج کے شعرا میں جون ایلیا، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، ندا فاضلی، بشیر بدر، شجاع خاور، وغیرہ وہ شعراء ہیں جنھوں نے اپنی تشکیک کو بذریعۂ شاعری طشت از بام کر کے مذہبی اقدار اور ان سے متعلق الفاظ کا خوب استعمال کیا ہے۔اس سلسلے میں بلا تفحص و تحقیق جو چند اشعار مجھے ملے ہیں ملاحظہ ہوں۔

اب میں نہیں رہا ہوں کسی بھی گمان کا
ائے میرے کفر ، ائے مرے ایمان الوداع
(جون ایلیا)

نہ اتنے زور سے سوچو کہ جاگ اٹھے وہ
خدا ابھی ہمیں تخلیق کر کے سویا ہے
(شجاع خاور)

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا
(فراز)

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں
(فراز)

بھلا دیے ہیں ترے غم نے دکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتھر کی مورتیں تھیں بہت
(فراز)

یا خدا پھر یہ جہنم کا تماشہ کیا ہے
تیرا شہکار تو فن نار نہیں ہو سکتا
(احمد ندیم قاسمی)

خدا کے لب پہ ہنسی ہے خدائی جھوم رہی ہے
تمہاری بات چلی ہے مری حسین خطاؤں
(احمد ندیم قاسمی)

ختم توفیق بغاوت فقط آدم پہ نہ کر
اب کسی اور بھی مخلوق کو دوزخ سے نکال
(احمد ندیم قاسمی)

کچھ تو قانون محبت میں کمی ہے ورنہ
تیری جنت میں فرشتوں کی بغاوت کیوں ہے
(نامعلوم)

ISSN No. : 2395-2016

لوٹ آتی ہے مری شب کی عبادت خالی
جانے کس عرش پہ رہتا ہے خدا شام کے بعد
(نامعلوم)

زمیں پہنی گئی اور آسماں اوڑھا گیا برسوں
بدن کی خانقاہوں میں خدا سویا رہا برسوں
(خورشید اکبر)

اس نوعیت کے بے شمار اشعار جدید شعرا کے یہاں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اس طرح کے اشعار میں بھی ایمان و یقین کی ایک شمع روشن ہے جو شاعر کے لاشعور یا تحت الشعور کو اجاگر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر شاعر کا ذہن کسی غیر محسوس طاقت کا منکر ضرور ہے اس کے باوجود اس کے لاشعور میں جزا و سزا اور عذاب و ثواب جیسی شئے موجزن ہے۔ اگر یہ حقیقت نہیں ہے تو اس طرح کے اشعار سے اور کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے۔

یا خدا پھر یہ جہنم کا تماشہ کیا ہے
تیرا شہکار تو فن النار نہیں ہو سکتا
(احمد ندیم قاسمی)

ختم توفیق بغاوت فقط آدم پہ نہ کر
اب کسی اور بھی مخلوق کو دوزخ سے نکال
(نامعلوم)

شکیل بدایونی نے غالباً اسی نکتے سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

منکر ذات تری بحث مسلم لیکن
یوں وہ کچھ اور نمایاں نظر آتا ہے مجھے

اس میں شبہ نہیں کہ اردو ادب کا دامن دیگر زبان و ادب سے کم وسیع و عریض نہیں ہے اور ارباب ادب کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے افکار کو (خواہ وہ تعمیری ہوں یا تخریبی) پیش کریں۔ لیکن کامیاب ادیب وہی ہے جو اپنے قاری کو تشکیک کے بھنور سے نکال کر اعتماد و یقین کے جزیرے پر لے آئے، ہمارے چراغوں کو ہواؤں کا مقابلہ کرنا سکھائے اور جو ہمارے شعور کو تخریب کے بجائے تعمیری کاموں کی جانب متوجہ کرے۔

☆☆☆

فاروق اعظم قاسمی (پی ایچ ڈی اسکالر)
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

عشق و انسانیت کی شاعرہ: مینو بخشی
(جستجو کیا ہے)

فاروق اعظم قاسمی ہندوستان کی مایہ ناز علمی درسگاہ جے این یو سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سے ایم اے (اردو) کی سند حاصل کی۔فاروق اعظم قاسمی نے اپنے قلمی سفر کا آغاز 2002ء سے کیا۔ ملک و بیرون ملک کے درجنوں اخبارات ورسائل میں مختلف موضوعات پر اب تک ان کے بہت سارے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔فاروق اعظم قاسمی کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں علامہ سید مناظر احسن گیلانی کی شخصیت و شاعری پر 'مناظر گیلانی' (2007)، 'آؤ قلم پکڑنا سیکھیں' (2009) اور تنقیدی مضامین کی مجموعہ 'تخلیق کی دہلیز پر' (2013) وغیرہ شامل ہیں۔پہلی اور تیسری کتاب پر بہار اردو اکادمی نے انہیں ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

عالمی زبانوں میں شاید اردو زبان ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس سے محبت کرنے والے، اسے آنکھوں سے لگانے والے، اس کے بولنے اور سننے والے، اس کے ادیب و شاعر کی ایک بڑی تعداد دنیا کے ہر خطے میں آپ کو بآسانی مل جائے گی۔اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ ان فنکاروں کا حقیقی میدان کار تو اردو کے علاوہ کچھ اور ہوتا ہے تاہم وہ اردو زبان کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔جغرافیائی یا لسانی ہر دو حوالے سے کہیں بھی اس پیاری زبان کے فنکار آپ کو مل جائیں گے۔ابھی حالیہ دنوں میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی میں شرکت کا موقع ملا، بے حد مسرت ہوئی۔روس، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، ایران، ترکی، عرب اور ماریشش وغیرہ ممالک سے تشریف لائے ادبا و شعرا کو دیکھنے اور سننے کا موقع بھی ملا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ دوسری زبانوں میں اگر کوئی ماہر زبان نظر آتا ہے تو وہ اس کی شعوری محنت و لگن کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کے بعد وہی زبان اس کا میدان کار بھی بن جاتی ہے لیکن اردو کی نوعیت اس

سے مختلف ہے۔ بہت سے حضرات کا اصل میدان تو کوئی اور سجکٹ اور موضوع ہوتا ہے تاہم اردو کا جادو انھیں اس قدر اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنا لیتا ہے کہ وہ دوسرے میدان سے تعلق رکھنے کے باوجود اس زبان کے ہو جاتے ہیں۔ اردو کے ایسے ہی غیر پیشہ ور عشاق میں ایک اہم نام مینو بخشی کا بھی ہے۔

غزل اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق پڑھنے سے کم اور سننے سے زیادہ ہے۔ شاعری یا نثر کی دوسری اصناف سے زیادہ تر اہلِ علم ہی استفادہ کر پاتے ہیں جب کہ غزل کا امتیاز یہ ہے اس سے پڑھا لکھا شخص بھی حظ اٹھاتا ہے اور کم پڑھا لکھا بھی اس سے لطف اندوز ہوتا ہے یہاں تک کہ غزل سن کر بے پڑھا لکھا آدمی بھی اچھل پڑتا ہے۔ ایک زمانے میں آزاد غزل کی تحریک بڑے زور شور سے چلائی گئی تھی لیکن کیا ہوا اردو معاشرے نے اسے سونگھ کر چھوڑ دیا کیوں کہ غزل کی جان نغمگیت اور موسیقیت کا نبھاؤ اس کے ساتھ ممکن نہ تھا۔ غزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف 'لازم' ہیں یعنی اس کی مقبولیت شاعر ہی تک محدود ہے جب کہ غزل 'متعدی' دو آتشہ ہے، یہ اپنے تخلیق کار کو بھی سر پہ بٹھاتی ہے اور ساتھ ہی آواز دینے والے فنکار گلوکار کو بھی شہرت و مقبولیت کا اعزاز بخشتی ہے۔ غزل نے شاعر و گلوکار دونوں کو باہم شیر و شکر بنا دیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اگر غالب سے نئی نسل واقف ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ غالب کی غزلوں کو آوز دینے والے فنکار کا بھی اس میں اہم رول ہے۔

مینو بخشی وطن سے پنجابی اور پیشے سے پروفیسر ہیں لیکن وہ اپنے شوق کے پروں سے الگ الگ جزیروں کی سیر کرتی رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں اسپینش کی پروفیسر ہوں، انگریزی و ہندی سے واقف ہوں اور پنجابی تو میری مادری زبان ہی ہے تاہم میرے نزدیک اردو سے زیادہ شیریں، خوب صورت اور پرکشش زبان کوئی نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ میں نے دوسری زبانوں میں بھی غزل گوئی کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ میرے دماغ میں غزل کا ورود تو بس اردو زبان ہی میں ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ وہ غزل کی شاعرہ ہونے کے ساتھ غزل کی خوب صورت گلوکارہ بھی ہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ شاعرہ پہلے ہیں اور گلوکارہ بعد میں۔ بقول ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر: ''وہ دورِ حاضر کی عام شاعرات کی طرح محفلِ مشاعرہ میں عام بد ذوق سامعین کی تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچانا اپنی شاعرانہ عظمت کے منافی تصور کرتی ہیں''۔ (جستجو، ص:15) آج کا مروجہ مشاعرہ شاعر و شاعرہ کی عظمت تو یقیناً گھٹا سکتا ہے لیکن اس میں شرکت عظمت کی ضمانت بنے مشکل ہے۔

مینو بخشی کے لیے اردو زبان اور غزل گوئی بطورِ فیشن نہیں ہے بلکہ یہ عمل ان کا شوق ہے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ رہ روانِ شوق نے تو پہاڑوں کا جگر چاک کر کے منزل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مینو بخشی کی غزلوں سے ان کی جگر کاوی، عرق ریزی اور طویل مشق و مزاولت کا علم ہوتا ہے۔

مینو بخشی کی غزلوں کے رنگ و آہنگ اور لفظیات و تراکیب سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ذہن و دماغ انیسویں یا بیسویں صدی کے کسی شاعر کے شعری پھلواری کی سیر کر رہا ہے۔

یہ غمزہ، یہ عشوہ، یہ شوخی، یہ مستی، بنی تھی کہاں حسنِ چشمِ جوانی
نگارِ وفا شیشۂ دل میں اپنے تجھے میں نے جب تک اتارا نہیں تھا

یہ جو کالی سی رات ہے پیارے
مثلِ رنگِ حیات ہے پیارے
رفتنی سب ہیں اس زمانے میں
ہر کوئی بے ثبات ہے پیارے
کیجیے شمعِ عشق اب روشن
ہر طرف تیرگی سی چھائی ہوئی ہے
بھول جاؤں گی سبو کی مستیاں
اپنی نظروں سے پلا کے دیکھیے

فیض احمد فیض نے جس طرح کلاسکی لفظیات کو نئے نئے معانی پہنائے ہیں اور ماضی کو حال سے ہم رشتہ کیا ہے اس کا عکس ہمیں مینو بخشی کی غزلوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس رویے کو ہم 'نئے جام میں پرانی صہبا' کا نام دے سکتے ہیں۔ شاعرہ کا یہ اسلوب انھیں ہم عصر دیگر شاعرات سے ممتاز کرتا ہے۔ غزل دراصل محبت کا اظہار ہے اور محبت کا مقام دل ہے۔ اب اگر کسی دل میں محبت ہی نہ ہو تو وہ دل کیا دل ہوا۔ مینو کہتی ہیں کہ جس دل میں محبت نہ ہو وہ دل ہی نہیں ہے۔

ترے لطف، تیری عنایت سے پہلے
یہ دل تھا کہاں دل، محبت سے پہلے

بادی النظر میں مینو کی غزلیں احتجاجیہ معلوم ہوتی ہیں لیکن ذرا غور سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ ان کے لطیف گلے شکوے کی تہوں میں الفت، محبت اور مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

آج وہ ہے جانبِ دشمن کھڑا تو کیا ہوا
اک نہ اک دن ہوگا وہ رشکِ قمر میری طرف
دل کو تسکیں مل جائے گی اور نظر کو بھی راحت
یہ جو میرے دشمن ہیں وہ دوست اگر بن جائیں

انھیں اپنی محبت سے شکایت نہیں بلکہ مایوسی بھی نہیں ہے بس محبت ہی محبت ہے، مروت ہی مروت ہے اور ہمدردی ہی ہمدردی ہے۔ مینو کا یہ انداز و ادا ہمیں پروین شاکر کی یاد دلاتی ہے۔

ISSN No. : 2395-2016

اسی امید پر صحرائے غم میں بیٹھی ہوں
کھلیں گے پھول نگاہوں میں تیرے آنے پر
کون ہنس ہنس کے اٹھائے گا ترا نازِ ستم
کون جھیلے گا ترا جور و وفا میرے بعد
تو اگر چاہتا ہے غم دینا
اے مرے دوست کوئی بات نہیں !
کہوں گی نہ اف تک میں اپنی زباں سے
مجھے عشق میں جس قدر وہ ستائیں

ان اشعار کی تہوں میں طنز کی زیریں آنچ تو ہے لیکن وہ بھی محبت میں لپٹی ہوئی ہے۔ عشق ومحبت ان کا ایک ایسا وصف ممتاز ہے جو ہر ڈگر پہ روشن وگرم ہے لیکن روشنی دودھیا چاند کی ہے اور حرارت خورشید کی۔ مینو کے یہاں عشق ایک استعارہ ہے، شوہر کا استعارہ، بچوں کا استعارہ، اپنی ذمہ داریوں کا استعارہ اور سب سے بڑھ کر انسانیت کا استعارہ ہے۔ مینو کی غزلوں کے موضوعاتی جہان کی بات کی جائے تو ان کے یہاں ہمیں عشق ومحبت کا شرارہ، امن وانسانیت کا نغمہ، مظلومیت کی ہم نوائی، اخلاقیات کی خوشبو اور تصوف کی روشنی کا جام جہاں نما نظر آتا ہے۔

دولتِ غم سے بے نیاز نہ کر
یہ مرے عشق کی کمائی ہے
وہ ایک نام جو میرے لیے ہے وجہِ سکوں
میں اس کا نام جو لیتی ہوں تو وضو کر کے
جھیل میں مسکراتے کنول کی طرح
وہ نظر آئے تازہ غزل کی طرح
ترے دل میں جس دم اتر جاؤں میں
عقیدت کی خوشبو سے بھر جاؤں میں
کبھی جو مجھ کو بتِ بے وفا کی یاد آئی
قسم خدا کی بہت ہی خدا کی یاد آئی

مینو کی ہر غزل تغزل سے معمور ہے۔ ان کے یہاں عشق حقیقی کی خوشبو بھی ہے اور عشق مجازی کا رنگ بھی۔ اسی طرح مینو کی غزلوں میں امن کا پیغام بھی ہے اور انسانیت کا نغمہ بھی سماعت کو تسکین بخشتا ہے۔ درحقیقت یہی وصف ایک انسان کو کسی بھی میدان میں ممتاز ونمایاں کرتا ہے۔

آتشِ عشق سے چنگاری طلب کرتی ہوں
دل کے بجھتے ہوئے چولھے کو جلانے کے لیے

پڑوسی تیرے بھوکے سو رہے ہیں
ترے منہ میں نوالہ جا رہا ہے

گھر کی ویرانی ستائے تو بنے گھر دوزخ
دل بہل جائے بیاباں میں تو گھر ہو جائے

زمانے پر محبت کا ہے احساں
جہاں ہے پھر بھی بے زارِ محبت

کیوں ہے چمن میں آنکھ گلوں کی بھری بھری
کیوں اس قدر اداس نسیمِ بہار ہے

جانے کب آئے گا وہ دور بھی اس دنیا میں
جب ہر اک سمت محبت ہی محبت ہوگی

آپ کا کرتی ہوں کتنا احترام
میرے گھر تشریف لاکے دیکھیے

اخلاقیات کی بھی مدھم ہی سہی قندیل ضرور روشن ہے۔

اس کو پیہم مت جتانا چاہیے
کر کے احساں بھول جانا چاہیے

ہر طرف ہے تیرگی ہی تیرگی
اب کوئی سورج اگانا چاہیے

''جستجو'' میں جگہ جگہ انسانیت کے درس کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل کو بھی اجاگر کرنے کی تعمیری کوشش کی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ عورتوں پر ماضی میں بھی مظالم ڈھائے گئے ہیں اور آج بھی نوعیت کے اختلاف کے ساتھ کم وبیش وہ صورتِ حال برقرار ہے لیکن اب نرا مرد سماج اس کا ذمہ دار نہیں بلکہ کہیں نہ کہیں اس میں خود خواتین کا بھی حصہ ہے۔ خواتین نے خود کفالت کے چکر میں دفتری زندگی کو اختیار کیا لیکن گھر گھرستی سے وہ آج بھی انکار نہ کر سکیں۔ اس وقت عورت دو پاٹوں میں پس رہی ہے۔ ایک طرف دفتر کی مار ہے تو دوسری طرف گھر آکر اسے اپنے عورت ہونے کا ثبوت بھی پیش کرنا اس کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔

ISSN No. : 2395-2016

پھر بھی تیری چاہت میں کچھ کمی نہ آپائی
گھر کی تھی پریشانی ، الجھنیں بھی دفتر کی
آپ کی نوازش ہے ، آپ کی عنایت ہے
کھارہی ہوں میں ٹھوکر اس طرح جو در در کی
تصور میں رہا کرتی ہے جو گھر کی پریشانی
مرا جی اک ذرا بھی تو نہیں لگتا ہے دفتر میں

مینو بخشی کو تصوف سے بھی مس ہے۔ آج دنیا تمام آسائشوں کے باوجود بے سکونی کی شکار ہے اور امن و انسانیت کی پیاسی بھی۔ اور یہ سچ ہے کہ تصوف امن و انسانیت کا گہوارہ ہے اس لیے شاعرہ درِ تصوف پہ بھی دستک دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

رفتنی سب ہیں اس زمانے میں
ہر کوئی بے ثبات ہے پیارے
وہ ایک نام جو میرے لیے ہے وجہِ سکوں
میں اس کا نام جو لیتی ہوں تو وضو کر کے
ہے حقیقت فنا ہر اک گل کی
گلشنِ دہر بے ثباتی ہے
جب سے روشن ہے تیرا جلوہ نظر کے سامنے
کوئی کعبہ ہے نہ بت خانہ نظر کے سامنے
یوں منور ہے تیرا جلوہ نظر کے سامنے
ہو گیا ہے چاک ہر پردہ نظر کے سامنے
ہر سمت تو ہی تو نظر آئے نہ کیوں مجھے
ظاہر ہر ایک ذرے سے تیرا جمال ہے
نشاں باقی نہیں جس میں انا کا
مسافر ہے اپنی راہِ رضا کا
بنے گا گل جہاں لقمہ قضا کا
رہے گا نام باقی بس خدا کا

ISSN No. : 2395-2016

نظر ہے جس کی اپنی عاقبت پر
وہی بس خاص بندہ ہے خدا کا
کیوں نہ ہو مٹھی میں اس کی ، یہ نظامِ کائنات
آدمی جب خالقِ مطلق کا نائب ہو گیا
اس کو ملے گی منزلِ مقصود بالیقیں
پیشِ نگاہ جس کے رہِ اعتدال ہے

اس کے علاوہ مینو بخشی کی غزلوں میں بلند حوصلگی، تعلّی، انکساری اور خودداری وغیرہ کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

اشک آنکھوں میں نہ لانا چاہیے
مشکلوں میں مسکرانا چاہیے
پتھروں کو بھی عطا کرتے ہیں جو گویائی
ہم بھی رکھتے ہیں وہی ہاتھ ریاضت والے
جو میں مشہور ہوتی جا رہی ہوں
اثر یہ ہے بزرگوں کی دعاؤں کا

مینو بخشی ہندوستان کے علاوہ دوسری دنیا بھی دیکھ چکی ہیں اور ملک کے ایک عظیم تعلیمی ادارے (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی) سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کی نظر انتہائی وسیع ہے بطور خاص عصر موجود پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ ویسے بھی ایک شاعر حالات و واقعات سے سرسری نہیں گزرتا بلکہ ان کی تہوں میں ڈوب کر واقعات کی جملہ جہات کا جائزہ لیتا ہے پھر ان سے طرح طرح کے موتی مونگے نکالتا ہے اور اسے دنیا والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عصری حسیت پوری طرح متحرک ہے۔

یہ تو ہر روز ہی انصاف کا پیتے ہیں لہو
کس قدر ہو گئے بے حس یہ عدالت والے
بے وفائی کی اسی پر ہے یہ کیسی تہمت
مکتبِ عشق میں جو درسِ وفا دیتا ہے
اسی کی سازش ہے اس میں شامل
جہاں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے

ISSN No. : 2395-2016

جس شہر میں ہر شخص ہو ابلیس کا بندہ
اس شہر میں فرمانِ خدا کون سنے گا
ہر فیصلہ سورج کی گواہی پہ ہے موقوف
مظلوم درختوں کی نوا کون سنے گا
ترے دل کے مقدس گھر میں کیوں اب
سگِ نفرت کو پالا جا رہا ہے
علم کی روشنی پھیلی ہے ہر اک سمت مگر
آج بھی عام ہیں دستور جہالت والے
مری زباں بھی آلودہ ہو کے رہ جائے
جو اپنے شہر کی آب و ہوا کی بات کروں
لگے ہوئے لبِ اظہار پر جو پہرے ہوں
زبانِ حال سے بھی کیا کوئی گلہ نہ کرے
ہر طرف عداوت کی ظلمتوں کا ڈیرا ہے
جذبۂ محبت کی روشنی کہاں جائے
عدل ہو گیا غائب اب تو ہر عدالت سے
پھر کوئی طلب کرنے منصفی کہاں جائے
میرے مالک تیری دنیا کا عجب دستور ہے
ہر فریبی صاحبِ آرائے صائب ہو گیا

مینو بخشی کے کلام میں صنائع و بدائع، استعارات تشبیہات اور تلمیحات کا بھی خوب صورت سنگم ملتا ہے۔ ان کی زبان بھی بڑی ستھری اور نکھری ہوئی ہے۔ مینو کی غزلوں کی شناخت ہی بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ روانی ایسی گویا کوئی آبشار بہ رہا ہو۔ مینو نے اخذ و استفادے کی خاطر اساتذۂ فن میر و غالب اور داغ وغیرہ کی زمین میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ اسی طرح مینو کے یہاں پروین شاکر اور کلیم عاجز کی غزلوں کی بھینی بھینی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں غزل کا موضوعاتی کینوس گرچہ بہت وسیع نہیں ہے لیکن قدیم اقدار کو انھوں نے جو جدت و ندرت کا لباس عطا کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ آگے بھی خدا مینو بخشی کو امن و انسانیت اور محبت کی روشنی کو دور تک پھیلانے کا موقع دے کہ آج زمانے کو سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر نعمان قیصر

کلکتے کا ادبی ماحول بیسویں صدی میں

ایک ادبی دستاویز

نام: نعمان عالم۔ قلمی نام: نعمان قیصر۔ جائے پیدائش: مجل گاؤں، ارریہ، بہار۔ تاریخ پیدائش: 31 دسمبر 1977
تعلیم: گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ موضوع: غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ۔ نگراں: پروفیسر شہاب الدین ثاقب۔ مصروفیات: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے پی ڈی ایف (پوسٹ ڈاکٹرال فیلوشپ) نگراں: پروفیسر شہپر رسول۔ موضوع: اردو ناول کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کا حصہ
2006 سے 2013 تک روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) بحیثیت سب ایڈیٹر خدمات انجام دی
2011 سے 2013 تک سہ ماہی ابجد کا مدیر اعزازی کے رہا
ہندوستان کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں مضامین و مقالات شائع ہوئے
کتاب: ادب کائنات (مضامین و مقالات کا مجموعہ) زیر اشاعت

'کلکتے کا ادبی ماحول بیسویں صدی میں' بنیادی طور پر ایک تذکرہ ہے۔ اس لیے اس پر گفتگو سے قبل 'تذکرہ' کے محتویات سے متعلق گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے۔ 'تذکرہ' عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ ذکر سے مشتق ہے، جس کے معنی یادداشت، دستاویز، سند سرٹیفیکیٹ، سفر کا ٹکٹ، پروانۂ راہداری اور پاسپورٹ ہیں۔ اصطلاح میں تذکرے سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں شعرا کے سوانحی حالات اور ان کے کلام کی خصوصیات مختصراً بیان کی جائیں۔ نیز ان کے کلام کا انتخاب بھی اس میں شامل ہو۔ شاعروں کے سوانحی حالات کے علاوہ تذکرے کا اطلاق ایسی کتابوں پر بھی ہوتا ہے جن میں صوفیوں، ولیوں، طبیبوں، سلطانوں اور مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے حالات زندگی اور ان کے سوانحی مواد یکجا کئے گئے ہوں۔ تذکرۃ الاولیا (شیخ فریدالدین عطار) تذکرۃ الفقرا (مرزا محمد اختر گورگانی) تذکرہ اہل دہلی

،تذکرۂ ماہ وسال (مالک رام) وغیرہ۔ اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔لیکن ان کے علاوہ تذکرے سے متعلق ایسی کتابیں بھی ہیں جن کا شعرا کے حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے، جیسے تذکرۂ سلاطین دکن، اور تذکرۂ اولیائے دکن (مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری) ادبی اور قومی تذکرے (پنڈت کشن پرساد کول) اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت 'تذکرہ' وغیرہ۔

اردو میں تذکرہ نگاری کی ایک مستحکم روایت ہے۔اردو میں یہ صنف فارسی کی وساطت سے آئی ۔فارسی کا پہلا تذکرہ نورالدین عرفی کا 'لباب الالباب 618ھ مطابق 1221ء' ہے۔اردو میں اس کی اولیت کا سہرا میر تقی کے سر جاتا ہے۔انہوں نے ''نکات الشعراء 1165ھ مطابق 1752ء'' میں لکھ کر اردو میں تذکرہ نگاری کی بنیاد رکھی۔یہ ایک مختصر تذکرہ ہے، جس میں ایک سو دو شعرا کے احوال ان کے منتخب کلام کے ساتھ شامل ہیں۔اس کی زبان فارسی ہے۔فارسی کا چلن عام ہونے کی وجہ سے ایک عرصے تک فارسی زبان میں ہی تذکرے لکھے گئے ۔اردو زبان میں پہلا تذکرہ مرزا علی لطف کا 'گلشن ہند' ہے جسے انہوں نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے ایما پر فورٹ ولیم کالج میں 1801ء میں مکمل کیا۔یہ تذکرہ علی ابراہیم خاں کا گلزار ابراہیم 1198ھ مطابق 1783ء' کا اردو ترجمہ ضرور ہے لیکن اس میں تذکرہ نگار نے ترمیم وتخفیف اور حذف واضافے سے کام لے کر اسے تالیف کا درجہ دے دیا ہے۔اردو میں تذکرے کی اہم کتاب 'سخن شعرا' (تذکرہ شعرائے اردو) جس کے مصنف عبدالغفور نساخ ہیں۔یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں 2446 شعراء اور چالیس شاعرات کا تذکرہ ان کے منتخب کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس کی اولین اشاعت 1874ء مطابق 1291ھ میں کلکتے میں عمل میں آئی۔اگر دیکھا جائے، تو معصوم شرقی کا یہ تذکرہ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔اردو شعراء کے احوال وکوائف اور ان کے منتخب اشعار کو بنیاد بنا کر بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں گلشن گفتار (حمید اورنگ آبادی) تحفۃ الشعراء (افضل بیگ قاقشال) تذکرہ ریختہ گویاں (فتح علی حسینی) مخزن نکات (قیام الدین قائم) چمنستان شعرا (لچھمی نرائن شفیق) طبقات الشعرا (قدرت اللہ شوق) تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) گل رعنا (مولوی عبدالحی) اور گلشن سخن (مردان علی خاں مبتلا) کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر معصوم شرقی اردو شعر وادب کا ایک محترم نام ہے۔ان کی بہت سی علمی اور ادبی کاوشیں ناقدین علم وادب سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔'کلکتے کا ادبی ماحول، بیسویں صدی میں' تذکرہ ان کی تحقیقی جستجو اور تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔تحقیقی محرکات اور تنقیدی ادراکات کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے ایجاز واختصار کے ساتھ ان نمائندہ شعرا کے شعری تفردات اور ادبی فتوحات سے اردو کے

قارئین کو متعارف کرانے سعی کی ہے جن کا رشتہ کسی نہ کسی طور کلکتے سے رہا ہے۔

تخلیقی اعتبار سے کلکتے کا ماضی انتہائی روشن تھا، ملک بھر میں اسے شعری اور ادبی لحاظ سے مرکزیت حاصل تھی۔ بہت سے عظیم المرتبت شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کا رشتہ اس شہر سے رہا ہے، جنہوں نے اپنی تخلیقی ذہانت اور فن کارانہ عظمت سے اس شہر نگاراں کے عز و وقار میں اضافہ کیا۔ کلکتہ کے حال میں بھی وہی تابانی ہے جو کسی بھی شہر کو علمی اور ادبی سطح پر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ایک عرصے تک کلکتے کو ہندوستان کی اقتصادی راجدھانی ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے کونے کونے سے شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے کسب معاش کے لیے شہر مزدور یعنی کلکتے کا رخ کیا۔

"کلکتے کا ادبی ماحول، بیسویں صدی میں" بنیادی طور پر ایک تذکرہ ہے۔ جس میں مصنف نے بیسویں صدی کے شاعروں اور ادیبوں کے شعری کمالات اور ان کے فنی تفردات کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ تذکرے میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی، ایجاز و اختصار اس کی ضرورت ہے۔ تذکرے کا فنی تقاضا بھی یہی ہے کہ اس میں طوالت سے گریز کیا جائے۔ شاعر کی زندگی کا بیان، ان کی شخصیت کا اظہار اور ان کے کلام پر تنقید تذکرے کے عناصر ترکیبی ہیں۔ معصم شرقی نے اس کتاب میں تذکرے کے فنی لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے تینوں پہلوؤں کو توازن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی میں کلکتہ میں مقیم بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے معصوم شرقی کا قریبی تعلق رہا ہے، بہتوں کو بہت قریب سے انہوں نے دیکھا ہے، بہتوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہے۔ جو زندہ ہیں ان کی صحبت اور معیت کو وہ اپنی خوش بختی پر محمول کرتے ہیں اور جو چلے گئے ان کی یادوں کے چراغ ان کے ذہن میں جھلملا رہے ہیں۔ تذکرے کی اس کتاب میں یادوں کی انہیں مدھم جگمگاہٹ کو آپ نے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے کسی بھی شخصیت کو دائرہ تحریر میں لانے سے قبل ماخذ کے طور پر ان کی تحریر، تصنیف اور اقوال سے استفادہ کیا ہے، تاکہ ان کی سیرت و شخصیت کا ایک جامع خاکہ اور ان کا منتخب کلام قارئین کے سامنے آجائے اور تحقیق کی معتبریت بھی قائم رہ سکے۔

تذکروں میں شاعروں اور فن کاروں کی ترتیب دو طرح سے ہوتی ہے۔ بعض لوگ حروف تہجی کا خیال کرتے ہیں جبکہ بعض تذکرہ نگار ماہ و سال کو بنیاد بنا کر تذکرے ترتیب دیتے ہیں۔ تذکرہ نگاری میں یہ دنوں ہی طریقے رائج ہیں۔ معصوم شرقی نے اپنے اس تذکرے میں زمانی ترتیب کا ہی خیال رکھا ہے۔ آپ نے کسی بھی شخصیت پر لکھتے وقت اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخ کا خاص التزام کیا ہے، اس کی سیرت و شخصیت کے نمایاں پہلو کو بھی آپ نے چند جملوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ معصوم شرقی کے اس تذکرے

ISSN No. : 2395-2016

میں سوانح نگاری، سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کے عناصر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تذکرہ ادبی دستاویز ہے، جس کی روشنی میں بیسویں صدی میں کلکتے کی ادبی تاریخ رقم کی جا سکتی ہے۔

معصوم شرقی کے اس تذکرے کے مطالعے سے کلکتے کے بیسویں صدی کی ادبی سمت و رفتار کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ شعر و ادب کا ایک اجمالی خاکہ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ معصوم شرقی نے محنت اور دیانتداری کے ساتھ بیسویں صدی کے معروف اور غیر معروف ادبی شخصیتوں کے سوانحی حالات اور ان کے تخلیقی کمالات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تذکرے میں بیسویں صدی کا کلکتہ پوری طرح سانس لیتا نظر آتا ہے۔ جن شخصیتوں کا انھوں نے تذکرے میں احاطہ کیا ہے، ان میں اکمل علی اکمل، علامہ رضا علی وحشت، آرزو لکھنوی، اشک امرتسری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، ناطق لکھنوی، مست کلکتوی، علقمہ شبلی، مظہر امام، قیصر شمیم، یوسف تقی، ف س اعجاز اور منور رانا کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

'کلکتے کا ادبی ماحول، بیسویں صدی میں' یہ تذکرہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ زبان و بیان کی عمدگی تو اس میں ہے ہی، چونکہ تذکرہ نگار بذات خود ایک منجھے ہوئے شاعر اور ایک باکمال ادیب ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے زبان و بیان پر ان کی قدرت اور ان کے احساس کی شگفتگی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے، لیکن کتاب کا سب سے اہم پہلو جو مجھے متاثر کرتا ہے، وہ یہ کہ اس میں ایسے آوارہ گرد اشعار کی تعداد کافی ہے جو اجتماعی شعور و احساس کا حصہ ہیں۔ جنہیں سماج میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہے اور موقع و محل کے اعتبار سے ان اشعار کا استعمال بھی خوب ہوتا ہے، لیکن لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کے اصل خالق کے نام سے ناواقف ہے۔ معصوم شرقی کی متجسس طبیعت نے ان اشعار کے اصل خالق سے اردو کے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ ان مشہور زمانہ اشعار کے تئیں قارئین کی دلچسپی کی وجہ سے انہیں یہاں تحریر کیا جا رہا ہے۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

علامہ رضا علی وحشت

نہیں معلوم دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

سید غلام مست کلکتوی

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طر ح

ناطق لکھنوی

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد
سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

یہ اور اس قبیل کے بہتیرے اشعار اس کتاب میں مل جائیں گے جو سماج میں زبان زد خاص وعام ہیں اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

ڈاکٹر معصوم شرقی نے اس کتاب میں کل ساٹھ علمی وادبی شخصیتوں کا تذکرہ قلم بند کیا ہے۔ جن میں سے گیارہ بقید حیات ہیں جبکہ اونچاس ملک راہی عدم ہو چکے ہیں۔ ایسا نہیں کہ اس کتاب میں شامل ساری شخصیتیں شعر وادب کی نمایاں ترین شخصیتیں ہیں۔ ان میں سے بعض واقعی ادب کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہیں، جبکہ بعض تخلیقی اعتبار سے بہت زیادہ تحرک وتوانائی نہیں رکھتیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس بات کا استحقاق رکھتی ہیں کہ ان کے نام اور کام سے دنیا تفصیلی طور پر نہ سہی اجمالاً ہی روشناس ہو۔ اس لیے معصوم شرقی نے کم وبیش تخلیقی اعتبار سے زرخیز، متمول اور کم متمول شخصیت کو اپنے اس تذکرے میں جگہ دی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو شاعروں وادیبوں کی یہ تعداد ساٹھ سے متجاوز ہو سکتی تھی، لیکن انہوں نے قصداً ایسا نہیں کیا اور اس کے لیے جواز یہ پیش کیا کہ اس سے کتاب کی طوالت اور ضخامت غیر ضروری طور پر بڑھ جاتی۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے بہت سے نام گنوائے ہیں۔ جن حبیب ہاشمی، پروفیسر شہناز نبی، اشہر ہاشمی، عاصم شہنواز شبلی، ابوذر ہاشمی اور نوشاد مومن کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، اگر اس تذکرے میں یہ شخصیتیں شامل ہو جاتیں، تو کتاب کی اہمیت وافادیت مزید دو چند ہو جاتی۔ خاص طور پر پروفیسر شہناز نبی کا تذکرہ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ بے پناہ تخلیقی صلاحیت کی مالک ہیں۔ تخلیقی انفرادیت اور نسائی جذبات واحساسات کو فنی طور پر برتنے کی وجہ سے ان کی شاعری معنی خیز ہو گئی ہے۔ لہٰذا وہ اس بات کا استحقاق رکھتی ہیں کہ انہیں اس تذکرے کا حصہ بنایا جائے۔ نظمیہ شاعری میں آپ کا تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ آپ کی کل انیس کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں جن میں تنقید وتحقیق سے متعلق تیرہ اور چھ کا تعلق شاعری سے ہے۔ آپ کے شعری مجموعوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ بھیگی رتوں کی کتھا، مجھے مت چھوؤ، اگلے پڑاؤ سے پہلے، پس دیوار گریہ، شرار جستہ، اور سخن نیم شب۔ ان مجموعوں کے نام سے بھی ایک طرح کی جدت وندرت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری اسلوب ومعانی کی سطح پر نئی ریکھاؤں اور نئی

دِشاؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی نے اس کتاب میں پانچ درجن علمی وادبی شخصیتوں کا احاطہ کیا ہے۔فرداً فرداً سبھی کے فکروفن سے مکالمہ دشوار ہے۔لہٰذا کچھ چیدہ اشخاص کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے۔علامہ جمیل مظہری نے اپنے صحیفہ حیات کا قیمتی حصہ کلکتے میں گزارا۔آپ نے بنگال میں اردو شعروادب کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔شاعری میں نئے رجحان کو فروغ دینے کا کام آپ نے خوبی سے کیا ہے۔نظمیہ شاعری سے آپ کو ذہنی لگاؤ تھا۔مرثیہ میں بھی آپ نے نام پیدا کیا ہے۔نقش جمیل،فکر جمیل،عرفان جمیل،وجدان جمیل آپ کے شعری مجموعے ہیں۔پرویز شاہدی کا شمار کلکتہ کے معروف ترین شعرا میں ہوتا ہے۔رقص حیات 1957 'اور' تثلیث حیات 1968 'ان کے دوشعری مجموعے ہیں۔آپ نے غزلوں کے علاوہ رباعیات اور نظمیں بھی کہی ہیں۔شاعری میں آپ کا تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔کلکتہ میں اردو صحافت کی تاریخ احمد سعید ملیح آبادی کے ذکر جمیل کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ایک عرصے تک روزنامہ 'آزاد ہند' سے وابستہ رہے۔حق گوئی اور بیباکی آپ کی تحریروں کے امتیازات ہیں،صحافتی اصول واقدار کے آپ ہمیشہ پابند رہے۔آپ کے اداریے ادبیت سے پر ہونے کی وجہ سے ادبی اور صحافتی حلقے میں یکساں پسند کئے جاتے تھے۔معصوم شرقی کے اس تذکرے میں جن فعال اور زرخیز علمی وادبی شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں ایک اہم نام پروفیسر یوسف تقی کا بھی شامل ہے۔آپ کی شہرت وشناخت کے کئی حوالے ہیں۔تحقیق وتنقید آپ کا خاص میدان ہے،لیکن شاعری میں بھی آپ کا ہاتھ تنگ نہیں ہے۔آپ کی کل نو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔تنقید وتحقیق سے متعلق آٹھ جبکہ 'خشک ٹہنی زرد پتے' کے نام ایک شعری مجموعہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔15 اگست 1943 کو آپ پیدا ہوئے اور 13 نومبر 2017 کو آپ کا انتقال ہوا۔علمی وادبی حلقے میں آپ کی موت پر کافی رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔جس سے آپ کی مقبولیت اور محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔آپ کا ایک شعر بہت مشہور ہے۔

خشک ٹہنی سا تصوز ،زرد پتوں سا خیال
ایک موسم ہے دل کا، اتنی برساتوں کے بعد

آزاد غزل کے بانی مظہر امام کا رشتہ بھی اس شہر سے رہا ہے۔نظم ونثر سے متعلق ان کی کل تیرہ کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ان کی غزلیہ شاعری بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ان کے یہاں جدت کی پاسداری بھی ہے اور روایت کا احترام بھی ان کے یہاں نظر آتا ہے۔ان کی کل تیرہ کتابیں ہیں۔شعری مجموعوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔زخم تمنا،رشتہ گونگے سفر کا،پچھلے موسم کا پھول،بند ہوتا ہوا بازار،اور پالکی کہکشاں کی۔انسانی رشتوں کی نزاکت اور سماج کی مثبت قدروں کو ہنر مندی کے ساتھ آپ نے شعری

ISSN No. : 2395-2016

پیرہن عطا کیا ہے۔ظفر اوگانوی کا بھی کلکتہ سے ایک مستحکم رشتہ رہا ہے۔ تحقیق وتنقید سے آپ کی ذہنی وابستگی ہے۔ 'صفیر کی بازیافت، جلوۂ خضر، اذہان واشخاص اور رموزِ اقبال آپ کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔کلکتہ کی بزرگ شخصیتوں میں علقمہ شبلی نے اردو کی بیشتر شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نظم ونثر پر مبنی ان کی کل تیرہ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ زادِ سفر، چہرہ نامہ، دھوپ دھوپ سفر، چہار آئینہ اور شہر نامہ آپ کے شعری مجموعے ہیں۔ وہ غیر مسلم فن کار جنہو نے اردو کے فروغ کے لیے کافی جدو جہد کی ان میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ ہیں۔ وہ ایک فعال ادیب اور اردو کے سچے خادم تھے۔کئی ادبی شہ پارے ان کی یادگار ہیں۔ ترجمہ نگاری پر بھی انہوں نے زور دیا۔قیصر شمیم کلکتہ کی ایک فعال ترین شخصیت کا نام ہے۔ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کی شاعری میں جدیدیت کی آمیزش بھی ہے اور کلاسیکی اقدار کی پاسداری بھی نظر آتی ہے۔ف س اعجاز کلکتہ کی ادبی صحافت کا ایک معتبر نام ہے۔شعر وادب سے آپ کا گہرا رشتہ ہے۔ برسوں سے آپ ماہنامہ 'انشا' کی ادارت فرما رہے ہیں۔شاعری اور نثر دونوں پر دونوں پر آپ کو قدرت حاصل ہے۔ایک درجن سے زائد شعری ونثری تصانیف آپ کی منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں تنہائیاں، مالک یوم الدین، موسم بدل رہا ہے، لاشریک، صاحب فن، اونچے مکانوں کے قریب، پلوٹو کی موت، چاند پر دیا، اور ارتکاز آپ کی اہم تصانیف ہیں۔شاعری میں اقدار کی شکست وریخت، سماجی جبر اور انسانی کسمپرسی کو ہنر مندی کے ساتھ آپ نے شعری جامہ پہنایا ہے۔ وہ شعرا جنہوں نے کلکتے کا رخ کیا اور شہرت کی بلندیوں کو چھولیا، ان میں ایک نمایاں نام منور رانا کا بھی شامل ہے۔ اتر پردیش کے بریلی میں وہ ضرور پیدا ہوئے، لیکن معاشی دشواریوں کے حل کے لیے کلکتے کو انہوں نے اپنا وطن ثانی بنالیا۔ یہ سچ ہے کہ اس شہر نے نہ صرف ان کی غربت کا پاس ولحاظ رکھا بلکہ مالی اعتبار سے ان کو نہال بھی کر دیا۔اسی شہر نے ان کی شعری وتخلیقی اڑان کو شہرت ومقبولیت عطا کی۔فی الوقت منور رانا اردو کی غزلیہ شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ان کی شاعری اجتماعی فکر واحساس کی ترجمان ہے۔انہوں نے موضوع کی سطح پر غزل کو وسعت عطا کی۔ان کی شاعری میں ان کی اپنی آواز اور ان کا اپنا تجربہ ہے جس پر کسی ازم یا تحریک کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔شاعری آپ کا خاص میدان ہے لیکن آپ نثر بھی عمدہ لکھتے ہیں۔تقریباً آپ کی ایک درجن کتابیں اشاعت کے مرحلے سے گزر چکی ہیں۔جن میں 'غزل گاؤں، مور پاؤں، سب اس کے لیے نیم کے پھول، کہو ظل الٰہی سے، ماں، مہاجر نامہ، بغیر نقشے کا مکان، سفید جنگلی کبوتر، غزل بیتی، جنگلی پھول، اور چہرے یاد رہتے ہیں' آپ کی قابل ذکر شعری ونثری تصانیف ہیں۔ 'شہدابہ' پر آپ کو ساہتیہ اکادمی کے باوقار ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔مذکورہ اشخاص کے علاوہ بھی کلکتہ سے تعلق رکھنے والی بہت سی علمی اور ادبی شخصیتیں ہیں جن کی تخلیقی ہنر مندی کا اعتراف زمانے کو ہے لیکن غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے انہی ناموں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

ISSN No. : 2395-2016

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تحریریں شخصیت کی عکاس ہوتی ہیں، یہ بات بہت حد تک معصوم شرقی کی تحریروں پر صادق آتی ہے۔ سنجیدگی اور متانت جوان کی شخصیت کا حصہ ہے، اسی رعنائی وزیبائی سے ان کی تحریر بھی مزین ہے۔ استغراق اور انہاک جو آپ کے مزاج کا حصہ ہے اسی گہرائی اور گیرائی سے آپ کی تحریر بھی متصف ہے۔ کافی چھان پھٹک کے بعد ہی آپ کسی بھی شخصیت کو اپنے تذکرے کا حصہ بناتے ہیں۔ سلاست، روانی اور برجستگی جو شعر کے امتیازات ہیں، وہ آپ کی نثر پر صادق آتی ہیں۔ آپ کی تحریر سلیس اور شستہ ہوتی ہے، گنجلک اور مبہم اسلوب نگارش سے آپ پرہیز کرتے ہیں۔ صراحت، وضاحت اور قطعیت آپ کی تحریر کے بنیادی محاسن قرار دیے جاسکتے ہیں۔ آپ جو بات کہتے ہیں اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام یا اشکال نہیں پایا جاتا۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کی نثر کا نمونہ ملاحظہ کریں۔ اکمل علی اکمل کے تعلق سے لکھتے ہیں۔ ''اکمل نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل ان کی محبوب صنف سخن تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں ذوق اور داغ کے اسالیب کی ہم آہنگی سے ایک منفرد انداز بیان پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اکمل کے یہاں زبان کی بندش، سلاست چستی، صفائی اور بلند خیالی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر معصوم شرقی کی تحریر کی خوبی کے اعتراف میں اور بھی اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے مذکورہ دو اقتباسات پر اکتفا کیا جارہا ہے، البتہ ان کی تحریر کے امتیازات اور محاسن کو بیا ن کرنے کے لیے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر عبدالمنان کی تحریر سے ایک اقتباس کا بیان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ''معصوم شرقی ایک خوش فکر اور دل گداز شاعر بھی ہیں۔ یہی صفت کم وبیش ان کی نثر میں درآئی ہے۔ یہاں نظریاتی سود وزیاں کی تلاش فعل عبث ہوگی صرف حیات کی لہریں آواز دیں گی۔ ان لہروں کے درمیان معصوم شرقی کو بحیثیت فن کار ڈھونڈا جائے گا۔ اس کا عکس پیش نظر کتاب میں نمایاں ہے جس میں رعنائی بھی ہے اور اردو کی رفتار کے چند شیڈس بھی۔!! کلکتہ کی ادبی صورتِ حال پر کئی فن کاروں نے توجہ دی ہے، لیکن معصوم شرقی کی نظر کی داد دی جاسکتی ہے۔'' کتاب کی گوناگوں خوبیوں کی بنیاد پر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ کلکتہ میں تذکرہ نگاری کے باب میں معصوم شرقی کا یہ تذکرہ اعتبار اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور تذکرہ نگاری کی ریت اور روایت کو استحکام بھی عطا کرے گا۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

ڈاکٹر محمد ارمان

عجب رنگ خورشید کی شاعری

('آسماں پسار آئے' کی روشنی میں)

محمد ارمان، والد: محمد سلیم، والدہ: نسیمہ خاتون، پیدائش: ۲؍جنوری ۱۹۷۷ء، رابطہ: شانتی باغ، نیو کریم گنج، گیا، تعلیم: ایم اے اردو، پی ایچ۔ڈی، ایم بی اے، ملازمت: ہمدرد لیبارٹیریز انڈیا، موبائل نمبر: 9931441623

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو مطبوعات کا سرمایہ شعریات اور خصوصاً غزلیات کی شکل میں سال بہ سال بڑھ رہا ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک بڑی سچائی ہے کہ اس سرمایے کا بڑا حصہ محض زیب داستان ہی کے مصداق ہوا کرتا ہے، کیوں کہ اس کے اوراق، بالعموم بلند بانگ دعووں کی توثیق سے ذرا قاصر ہی دکھائی دیتے ہیں اور اس کی وجہ محتاج بیان نہیں۔

ظاہر ہے کہ شاعر کے پاس اگر اپنا لہجہ نہ ہو اور ہمہ صورت لسانی وعروضی شعور کے ساتھ وہ اپنی باتیں کہنے پر متوجہ یا قادر نہ رہے، تو موضوعات سخن، خواہ کچھ بھی ہوں، ان میں تازگی اور گہرائی و گیرائی نہیں آسکتی، لیکن جب صورت حال اس کے برعکس ہو تو پھر فکری وفنی دونوں ہی لحاظ سے اس کا لائق اعتنا ٹھہرنا بالکل فطری امر ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ خباب خورشید اکبر کی ''غزل کی چوتھی کتاب'' ایک ایسا ہی کامیاب ومنفرد نمونہ ہے جو قارئین اور ناقدین کو مطالعاتی مسرت وبصیرت سے نوازنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

جناب خورشید اکبر اعلیٰ انتظامی منصب پر فائز ہیں اور نہایت ہی عمدہ شخصیت اور ادبی وشعری صلاحیت کے مالک۔ قدرت نے انہیں نہایت ہی جزرسی کے ساتھ زندگی اور زمانے کے احوال انتہائی قریب سے دیکھنے اور شاعری کے آئینے میں اسے سلیقہ وسنجیدگی سے دکھا دینے کی قوت بھی بخشی ہے اور توفیق بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی منصبی مصروفیات کے باوجود شعر وشاعری سے مسلسل شغف کے ساتھ اپنی شناخت زیادہ سے زیادہ روشن بناتے چلے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ جدید غزل کی دنیا میں آج ان کا لہجہ

دور ہی سے پہچان لیا جاتا ہے اور بسا اوقات اس پر زبردستی شک کرنے والے بھی، اس پر اضطراری یقین و اعتماد کی منزل میں آجاتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ واقعی ہے

عجب رنگ خورشید کی شاعری
وہ خوش ذائقہ لاجوابی سخن

تعلیات سے شاعروں کا شغف ایک دیرینہ روایت ہے، جس میں مبالغہ ہمیشہ مباح سمجھا گیا ہے اور خودستائی کی شمشیر سے ہزاروں قتل روا رکھے گئے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خورشید اکبر کی تعلیات میں بہر حال ایک وقار و توازن اور خود آگہی کا شعور ہے جو ہمیں ان کے نظریہ شاعری اور وطیرۂ زبان کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے اور ہمیں اس بات کا بیش از بیش معترف بنا دیتا ہے کہ وہ طرحیات کے ماہر، فک اضافات کے سلیقہ داں، ترکیبات و استعارات میں لطیف قرائن کے التزام اور جدید تشکیلی تراکیب ولفظیات کے استعمال پر قادر اور جزئیات سے گہرے و موثر تجربے کے اظہار کی صلاحیت رکھنے والے ایسے فن کار ہیں جو ''آسماں پسار آئے'' جیسے چونکا دینے والے اعلان کا صرف شوق نہیں رکھتے بلکہ اِسے سننے اور پڑھنے والوں کو اس کی معنویت کے اقرار پر مجبور کر دیتے ہیں

طلب دراز تھی ، دامن بہت ہی چھوٹا تھا
خدا کے سامنے ہم آسماں پسار آئے

یہ بے پایاں طلب اور تنگ دامانی کا اعتراف بھی ہے، جرأت عقل و عمل کا اظہار بھی اور دینے والے کے سامنے اسی کی نعمت کا واسطہ اور حوالہ بھی۔ خورشید اکبر یہاں وسائل کی یافت میں جس طرح جدیدیت بدست دکھائی دیتے ہیں، وہ بس انہیں کا حصہ ہے۔ وہ تصورات کو محسوسات کی سطح پر لا دینے کا ہنر جانتے ہیں اور زندگی و زمانے کی جبریت کچھ اس طرح آئینہ کرتے ہیں کہ ان کے مجموعہ کا انتسابی صفحہ، کتاب کے ورق ورق کا بنیادی معاملہ و مسئلہ سامنے لا دیتا ہے

نفس کی آگ میں بھونی ہوئی مچھلی دینا
جس کو کھانا بھی ہے ، کانٹا بھی نگل جانا ہے

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ شاعر فرار کی راہ اپنانے کا داعی نہیں بلکہ حوصلے اور جرأت کی عملی تعلیم دینے والا شاعر ہے۔

خورشید اکبر کا زیر مطالعہ مجموعہ ''آسماں پسار آئے'' دوسو صفحات پر مشتمل، سوغزلوں کا ایک

خوبصورت مجموعہ ہے، جو ''مکتبہ آمد'' کے زیراہتمام تقریباً دوسال پہلے ستمبر ۲۰۱۶ء میں منظرعام پر آیا اور یقیناً اہل ذوق کے ذریعہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ مجموعہ عام روش کے برخلاف نہ تو سفارشی بیسا کھیوں کا مرہون منت ہے اور نہ ہی کسی ادارے کی اشاعتی اعانت کا، بلکہ ''انتساب'' اور ''فہرست'' کے بعد یہاں بلاوساطت صفحہ گیارہ سے غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور آخری صفحہ تک پہونچتا ہے۔ اس مجموعہ میں دو غزلہ، سہ غزلہ بھی ہے جو مختلف شاعروں کی نذر کیا گیا ہے اور آخر میں سات طرحی غزلیں بھی جو ''بزم دوستاں'' کے مشاعرہ منعقدہ ۲۰۱۲ء میں پڑھی گئی تھیں۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی بھی شاعر کا مجموعہ کلام سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے اس کے نظریہ فکروفن کی تلاش ہوتی ہے اور یہ مقام مسرت ہے کہ یہ مجموعہ اپنے ایسے متلاشیوں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا ہے بلکہ یہاں متعدد غزلیہ مقطعے اور دیگر اشعار سے یہ معلوم ہوجاتا ہے، کہ شاعر نے جو کچھ لکھا ہے وہ صاف ستھرے اور واضح ادبی وفکری نظریہ کے ساتھ لکھا ہے۔ شاعر کی نظر میں غزل کے لئے لہجہ کا نرم ومعطر ہونا ضروری ہے اور یہ بھی کہ تاریخی تسلسل میں اس صنف کا فن کار اپنی امتیازی چمک رکھتا ہو، اس کے اندر ایسی بے پناہ صلاحیت ہو کہ وہ ''مکاں کی صدا لامکانی سنے'' اس کی شاعری خوش ذائقہ ولاجوابی ہو اور وہ اپنے فن کی بابت کسی واہمہ کا شکار نہ ہو۔

خورشید اکبر کے نزدیک غزل کا وصف ووظیفہ یہ ہے کہ وہ ''چنچل مضرابی، پانی سی ریگستاں میں گونجتی رہے'' یعنی غزل میں بیداری، ہوشیاری لانے اور زمانے وماحول کے مطابق افکار وجمالیات کا ذوق ابھارنے کی صلاحیت ہو، مزید یہ کہ شعروں سے جو خورشید معانی ابھر رہا ہو، اس کی شہادت کے بیان میں انفرادیت پائی جائے۔

خورشید اکبر کے نزدیک غزل کی شاعری محض شعلوں کا نام نہیں بلکہ آتش جاں کے پھولوں میں بدل جانے کا نام ہے۔ شاعری کوچہ جاناں کی کشش ہے اور یہاں شاعر کا منصب یہ ہے کہ وہ سو دوزیاں کے احساس سے بے نیاز ہوکر اس کی طرف آئے اور اسے شبنم کی آنچ بھی دکھاتا رہے۔ خورشید اکبر نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ''غزل شاعری کی امانت سے پہلے، لہو سے وضو شرط'' ہے ؎

ایک خورشید ہے جو اکبر ہے
ورنہ سو آفتاب آئے بھی

وہ خورشید ہے شاعر بے پناہ
مکاں کی صدا لامکانی سنے

ISSN No. : 2395-2016

ہم اپنے دکھ کی دوا ڈھونڈتے رہے خورشیدؔ
کہ واہمہ تھا بہت شاعری کے بارے میں

ریگستاں میں گونجتی رہتی ہے خورشیدؔ
اک غزل چنچل مضرابی پانی سی

شعروں سے ابھرتا ہے جو خورشیدؔ معانی
ہے اس کی شہادت کا بیاں اور طرح کا

خورشید اکبر کی شاعری صرف تعلیات پر مبنی نہیں بلکہ اس میں نوع بہ نوع مضامین کا اک جہاں بھی شادو آباد ہے۔ مثلاً خورشید اکبر کی غزلیہ شاعری میں، زندگی اور موت کا مضمون طرح طرح سے باندھا گیا ہے اور دنیا اور زندگی وزمانے کے رُخ طرح طرح دکھائے گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایسے اشعار میں نظریاتی واستعاراتی رمق بھی ہے اور پڑھنے اور سننے والوں کے لئے انتباہی اور اصلاحی جذبہ بھی ۔

موت کیا ہے تلخ امرت کی صراحی
زندگی کیا چاشنی زہراب کی ہے

موت کیا ، بے رخی تمہاری ہے
جان کیا ، بندگی تمہاری ہے

موت کیا ہے ، کوئی آہٹ نہ صدا دستک کی
اس کے کوچے سے دبے پاؤں نکل جانا ہے

مزید یہ کہ ان کی غزلوں میں سائنسی وجغرافیائی حقائق، آج کی زندگی میں آپسی رشتوں اور تہذیبی قدروں کے زوال، کشمیر کے حالات، گمرہی اور دنیا پرستی کے نقشے بھی صاف صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔

جانے کس بات پہ پھرتی ہے زمیں اتراتی
تین حصے پہ تو قبضہ ہے یہاں پانی کا

گرتی ہوئی دیوار تو رشتوں کی طرح ہیں
ملبے میں دبا شخص بھی احسان اٹھائے

خورشید اکبر اگرچہ جدید غزل کے فن کار ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ادیب وشاعر بہر حال ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اور اپنے ماضی قریب اور اپنے روزمرہ کے معاشی ومعاشرتی احوال سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے غزلیہ اشعار میں مفلوک الحال مزدوروں اور محنت کشوں کی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے اور امارت وغربت کا وہ فرق بخوبی سامنے لادیا ہے جہاں ہمارے ارمانوں کا خون ناحق ہوتا رہتا ہے ۔

نہاتے رہتے ہیں مزدور خون پسینے میں
تمہارا شہر چمکتا ہے کہکشاں جیسا

ہم پستے رہتے ہیں جیون چکی میں
ارمانوں کی گھانی ہوتی جاتی ہے

آج کی دنیا کتنی بیمار ہے اور علاج کا جذبہ رکھنے والے بھی کس قدر بے بس ہیں اور وسائل سے محروم،، اسے خورشید اکبر کی غزلوں میں نہایت سادگی وپرکاری سے دکھایا گیا ہے۔ ۔

کتنی بیمار ہو گئی دنیا
اور ہم آخری انار ہوئے

جیسا کہ کہا گیا ان کے نزدیک اصل اہمیت بقا واستحکام کی ہے اور اس جہت سے وہ جدید وقدیم کی بحث کو محض ثانوی اہمیت دیتے ہیں ۔

عمارت وہی ہے جو قائم رہے
نئی کیا کہے ، کیا پرانی سنے

ان کا نظریہ موت وحیات اور نظریہ فن وشاعری بالکل ہی واضح ہے اور انہوں نے اپنی غزلوں میں سیاست حاضرہ، ماحولیات واخلاقیات، آفاقی صداقت، دنیا کی بے ثباتی کے مضامین نہایت چابکدستی سے باندھا ہے ۔

پھر تیز ہواؤں میں دستار گری جیسے
کمزور حمایت کی سرکار گری جیسے

خوش رہتی ہیں کبھی خفا ہو جاتی ہیں
مائیں ہر صورت میں دعا ہو جاتی ہیں

ہمارے گھر میں اندھیرے بچھا دیے گئے ہیں
ہمارے شہر میں سورج کی حکمرانی ہے

اتنا ہی نہیں بلکہ عصریات کے تعلق سے زمانے کی عام بے غیرتی، مہذب دنیا کی منافقت، عام بے پناہی، خودشناسی کے فقدان، تاریخ فراموشی، جبریت کی حکمت عملی، نام نہاد آزادی، سماجی تضاد، داخلی انتشار، بے وفائی وفرومائیگی اور ازیں قبیل بہت سارے متنوع موضوعات کو بھی نہایت اچھے انداز میں انہوں نے اپنے فکری وفنی کمند وکمان کا قیدی بنایا ہے ۔

سنسان ہے پھر غیرت انساں کا علاقہ
ہم ڈوبنے جائیں کہاں دریا بھی نہیں ہے

پڑھتے ہیں ہم قصیدے منصوبہ جہاں کے
لیکن ہمارے گھر کا نقشہ علاحدہ ہے

سن کے یہ خبر جنگل بجھ گئے کہ شہروں میں
آگ پھیل جاتی ہے اور دھواں نہیں ہوتا

جہاں تک طرز بیان کا تعلق ہے، یہ صحیح ہے کہ خورشید اکبر کے یہاں بعض شعر میں سپاٹ پن بھی ہے اور کہیں محاورے کی غلطی، جدید لفظی شکلیں، بے جا تفصیل اور تعقید کا احساس بھی ہوتا ہے، مثلاً ۔

ہم کو بے چین کرتے رہتے ہیں
حسب معمول شہر کے حالات

کون مانگے سے بھی دیتا ہے خوشی کی خیرات
ہم تجھے یاد کریں ، ہاتھ خزانے لگ جائیں

یہ الگ بات ہے کہ سب ایک نہیں رہ پائے
یہ الگ بات کہ دشمن کی ہوا ٹوٹ گئی

روندے جاتے ہوں جہاں لعل و گہر پیروں سے
داستاں ہوگی وہاں کیا دُر نایابی کی

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر نے تجنیس صوتی، ک، گ کے حسن استعمال، تعلمیع اور تلمیح وتضاد سے آمد کی شان کے ساتھ اپنا جہان سخن سجا رکھا ہے تو یقیناً ہماری بصیرت ومسرت دوبالا ہوجاتی ہے

شجر شاداب جسمانی سفر تھا
ثمر مہتاب روحانی سفر تھا

جام جاں لبریز ہے اس کے نین سے
نشہ خورشید بے انداز سائیں
ثمر بدوش ملا کب کسی کی دعا کا درخت
میں عاقبت کی جڑیں یونہی کوڑ آیا ہوں

لہجہ کا انفراد، مشاہیر شعرا کی لفظیات وحکایات سے یہ انداز نوغذا کا حصول اور ردّ ابتداوصدر، نہ دوائر، تخلص کے تلازمے، اجرام سماوی کی تنسیق، ہندی الفاظ کے استعمال کی صورت میں جس طرح اپنے فنی جلوؤں سے ہمیں محفوظ ہونے کا موقع دیتا ہے، وہ شاید جدیدیت نواز غزل گوئی کے فن کاروں کی دنیا میں خال خال ہی مل سکے۔ خورشید اکبر کے یہاں عوامی بہاری دیہی الفاظ، سمندر پانی کے استعارے اور سوالیہ انداز سے طنز اور تحریک ذہنی کی جو مشکور فنی کاوشیں ملتی ہیں، وہ بھی قابل دید اور قابل داد ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ خورشید اکبر کا زیر نظر چوتھا مجموعہ ان کی دستار انفراد میں ایک اور نمایاں اور مفید خوبصورت کلغی کا اضافہ کردیتا ہے۔ خدا کرے ان کے قلم سے ایسے افادات واضافات کا سلسلہ جاری رہے۔

محمد عامر جونپور یو پی

کیفی اعظمی: سوانح اور نظم نگاری

نام :محمد عامر قلمی نام : محمد عامر شیرازی، پیدائش:۴راپریل ۱۹۸۴ء، والد کا نام :محمد رفیق، والدہ کا نام: شوکت جہاں، ابتدائی تعلیم: مدرسہ-ادارۂ علوم اسلامیہ مولانا آزاد تعلیمی مرکز، اسرہٹہ شاہ گنج جونپور اتر پردیش، انٹرمیجیٹ: مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج الہ آباد، اتر پردیش، بی-اے & ایم -اے : الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، اتر پردیش، نٹ(NET) : یونیورسٹی گرانٹس کمیشن(UGC)، بی۔ایڈ(B.Ed) :عبدل عزیز انصاری ڈگری کالج مجڈیہا، شاہ گنج جونپور (ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسٹی جونپور) اتر پردیش

پیشہ :اسسٹنٹ پروفیسر، شری وشوناتھ، پی۔جی کالج کلان سلطانپور اتر پردیش(Self Finance) کہانی : مکّو (MAKKU)، دلچسپی : سیر و سیاحت، فکشن پڑھنا اور مضمون لکھنا شادی: ۲۸راگست ۲۰۱۳ بیوی کا نام: ثنا فاطمہ مستقل پتہ: بڈو پور، رانی مئو، شاہ گنج جونپور اتر پردیش 222139 موبائل نمبر : 9839379041 ای میل :

amirrafeeq01@gmail.com

کیفی اعظمی کی شخصیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انکا پہلا ہی مجموعہ کلام 'جھنکار' ۱۹۴۳ء میں شامل ہوا تو اس وقت ترقی پسند تحریک سے وابستہ سجاد ظہیر کا پیش لفظ اس میں شامل تھا۔ جس کا پہلا جملہ تھا۔

" جدید اردو شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے۔ سرخ پھول "

کیفی اعظمی ایک زمینی آدمی تھے اور عوام میں رہنا پسند کرتے۔ شہری چمک دمک سے زیادہ انھیں گاؤں کی سادگی پسند تھی۔ یہ مفلسوں' بے کسوں اور ضرورت مندوں کے لئے نہ صرف فکر مند رہتے تھے بلکہ حتی الامکان ان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ کیفی کو باغبانی کا بڑا شوق تھا جب بھی گھر آتے تو پیڑ پودے ضرور لگاتے۔ یہ ان کی باغبانی کے شوق کا نتیجہ ہی تھا کہ ان کی وفات بعد پھول پور (اعظم گڑھ) تحصیل کے سامنے " کیفی اعظمی پارک" بنوایا گیا۔ جس کی دوری ان کے گھر سے تقریباً ۴ کلومیٹر اور راقم کے گھر سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر ہوگی۔ کیفی کے نام سے " کیفیات ایکسپریس" نام کی ایک ٹرین بھی چلائی گئی ہے جو اعظم گڑھ سے لکھنؤ ہوتے ہوئے دِلّی کا راستہ طے کرتی ہے۔

سیّد اطہر حسین رضوی (کیفی اعظمی) گاؤں مجواں (میزواں) تحصیل پھول پور، ضلع اعظم گڑھ،

ریاست اتر پردیش میں ایک شیعہ زمیندار خاندان میں آنکھیں کھولیں۔اس بستی کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کی یہاں سبھی مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہنے کے علاوہ ایک دوسرے کا تہوار مشترکہ طور پر مناتے ہیں۔

کیفی کے دادا کا نام میر عطا حسین رضوی تھا۔ان کے تعلقات انگریزوں سے اچھے نہیں تھے یہ ایک سچے وطن پرست انسان تھے۔کیفی کے والد سیّد فتح حسین رضوی ایک تعلیم یافتہ اور روشن دماغ انسان تھے انھیں زمینداری اور کاشتکاری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔وہ یہ بات سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں زمینداری کا کوئی مستقبل نہیں ہے اس لئے انھوں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا۔لوگوں نے ان کے اس فیصلے پر شدید اعتراض کیا۔لیکن اس کے باوجود بھی وہ لکھنؤ چلے آئے اور انھیں جلد ہی تحصیلداری کی نوکری مل گئی۔اس کے بعد انھوں نے اپنی اہلیہ اور بچوں کو بھی لکھنؤ بلوالیا اور ان کی تعلیم پر خاص دھیان دینے لگے۔کیفی کی والدہ کا نام سیدہ حفیظ النساء عرف کنیز فاطمہ تھا۔سید فتح حسین اور کنیز فاطمہ کے کل گیارہ (۱۱) اولادیں ہوئیں جن میں پانچ بیٹیاں اور چھ بیٹے تھے۔آخر کے دو بیٹے جڑواں تھے جس میں سے ایک کا ایک سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔کیفی اعظمی تین بھائیوں اور چار بہنوں سے چھوٹے تھے اس لئے انھیں گھر میں بہت پیار ملتا تھا۔

کیفی کی تاریخِ ولادت کو لیکر لوگوں کے بیچ کافی اختلافات ہیں لیکن زیادہ تر لوگوں نے انکی ولادت ۱۹۱۸ء تحریر کی ہے اور سلطان المدارس کی ریکارڈ فائل میں بھی کیفی کی تاریخِ وِلادت ۱۵ را گست ۱۹۱۸ء درج ہے۔اس کے علاوہ سجاد ظہیر نے ۱۹۴۳ء میں کیفی کے مجموعہ کلام ''جھنکار'' کے دیباچے میں لکھا ہے۔

''کیفی ابھی نوجوان ہیں ان کی عمر اس وقت ۲۶ سال سے کم ہے''

سجاد ظہیر نے ۱۹۴۳ء میں کیفی کی عمر ۲۶ سال سے کم بتایا ہے یعنی کیفی ۲۵ ویں سال میں ہیں۔اس قیاس سے بھی کیفی کی سالِ ولادت ۱۹۱۸ء ہی نکلتی ہے۔لہٰذا ان کی تاریخ ولادت ۱۹۱۸ء ہی مان لینا چاہئے۔

کیفی کے والدین انھیں مولوی بنانا چاہتے تھے اور انھوں نے اس کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔لیکن اس کے برعکس کیفی انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ان کے بڑے بھائی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔کیفی کی کئی بڑی بہنیں ایک-ایک کر کے بیمار ہو کر انتقال کر گئی تھیں جس وجہ سے ان کے والد سوچنے لگے کہ خدا ہم کو اپنے سب لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کی سزا دے رہا ہے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر جائیں گے تو کوئی بیٹا فاتحہ بھی نہ پڑھے گا۔کیونکہ انگریزی اسکولوں میں فاتحہ پڑھنا سکھایا ہی نہیں جاتا۔اس لئے کیفی کے والدین نے مولوی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔اس کے لئے کیفی کو لکھنؤ کے شیعوں کے

مشہور مدرسہ سلطان المدارس میں داخل کرا دیا گیا لیکن وہ مولوی نہ بن سکے۔ شعر گوئی کا شوق انھیں پہلے سے ہی تھا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا اس شوق کو بہت راس آئی۔

کیفی اعظمی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر تو نہیں پڑھ سکے لیکن انھوں نے لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹی سے اردو، فارسی اور عربی کی چند اسناد حاصل کیں۔

ترقی پسندوں سے کیفی اعظمی کی ملاقاتیں ان کے طالب علمی کے زمانے میں ہی ہو چکی تھیں مختلف ترقی پسندوں کا سلطان المدارس میں آنا جانا تھا۔ چنانچہ کیفی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت حاصل کر لی۔

کیفی اعظمی کی ملاقات شوکت خانم سے اردو کے ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ شوکت خانم کا گھریلو نام ''موتی'' تھا۔ اسی کانفرنس میں ہی شوکت خانم اور کیفی دونوں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ دونوں کی شادی میں تھوڑا رُکاوٹ بھی آئی کیونکہ کیفی شیعہ تھے اور شوکت خانم سُنّی تھیں۔ شوکت خانم کے والد صاحب ایک روشن خیال انسان تھے اور ان کے سامنے صرف اپنی بیٹی کی مرضی تھی۔ وہ شوکت کو بمبئی لائے اور سجاد ظہیر کے گھر ٹھہرایا۔ اور کچھ دنوں بعد یعنی ۲۳ مئی ر ۱۹۴۷ء کو کیفی اور شوکت خانم کی شادی ہو گئی۔ اور ان سے تین اولادیں ہوئیں۔ ان کا پہلا بچہ ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوا یہ دور کیفی کی غربت کا دور تھا۔ کچھ مہینے بعد بچہ بیمار ہو گیا اور صحیح علاج نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔ اس بچے کے تقریباً ایک سال بعد ۱۸ ستمبر ر ۱۹۵۰ء کو ایک بچی پیدا ہوئی جو آج کی مشہور اداکارہ شبانہ اعظمی ہے جو کہ ایک سوشل ورکر بھی ہیں۔ مشہور ترقی پسند شاعر جان نثار اختر کے فرزند جاوید اختر شبانہ اعظمی کے شوہر ہیں۔ کیفی اعظمی کو بیٹی کے علاوہ ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام بابا اعظمی (احمر اعظمی) ہے۔

کیفی اعظمی اپنے گاؤں والوں سے اور وہاں کی مٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کو گاؤں میں آنا اور لوگوں سے ملنا جلنا کافی پسند تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ادوار میں وہ گاؤں میں زیادہ آنے لگے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان کو جب موقع ملتا تھا گاؤں ضرور آتے تھے۔ کیفی کی لاکھ کوششوں کے بعد جب پھولپور سے مجواں کے لئے سڑک بننے لگی تو گاؤں کے لوگوں کو اس پر شدید اعتراض ہوا اور ان لوگوں نے سڑک کا کام رکوا دیا۔ کیونکہ اس سڑک میں گاؤں والوں کے کھیت جا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کھیت ہی نہیں رہے گا تو ہم لوگ اناج کیسے اگائیں گے اور کھائیں گے کیا؟ خیر کیفی کو جب یہ بات پتہ چلی کی گاؤں والے سڑک نہیں بننے دے رہے ہیں تو وہ فوراً مجواں آ گئے اور لوگوں کو سمجھایا کی اس سے آپ ہی لوگوں کا فائدہ ہے۔ کیفی کے سمجھانے کے بعد گاؤں والے مان گئے اور سڑک مکمل ہو گئی۔

کیفی کی طبیعت انتقال کے دو ماہ پہلے مارچ- اپریل میں بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور ان کو

ISSN No. : 2395-2016

بمبئی کے جس لوک اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ پھیپھڑے خراب ہو جانے سے انھیں سانس لینے میں کافی مشکل ہو رہی تھی۔ کھانا پینا بھی بند ہو چکا تھا اس لئے کیفی کو آئی۔سی۔یو میں رکھا گیا۔ ٹھیک ہونے کے بعد وہ اپنے گاؤں مجواں آنا چاہتے تھے اور گاؤں کی ترقی کے لئے کچھ اور کام کرنا چاہتے تھے۔ لیکن زندگی پر انسان کا کہاں بس چلتا ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ آخر کار ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء بروز جمع کو دل کا دورہ پڑا اور صبح چھ بج کر چالیس منٹ پر وہ ۸۴ برس کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اپنے گاؤں کے لئے کچھ اور کرنے کی ان کی خواہش دھری کی دھری رہ گئیں۔ کیفی اعظمی کے انتقال کے بعد پروفیسر علی احمد فاطمی کے ایک خط کے جواب میں بیگم سلطانہ جعفری لکھتی ہیں:۔

''سب سے زیادہ دکھ تو یہ ہے کہ ایک ایک کر کے خاندان کا فرد رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ کیفی کا جانا لگتا ہے جیسے آخری ستون بھی ٹوٹ گیا ۵۵ سال کا ساتھ تھا۔ کرشن چندر نے ایسی پہل کی کہ تانتا بندھ گیا۔ کیفی سب سے چھوٹے تھے تو آخری نمبر ان کا تھا لیکن جاتے جاتے اپنے گاؤں مجواں کو نئی زندگی دے گئے......''[۲]

اپنے شروعاتی عہد میں کیفی نے رومانی مزاج کی بھی نظمیں کہی ہیں لیکن اس رومان کا تعلق حسن وعشق سے کم ہی ہے۔ فطرت یا آزادی سے زیادہ ہے۔ صبح وطن، بانسری کا سہرا، کہرے کا کھیت وغیرہ۔ قدرت سے ان کے بے پناہ پیار اور قرابت کا ثبوت دیتی ہیں۔

کیفی اعظمی کی نظموں کے عنوان سے ہی ان کے مزاج وموضوعات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیفی کی کچھ نظموں کے عنوانات درج ذیل ہیں جس سے ہم ان کی سوچ وفکر اور ذہنیت کی پرکھ کر سکتے ہیں۔ ''آخری جنگ''، ''آخری امتحان''، ''دھواں''، ''ماحول''، ''صبح وطن''، ''بے کار مزدور''، ''نئی صبح''، ''جیل کے در پر''، ''بیوہ کی خودکشی''، ''عورت'' وغیرہ۔

کیفی اعظمی کی ایک مشہور نظم ''ماحول'' ہے جو کہ پوری طرح سے غزل کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے ہمیں یہ پتہ چل جائے گا کی انہوں نے عشقیہ وغزلیہ شاعری کیوں نہیں کی۔ کیفی کی یہ نظم مجموعہ کلام ''جھنکار'' میں شامل ہے۔ نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

طبیعت جبریہ تسکین سے گھبرائی جاتی ہے
ہنسوں کیسے ہنسی کمبخت تو مرجھائی جاتی ہے

بہت چمکا رہا ہوں خال و خط کو سعی رنگیں سے
مگر پژمردگی سی خال وخط پر چھائی جاتی ہے

جوانی چھیڑتی ہے لاکھ خوابیدہ تمنا کو
تمنا ہے کہ اس کو نیند ہی سی آئی جاتی ہے

مرے مطرب نہ دے للہ مجھ کو دعوت نغمہ
کہیں سازِ غلامی پرغزل بھی گائی جاتی ہے

قیام لکھنؤ کے دوران ترقی پسندوں سے کیفی کے تعلقات قائم ہو چکے تھے جن میں علی عباس حسینی، سید احتشام حسین، سجاد ظہیر، اعظم حسین اور علی سردار جعفری وغیرہ شامل ہیں۔قیامِ کانپور کے احبابوں میں خلیل الرّب، قاضی جلیل عباسی، سید محمد مہدی، مونس رضا اور سنت سنگھ یوسف شامل تھے۔اس کے بعد جب کیفی اعظمی بمبئ پہونچے تو وہاں کی فضا ہی کچھ اور تھی سجاد ظہیر، سبط حسن، سردار جعفری، پی-سی- جوشی اور کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے ممتاز کارکنوں نے کھلے آغوش سے کیفی کو گلے لگایا۔چونکہ کیفی اعظمی کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی رکن ہو گئے تھے اور کمیون میں ہی رہتے تھے۔اس لئے یہاں انھیں ہندوستانی تہذیب اور ادب کی عظیم ترین ہستیوں سے ملنے کا موقع ملا جو ملک کے الگ- الگ گوشے سے تھے۔جن کے چند اہم نام یہ ہیں۔

جوشؔ، سمتر آنند پنت، ونے تول، ماما وریکر، اودے شنکر، کے-ایل-سہگل اور پرتھوی راج کپور وغیرہ۔

کیفی اعظمی کی ایک اہم نظم ''تربیت'' ہے جس میں ایک پولیس افسر جو انگریزی حکومت کا ایک اہم ستون ہے مگر اپنے بیٹے کی تربیت انقلابی خیالات سے کرتا ہے اور کہتا ہے۔

سن کر اب جاگی ہوئی تحریک سو سکتی نہیں
جو سہولت باپ کو تھی تجھ کو ہو سکتی نہیں
لٹنے والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں، دفتروں، تھانوں میں آگ

مٹنے ہی والا ہے خوں آشام دیوزر کا راج
آنے ہی والا ہے ٹھوکر میں الٹ کر سر سے تاج

کیفی اعظمی کے مجموعہ کلام ''سرمایہ'' (۱۹۹۴ء) میں ایک نظم ''ابن مریم'' ہے جو بہت ہی مقبول ہوئی۔اس نظم میں زندگی کی صناعی کے گہرے تاثر اور رنگ کے ساتھ اس کا بدنما رخ بھی نمایاں ہے۔کیفی اعظمی اپنے مجموعہ کلام ''آوارہ سجدے'' میں ایک محب وطن شاعر نظر آتے ہیں ایک ایسا محبّ وطن

شاعر جس کی نظیر مشکل سے مل سکے گی۔ نہرو کے بارے میں کیفی کا کہنا ہے کہ....

جب بھی دیکھا اسے مجھ کو تنہا ملا

شاعر کی فکر و نظر کی گہرائی کی دلیل ہے۔ نہرو اپنے گرد و پیش کے فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کے ماحول سے بیزار تھے۔ لیکن اسی فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کے ماحول کے ساتھ انھیں اپنا وقت بسر کرنا پڑا۔ نہرو کی قصیدہ خوانی تو ہندوستان کے اکثر شعراء نے کی ہے لیکن ان کی اس قید قفس سے ملتی جلتی تنہائی کی جانب صرف کیفی اعظمی کی نظر گئی۔

بقول جگن ناتھ آزاد:۔

"کیفی کی شاعری کسی ایک فارمولے کی پابند نہیں ہے اس کی نگاہ ماضی پر بھی ہے، حال پر بھی اور مستقبل پر بھی۔ غم جاناں بھی اس کا موضوع ہے، غم ذات بھی اور غم دوراں بھی۔ اُس کی شاعری انسان کے امکانات سے لبریز ہے اور انسان کی ان مجبوریوں کے ذکر سے بھی جو خود انسان نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں۔"

اس عہد میں ترقی پسند شاعروں میں تقریباً ہر ایک نے "عورت" پر ہو رہے ظلم و زیادتی کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ساتھ ہی "عورت" کی عظمت اور اس کے وقار کو پیش کیا۔ اسی طرح کی "عورت" کیفی اعظمی کے بھی اشعار کا حصہ بنی۔ کیفی نے یہ نظم عنوان "عورت" سے تخلیق کی جوان کے مجموعہ کلام "جھنکار" اور "سرمایہ" دونوں میں شامل ہے۔

کیفی کی ایک نظم "بیوہ کی خودکشی" ہے۔ یہ نظم بھی کیفی کے مجموعہ کلام "جھنکار" اور "سرمایہ" دونوں میں شامل ہے۔ کیفی نے اپنی اس نظم میں عورت کے بیوہ ہو جانے کے بعد کے سارے پہلو کو بہت ہی جزباتی طریقے سے پیش کیا ہے۔ اپنے اس معاشرے میں بیوہ عورتوں کے ساتھ کس طرح کا جبر و استبداد وسلوک کیا جاتا ہے اس کا اندازہ ہمیں اس نظم سے بخوبی ملتا ہے۔ ایک ایسی بیوہ جس کی بیٹیاں جوان ہیں، جس پر ساس نند کا جبر ہوتا ہے یہ ساری پریشانیاں ہمارے معاشرے میں اس لئے منہ بائے کھڑی رہتی ہیں کیونکہ ہمارے ملک کے ہندو مذہب میں عورت کے بیوہ ہو جانے کے بعد دوسری شادی کا حق نہیں۔ اگر کوئی عورت یہ قدم اٹھا بھی لے تو تا حیات اسے طعنہ دیا جاتا ہے، عیب لگایا جاتا ہے اور بدنام و رُسوا کیا جاتا ہے۔ یہ نظم کھلی تہذیب اور نام نہاد کلچر پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ ویسے تو یہ نظم "بیوہ کی خودکشی" ۳۵ شعروں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ اندھیری رات یہ ساری فضا سوئی ہوئی
پتی پتی منظرِ خاموش میں کھوئی ہوئی

چاہتی لاکھ قابو دل پہ پاتی ہی نہیں
زخم خوردہ نو جوانی بس میں آتی ہی نہیں
جب کھنک اُٹھتی ہے سوتی لڑکیوں کی چوڑیاں
آہ بن کر اُٹھنے لگتا ہے کلیجے سے دھواں
آرہے ہیں یاد پیہم ساس نندوں کے سلوک
پھٹ رہا ہے غم سے سینہ اُٹھ رہی ہے دل سے ہوک
دل تڑپ کر کہہ رہا ہے جلد اس دنیا کو چھوڑ
چو ڑیاں توڑیں تو پھر زنجیر ہستی کو بھی توڑ
دل انھیں باتوں میں الجھا تھا کہ دل گھبرا گیا
ہاتھ لیکر زہر کی شیشی لبوں تک آگیا
آنکھ جھپکی ،اشک ٹپکا، ہچکی آئی کھو گئی
موت کے آغوش میں اک آہ بھر کر سوگئی

کیفی اعظمی کو غریبوں، بے کسوں، ناداروں اور مزدوروں سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے چاہے وہ کسی بھی دور میں رہے ہوں۔ کیفی اعظمی کی ایک نظم '' بے کار مزدور '' (سرمایہ داروں کی نظر میں) ہے۔ یہ نظم کیفی کے مجموعہ کلام '' جھنکار'' اور ''سرمایہ '' دونوں میں شامل ہے۔ا کیفی اعظمی اس فرقہ وارانہ ذہنیت کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں جس سے معاشرہ ومختلف طبقوں میں نفرت کا بیج بویا جائے۔ کیفی اعظمی قومی یکجہتی کے قائل ہیں اور اپنے قلم سے ہمیشہ اسے تقویت بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تخلیقی سفر میں ہر اس موضوع پر قلم اٹھایا جو قومی یکجہتی سے تعلق رکھتا ہو۔ ہمارے ملک میں بابری مسجد کو شہید کر کے رام مندر بنانے کی کوشش کا واقعہ انتہائی فرقہ وارانہ فسادات کا باعث بنا ہوا ہے۔ آج کل تو آئے دن رام مندر کو لیکر لیڈروں کے کچھ نہ کچھ بیانات آتے رہتے ہیں۔ کیفی نے اس موضوع پر ایک نظم تخلیق کی۔ اور اس کا عنوان رکھا'' دوسرا بن باس ''۔ یہ نظم اپنے عہد کی بہت ہی مشہور و معروف نظم ہے اس نظم کو کیفی نے کئی مشاعرے میں بھی پڑھا ہے اور لوگوں سے خوب داد ملی ہے۔ اس نظم میں کیفی اعظمی نے مسجد کو شہید کرنے والے سے خود کچھ کہنے کی بجائے سری رام کی زبانی وہ ساری باتیں کہہ دی جو ہر قومی یکجہتی پسند دل کی آواز ہے۔ کیفی اعظمی نے اس سُلگتے موضوع کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

شوبی زہرانقوی (ریسرچ اسکالر)
چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی (میرٹھ)

ادب اطفال کے معمار: اسماعیل میرٹھی

(نظم کے حوالے سے)

کسی بھی ملک کے بچے اپنے ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں کیونکہ ملک کے مستقبل کا انحصار انھیں نونہالوں کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ اسی لیے کوشش کی جانی چاہیے کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے بچوں کے کردار کی تشکیل اور تعمیر صحیح سمتوں میں ہو۔ جب بچہ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر تعلیم گاہ میں قدم رکھتا ہے تو ممکن ہو کہ اس کی ذہنی بالیدگی اور جذباتی آسودگی میں نصابی کتابیں تربیت کے اعلیٰ فرائض انجام دیں، تاکہ وہ باشعور اور اچھا انسان بن سکے۔

ادب اطفال کے مدِ نظر جب ہم اردو ادب پر نظرثانی کرتے ہیں تو ہمیں کچھ مایوس کن نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ ایک مدت تک ادب اطفال کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی گئی بلکہ اس کی انفرادی حیثیت کو عموماً نظرانداز کیا جاتا رہا۔ تقریباً انیسویں صدی کے آخری ربع تک ادب اطفال کے لیے کوئی معقول نصابی ادب دستیاب نہ تھا۔ ہاں 1800ء میں قائم کردہ فورٹ ولیم کالج میں غیرملکی عملہ اور حکام کو اردو پڑھانے کی غرض سے کچھ نصابی کتابیں تحریر کی گئیں، اور پھر 1824ء میں دلی کالج میں نصابی کتابیں تیار ہوئیں، مگر یہ کتابیں سماجی اور سائنسی علوم کے لیے تھی اگرچہ ان میں کچھ ادب سے متعلق بھی تھیں مگر یہ ہندوستانی طلباء کے لیے نہیں لکھی گئیں۔

انیسویں صدی میں لیکن جب ملک انگریزی اقتدار میں آ گیا اور ہر ایک شے میں تغیر رونما ہوا۔ انگریزی کے ذریعے ادب نو کی تشکیل کا رجحان پیدا ہوا، سائنس اور علم نفسیات نے تیزی کے ساتھ ترقی کی، جدید سائنسی ایجادات سامنے آئیں اور سرسید نے ادب کو عام فہم اور افادی بنانے کی تحریک چلائی۔ تو اس وقت بچے کے احساسات، جذبات اور نفسیاتی رجحانات کی طرف بھی توجہ مبذول کی جانے لگی، اور ادب اطفال کی سماج میں ایک حیثیت مستحکم ہوئی۔ اس وقت ادبِ اطفال اس ادب کو کہا گیا جو تفریح وطبع اور درس وتدریس کے علاوہ بچے کی ذہنی نشوونما کے فرائض بھی انجام دے۔ اس دور میں بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے شعراء وادباء میں حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ، پیارے لال آشوب، چکبست لکھنوی،

علامہ اقبال، سرور جہاں آبادی اور تلوک چند محروم وغیرہ نام اہم ہیں۔ان تمام ادیب وشعراء نے بچوں سے متعلق مفید نظموں اور کہانیوں کی تخلیق کی، مگر کسی کا بھی مقصد نصابی ادب تیار کرنا نہیں تھا۔اس دور میں محمد حسین آزاداور مولوی اسماعیل میرٹھی دو ایسی شخصیتیں تھیں، جنھوں نے بچوں کے نصاب پر خاص طور پر توجہ دی۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ پہلے محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے کہنے پر ادبِ اطفال تخلیق کیا، مگر بقول سیفی پریمی

''اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کو نصابی کتابیں مرتب کرنے میں اولیت حاصل ہے۔مگراس کا دائرہ اثر پنجاب تک محدود رہا نیز ان کی تحریر میں وہ بات پیدا نہیں ہوئی جو تعلیمی نقطۂ نظر اور بچوں کی نفسیات کو سمجھ لینے سے آتی ہے۔''

(اسماعیل میرٹھی حیات وخدمات، سیفی پریمی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی اکتوبر 1976ء ص 320)

محمد حسین آزاد کے بعد اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے ادب پر خاص توجہ مرکوز کی، اور اپنے سے پہلے، ہمعصر اور بعد میں لکھنے والوں پر فوقیت حاصل کرلی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ دوسرے شعراء وادیب دیگر میدانوں میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر بچوں کے لیے بھی کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔مگر اسماعیل میرٹھی اردو کے وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے باقاعدہ طور پر اور خصوصیت کے ساتھ بچوں کا ادب ہی تخلیق کیا اور بچوں کے اسماعیل کے نام سے مشہور ہوگئے۔آج بھی اگر اردو میں بچوں کے ادیب وشاعر کا نام پوچھا جاتا ہے تو بے تحاشہ اسماعیل میرٹھی کا نام ہی زبان سے ادا ہوتا ہے۔پروفیسر مظفر حنفی اپنے تحقیق وتنقیدی مضمون ''اردو میں ادبِ اطفال'' میں اسماعیل میرٹھی کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

''شعراء اور ادباء کی اس جماعت میں کسی فرد واحد کو خالصتاً بچوں کا ادیب یا شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا۔تمام افراد کے ساتھ صورتِ حال یہ تھی کہ وہ دیگر ادبی میدانوں میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر بچوں کے لیے بھی کچھ لکھ لیتے تھے۔اب ادب اطفال کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسا قلم کار سامنے آیا جس نے بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ایسی شہرت حاصل کی کہ اس کی دوسری تصانیف ثانوی حیثیت اختیار کرگئیں۔میرا خیال ہے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام بیسویں صدی کے لکھنے والوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے تاحال بچوں کے ادب میں بڑا نام ہے حالانکہ ان کی بیشتر تخلیقات کا تعلق 19 ویں صدی سے ہے''

(جہات وجستجو، پروفیسر مظفر حنفی، لبری آرٹس پریس، دریا گنج نئی دہلی، 1982ء ص 87)

مولوی اسماعیل میرٹھی نے اپنے شاعرانہ سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور پھر قصیدہ، رباعی، مثنوی اور

ISSN No. : 2395-2016

قطعات، وغیرہ سبھی کچھ لکھے مگر جب انھوں نے قلق میرٹھی کی ترجمہ کیں ہوئیں نظموں ''جواہر منظوم'' کو پڑھا تو ان کا رجحان غزل جو اس وقت روایتی طور پر لکھی جارہی تھی اور اس میں عشق ومحبت کی فراوانی تھی سے ہٹ کر نظم کی طرف راغب ہوگیا۔ وہ ان ترجموں کو دیکھ کر حیران ہوئے، بقول ان کے صاحبزادے اسلم سیفی کے

''مولانا فرمایا کرتے تھے اس ترجمے کو دیکھ کر استعجاب ہوا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں ایک طرف دوراز کار حیرت انگیز مبالغہ جو غزل اور قصیدے کی جان سمجھا جاتا تھا ادھر اس ترجمے کا مطالعہ ایک امر اتفاق تھا جس نے مولانا کی طبیعت کا رخ بالکل بدل دیا، اس ترجمے کو دیکھ کر بعض انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا۔ یہ نظمیں کلیات میں موجود ہیں آئندہ کے کلام کی بنیاد اس نئے انداز پر رکھی''

(حیاتِ کلیات اسماعیل، اسلم سیفی، دیال پرنٹنگ پریس 1939ء ص15)

اس طرح مولوی اسماعیل میرٹھی قلق میرٹھی کی ہم نشینی میں غزل کو ترک کرکے نظم کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے ابتداء میں چھ منظوم تراجم کیے جن میں ''کیڑا'' (1867ء) ''ایک قانع مفلس'' (1867ء) ''موت کی گھڑی'' (1867ء) ''فادر ولیم'' (1867ء) ''حب وطن'' (1868ء) اور ''انسان کی خام خیالی'' (1868ء) ہیں۔ ان منظوم تراجم میں بھی انھوں نے بچوں کے جذبات اور خیالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی نظموں کے ترجمے کیے جن میں نہ صرف بچوں کی دلچسپی کا سامان موجود ہے بلکہ یہ ان کے سن وسال اور مذاق ومزاج سے مطابقت وموافقت بھی رکھتی ہیں۔ ان منظوم ترجموں کے ذریعے سے انھوں نے نصیحت، اخلاق کی درستی اور حب الوطنی جیسے موضوعات کو پیش کیا۔ پہلی نظم ''کیڑا'' میں وہ مور اور کیڑے کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مور جو کہ اک خوبصورت جانور ہے اور رجس کو ناچتے دیکھ کر تم خوش ہوتے ہو اسی طرح کیڑا بھی ایک جاندار ہے جس کو مارنے پر تکلیف ہوتی ہے۔ غرض کہ اس نظم کے ذریعے وہ بچوں کو رحم دل اور ہمدردی کا سبق دیتے ہیں۔ نظم ''کیڑا'' کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

تم اس کیڑے کو دیکھو تو لگاتار ۔۔۔ تمہاری راہ میں ہے گرم رفتار
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے ۔۔۔ سویرے اٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
جو دیکھو ناچ اس کا دور ہی سے ۔۔۔ کہ خوش ہوتے ہو اس کو دیکھ کر تم
مگر کیڑے کو بھی سمجھو نہ ہیٹا ۔۔۔ یہ مانا خاک مٹی میں ہے لیٹا
کہ ہے دونوں سے دانا سیکھ سکتا ۔۔۔ نمونے دو ہیں کاریگر ہے یکتا
بظاہر کچھ نہیں اس کی حقیقت ۔۔۔ مگر جب کرتے ہو اس کی بری گت

ISSN No. : 2395-2016

تو ہے ننھی سی جاں اس کی تڑپتی ہے تم جیسا ہی اک جاندار وہ بھی

مولوی اسماعیل میرٹھی نے تراجم سے زیادہ طبع زاد نظمیں قلمبند کیں ان کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بامقصد ادب تخلیق کرتے تھے اور اسی لیے ہمیشہ اپنے پیش نظر نصیحتی اور تعلیمی پہلو رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں نصیحت آموز اور اخلاقی درستی کا ذریعہ ہیں اور ان پہلوؤں کو پیش کرنے میں انھوں نے سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے یہاں تک کی جب ان کی سادہ زبان میں موضوعاتی نظمیں اخبارات میں شائع ہوئیں تو پنجاب کے بعض نصاب میں ان کو شامل کرلیا گیا۔ علاوہ ازیں اسماعیل میرٹھی کو آگرہ، اودھ اور بہار کے محکمہ تعلیم کی جانب سے نصابی کتابیں تیار کرنے پر مامور کیا گیا۔ پہلی مرتبہ ان کی نصابی کتابیں ستمبر 1895ء میں شائع ہوئیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ 1958 تک اس کے 92 ایڈیشن شائع ہوئے۔ ان کے نصابی سلسلۂ کتب کی پانچ جلدیں ہیں جن میں کچھ تحریریں ان کے معاصرین کی بھی ہیں مگر زیادہ ان کی نظمیں، مضامین اور کہانیاں موجود ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی نصابی کتابوں کو دیکھ کر ہی کہا تھا۔

''سرسید تحریک نے عقلیت پسندی اور ذہنی بیداری کی جو فضا پیدا کی تھی اس میں بڑوں کی باتیں بڑوں کے لہجے میں کرنے والے تو بہت تھے۔ بچوں کے لہجہ میں سامنے کی باتیں کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پنجاب میں کرنل ہالرائڈ کی حوصلہ افزائی سے محمد حسین آزاد نے کتابیں تیار کیں، تو ادھر صوبجات متحدہ، آگرہ واودھ میں اسماعیل میرٹھی نے اردو کا پہلا قاعدہ اور پہلے سے پانچویں درجہ تک کی کتابیں تصنیف کیں۔ تب سے اب تک ان کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوخیز ذہنوں کی آبیاری میں ان کتابوں سے مدد ملی ہوگی''

(اسماعیل میرٹھی حیات وخدمات، سیفی پریمی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی اکتوبر 1976ء ص 5-6)

بچوں کے لیے تحریر کیں گئیں ان کتابوں میں نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ نظمیں چونکہ نوخیز بچوں کی آبیاری اور ان کی نشو ونما کا سامان مہیا کرتی ہیں اسی لیے ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہیں، تاکہ بات آسانی سے سمجھ آجائے انھوں نے متعدد نظموں میں دلچسپ اور سبق آموز حکایات پرکشش اسلوب میں منظوم کردی ہیں جن میں چند کے عنوانات ہیں ''ایک گدھا شیر بنا تھا'' ''ناقدردانی'' ''ملمع کی انگوٹھی'' ''ایک لڑکا اور بیر'' ''ایک پودھا اور گھاس'' ''کتا اور اس کی پرچھائیں'' ''چھوٹی چیونٹی'' ''ایک گھوڑا اور سایہ'' ''بچہ اور ماں'' ماں اور بچہ'' وغیرہ اخلاقی درستی کے لیے لکھیں گئیں اچھی نظمیں ہیں۔ ''ایک گدھا شیر بنا تھا'' اس میں انھوں نے نقل اور بناوٹ کی ذلت کی خامیوں کو پیش کیا ہے، ''کتا اور پرچھائیں'' میں لالچ کی بری بلا کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جتنا ہو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے، ''ایک گھوڑا اور سایہ'' میں انسان

پر طنز کرتے ہوئے اس کے وہمی مزاج اور دوسروں پر بلا وجہ شک کرنے کو موضوع بنایا ہے ''ناقدردانی'' میں جہالت اور علم کا موازنہ کیا ہے ''چھوٹی چیونٹی'' میں محنت اور ہمت کی اہمیت کو واضح کیا ہے ''ملمع کی انگوٹھی'' میں اصل اور نقل میں فرق بتایا گیا ہے اور ''بچہ اور ماں'' ''ماں اور بچہ'' میں محبت و شفقت کے پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک ''گدھا شیر بنا تھا'' کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

پایا تھا اک گدھے نے کہیں پوستین شیر — سوچا کہ آڑ خوب ہے کچھ کھیلے شکار
پہنا اور آس پاس کے کھیتوں میں جا گھسا — دیکھا جو شیر سہم گئے اس سے کاشتکار
اتنے میں اپنی بولی جو بولا تو کھل گیا — ہے شیر کے لباس میں پوشیدہ ایک حمار
جب کھل گیا قریب تو پھر مارے طیش کے — لے کے اپنی لاٹھیاں سب پل پڑے گنوار
بچو سدا تکلف و ناراستی سے تم — کرتا ہے آدمی کو یہ شیوہ ذلیل و خوار
جو بات تھی صلاح کی وہ، ہم نے بتادی — آئندہ اپنے فعل کا ہے تم کو اختیار

ایک اور نصیحت آموز نظم ملاحظہ کریں

ہے کام کے وقت کام اچھا — اور کھیل کے وقت کھیل اچھا
جب کام کا وقت ہو تو کرو کام — بھولے سے بھی کھیل کا نہ لو نام
ہاں کھیل کے وقت خوب کھیلو — کودو پھاندو کہ ڈنڈ پیلو
خوش رہنے کا ہے یہی طریقہ — ہر بات کا سیکھو سلیقہ

اسماعیل میرٹھی کی نہ صرف نظمیں بلکہ ایک ایک شعر زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتے ہیں ان کے ایسے شعر آج کلاسیکی کا درجہ اختیار کر چکے ہیں جن میں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی سبق ہے۔

بد کی صحبت میں نہ بیٹھو بد کا ہے انجام برا — بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں — ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں
سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ — ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ
ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر — تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

بچوں کی اخلاقی درستی کے لیے انھوں نے ادب کا سبق پڑھایا، ادب کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے یہ اشعار کہے ہیں جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

ادب سے ہی انسان انسان ہے — ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے
جہاں میں ہو پیارا نہ کیوں کر ادب — کہ ہے آدمیت کا زیور ادب
نہ ہو جس کو اچھے برے کی تمیز — نہ وہ گھر میں پیارا نہ باہر عزیز

بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب یہ سچ بات ہے بے ادب بے نصیب

اسماعیل میرٹھی نے اس وقت روش عام سے ہٹ کر اپنی راہ خود متعین کی، وہ جانتے تھے کہ بچوں کے ذہن تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے اسی لیے حالی نے جہاں اپنی نظموں کے ذریعے نوجوانوں کے ذہن کی آبیاری کا کام انجام دیا وہیں اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے تعلق سے ایسی نایاب نظمیں کہیں جن کی نظیر آج بھی نہیں ملتی۔ان کی بعض نظموں میں محبت وطن کا جذبہ کارفرما ہے۔محبت وطن اور قومی یکجہتی سے معمور نظموں میں ''ہماری گائے''،''کوہ ہمالہ''،''بارش کا پہلا قطرہ''اور''ہندوستان کے پھول''وغیرہ اہم ہیں۔ان نظموں میں جہاں وطن پرستی کا جذبہ ہے وہیں بھائی چارے کا درس بھی ہے''ہماری گائے''قومی یکجہتی کے طور پر''کوہِ ہمالہ''وطن پرستی اور''بارش کا پہلا قطرہ''ایکتا کو پیش کرتا ہے۔نظم''بارش کا پہلا قطرہ''قوم میں حوصلہ مندی اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے فطری نظمیں بھی لکھیں ہیں۔جن میں قدرت کے حسین کاری گری کو پیش کیا گیا ہے۔فطرت کی خوبصورتی ہر کسی کو متاثر کرتی ہے۔بچے بھی اس خوبصورت نظارے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔فطرت کے نظارے کو پیش کرتے ہوئے ان کی نظمیں''برسات''،''تاروں بھری رات''،''ٹھنڈی ہوا''،''ساون کی جھڑی''،''ہوا''،''جاڑا اور گرمی''وغیرہ اہم ہیں ان نظموں میں تشبیہہ اور استعاروں کا حسن داد طلب ہے۔ان نظموں سے فطرت کی کارفرمائی تو سامنے آتی ہے ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی موسم وفضا بھی ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔نظم''ٹھنڈی ہوا''کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی سویا ہوا تھا سبزہ اسے تو جگا چلی
سرسبز ہوں درخت نہ باغوں میں تجھ بغیر تیرے ہی دم قدم سے ہے بھاتی چمن کی سیر
پڑ جائے اس جہاں میں ہوا کی اگر کمی چوچا یہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی

چرند اور پرند ہمیشہ سے ہی بچوں کی دلچسپی کا محور رہے ہیں۔اسماعیل میرٹھی نے ان عام فہم شے کو لے کر بہت سی نظمیں بچوں کے لیے قلمبند کیں۔یہ نظمیں ان کی ہمدرد، نیک دل اور ذہنی بیداری کا پتہ دیتی ہیں۔عام طور پر کچھ چرند پرند ہمارے گھروں میں موجود ہوتے ہیں۔جن سے ہمارا تعلق ہمدردانہ ہوتا ہے ان کا بیان اسماعیل میرٹھی نے مقامی رنگ اور گھریلو زندگی سے منسلک کر کے اتنے موثر طریقے سے پیش کیا ہے جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بھی نہیں ملتی۔ان کی اس طرح کی نظموں میں''ایک جگنو اور بچہ''،''اسلم کی بلی''،''ہمارا کتا ٹیپو''،''دو مکھیاں''،''مور اور کلنگ''،''کچھوا اور خرگوش''،''اونٹ''،''کوا''،''عجیب

ISSN No. : 2395-2016

چڑیا'' اور'' چھوٹی چیونٹی'' وغیرہ اہم ہیں۔ ان نظموں میں چرند اور پرند کا بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے ۔جس سے بچوں کی دلچسپی برقرار رہے ۔نظم'' ایک جگنو اور بچہ'' میں جگنو اور بچے کی مکالماتی گفتگو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی تمام نظمیں سبق آمیز ہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد ہی بچوں کی تعلیم و تربیت تھا۔ جس کے لیے وہ تاعمر کمربستہ رہے۔ موخر الذکر نظموں کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے اور بھی نظمیں لکھیں، جن میں'' پن چکی''،'' ریل گاڑی''،'' دال کی فریاد''،'' دال چپاتی''،'' نصیحت کی باتیں'' اور'' کاشتکاری'' وغیرہ ۔ یہ نظمیں نہایت دلچسپ ہیں،'' پن چکی'' اور'' دال کی فریاد'' میں بلا کی جاذبیت اور ندرت کا مظاہرہ کیا ہے۔'' دال کی فریاد'' مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہوئی ایک مکالماتی نظم ہے اور'' پن چکی'' منظر عام پر حرکت و عمل کا نمونہ بن کر سامنے آئی۔ جس سے بچے اور بڑے دونوں سبق لے سکتے ہیں۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی — دھن کی پوری ہے کام کی پکی
پینے میں نہیں لگی کچھ دیر — تو نے جھٹ پٹ لگا دیا ڈھیر
ختم تیرا سفر نہیں ہوتا — نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا
کیا تجھے چین ہی نہیں آتا — کام جب تک نبڑ نہیں جاتا
مینہ برستا ہو یا چلے آندھی — تو نے چلنے کی شرط ہے باندھی

ان تمام نظموں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسماعیل میرٹھی ماہر نفسیات تھے۔ جو بچوں کی فطرت کو بخوبی پہچانتے تھے ان میں مشاہدے کی قوت کے ساتھ ساتھ الفاظ اور بیانیہ کی خوبی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے جس طرح کی نظمیں لکھیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے لیے ایسی نظمیں ابھی تک اردو ادب میں تخلیق نہیں ہوئیں۔ ان نظموں میں قوت متخیلہ کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں اور جذبات کی فراوانی کی عمدہ مثالیں بھی۔

یہاں میں نے اسماعیل میرٹھی کو محض بچوں کے شاعر کی حیثیت سے قلمبند کیا ہے جو ان کی زندگی کا ایک روشن پہلو ہے، وگرنہ وہ ایک جامع صفات انسان تھے اور ان کی شخصیت پہلو دار تھی، بیک وقت وہ ایک مصلح قوم، مفکر عالم، تعلیم کے پروردہ، ادب کے خدمت گزار اور روشن خیال انسان تھے انھوں نے تمام عمر اردو ادب کی خدمت کی اور تعلیم کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ مگر اردو داں طبقے نے انھیں آج بچوں کے اسماعیل تک ہی محدود کر دیا ہے۔ ورنہ وہ ایک اچھے نثر نگار اور نقاد تھے۔ جن کا ہم سر ان کے زمانے میں علامہ شبلی نعمانی کے سوائے کوئی نہ تھا۔

ISSN No. : 2395-2016

فرح نازنین
ریسرچ اسکالر، پٹنہ یونیورسٹی

رضا نقوی واہی: شخصیت اور شاعری

اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں رضا نقوی واہی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ انگریزی مزاحیہ ادب کی طرح اردو میں بھی مزاحیہ ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ جس کی پہلی کڑی جعفر زٹلی کو تسلیم کیا جاتا ہے واہی کے بارے میں کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں کوئی اور طنز نگار یا مزاح نگار واہی کے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار رضا نقوی واہی کے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی نے بھی اپنی ایک کتاب میں کیا ہے:

> ''بہر طور واہی کسی کی پیروی کیوں کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی دنیا خود بسائی اور یہ بھری پری دنیا ان کے نقطۂ نظر سے تضادات سے پر ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ طنز و مزاح ایک سنجیدہ طنز و مزاح ایک سنجیدہ عمل ہے۔ اور اگر شاعر کا دل حساس اور ملتہب ہوا اور اس فن شعر کے رموز سے آگاہی ہو تو زندہ اور جاوداں شاعری کی تخلیق کر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکبرالہ آبادی کے بعد وہ طنز و مزاح کے سب سے اہم شاعر ہیں۔''(۱)

رضا نقوی واہی کی ولادت بہار کی ایک مردم خیز بستی کھجوہ ضلع سارن (موجودہ سیوان) میں ۱۷ جنوری ۱۹۱۴ء کو ہوئی۔ واہی اپنے والدین کی تنہا اولاد ہونے کی وجہ سے بڑے ناز و نعم سے پروان چڑھے۔ ان کے والدین نے متعدد بار مشرق وسطی کا سفر کیا۔ عہد طفولیت میں واہی صاحب بھی اپنے والدین کے ہمراہ مشرق وسطی کا سفر کر کے کئی مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جب سن بلوغ کو پہنچے اور تعلیم سے فراغت حاصل ہوئی تو ان کی شادی ۱۹۳۸ء میں سیوان ضلع کے موضع بگھونی میں عنایت حسین کی صاحب زادی شاکرہ خاتون سے ہوئی۔ ان کے بطن سے پانچ لڑکے سید علی رضا نقوی، سید احسن رضا نقوی، سی دعلی رض انقوی، سید حسن رضا نقوی، سید عابد رضا نقوی، سید جعفر رضا نقوی اور سید موسیٰ رضا نقوی پیدا ہوئے اور لڑکیوں میں رضیہ فاطمہ، نیز عظیم فاطمہ ہیں، ان میں سے سید موسیٰ

رضا نقوی کو چھوڑ سبھی بقید حیات ہیں۔اور صاحب اولاد ہیں۔
رضا نقوی واہی کا تعلق ایک علم دوست اور ذی وقار خانوادے سے ہے۔ان کا سلسلہ نسب حضرت امام علی نقی سے ملتا ہے۔اسی مناسبت سے ان کا خانوادہ اپنے نام کے ساتھ نقوی لکھتا ہے۔ان کے آباو اجداد ایران سے ہندوستان آئے۔سید قابل علی واہی کے جد اعلیٰ تھے۔ان کے دادا کے والد سید بندہ علی جو سید نجف ہوئے تھے سید بندہ علی کو اللہ نے اولاد سے نوازا، جن میں ایک واہی صاحب کے دادا سید رعایت حسین بھی تھے۔ واہی کے دادا ذی علم اور عبادت گزار بزرگ تھے۔اور خدا نے انہیں جاگیر داری سے نوازا تھا۔سید اظہار حسین بڑے ذی وقار و علم دوست تھے۔یہ واہی کے حقیقی چچا تھے۔واہی کے والد کا نام سید ظہور حسین تھا۔یہ محکمہ پولس میں ملازم اور چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ان کی والدہ نہایت روشن خیال اور بڑی عابدہ زاہدہ اور پاک طینت تھیں۔ رضا نقوی واہی کی ابتدائی تعلیم و تربیت روایتی طرز پر گھر میں ہوئی۔وطن کے اسکول سے مڈل تک کی پڑھائی کی تکمیل کے بعد پٹنہ کالجیٹ ہائی اسکول میں زیر تعلیم رہے۔عربی و فارسی مولوی عین الہدیٰ ثمر (پٹنہ سیٹی) سے سیکھی۔ ۱۹۳۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔انٹر میڈیٹ میں پٹنہ کالج میں داخلہ لیا اور رضا مسلم ہاسٹل (موجودہ اقبال ہاسٹل) میں مقیم ہوئے۔جہاں علمی و ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ کا ساتھ رہا۔۱۹۳۲ء میں انٹر کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوا۔پھر تعلیم کی غرض سے کلکتہ گئے۔ وہاں صوفی کمرشیل انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۳۳ء میں ڈپلومہ ان کامرس کیا۔پھر پٹنہ لوٹ آئے۔
بچپن میں واہی صاحب کے ادبی اور شعری ذوق کی نشو ونما میں ان کا آبائی وطن بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں اس زمانے میں مشغول تھے۔بستی میں ان دنوں جید علما، ادبا، شعرا، اور سر برآوردہ حکام بھرے پڑے تھے۔ جہاں شعر و شاعری کا ہر دم چرچہ رہتا تھا۔خصوصاً ایام عزا کے موقع پر عظیم المرتبت سلام، نوحہ اور مرثیہ کہنے اور پڑھنے والے شعرا اور جید علما و فقہا کی آمد و رفت رہتی، جنہیں واہی کی کمسن نگاہیں بہت قریب سے دیکھ رہی تھیں۔وہ جب تھوڑا بڑے ہوئے اور ہوش سنبھالا تو علما و شعرا کی صحبتیں انہیں بھی نصیب ہوئیں۔وہ ان کی تمام باتیں مجالس میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور ان پر غور و فکر کرتے چونکہ واہی ذہین و فطین تھے اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔لہٰذا بہت جلد انہوں نے اپنے قریب کے ماحول کے اثرات قبول کئے اور اپنی کم عمری میں ہی یعنی آٹھ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے انہوں نے کٹر مٹر اور ٹیڑھے میڑھے اشعار موزوں کرنا شروع کر دیئے۔ جب یہ سلسلہ آگے بڑھا تو اپنی شاعری کا سکہ جما لیا۔واہی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے نازش پرتاپ گڈھی نے ایک طویل مسدس قلم

ISSN No. : 2395-2016

بند کیا۔اس کے ابتدائی تین چند اشعار ملاحظہ ہوں

بے جہت آب و تاب تھی انسان کی نظر
بے زہر خند ہوگیا تھا ایک اک بشر
بے آب دل گداز تھے اشعار کے گہر
آکر پڑا تھا وقت عجب صنف طنز پر
اکبر کے بعد شور تھا گرد و نواح میں
فن اب قدم رکھیے گا دیار مزاح میں
وہ جس نے فکر وفن کی بہت دیکھ بھال کی
دی شکل جس نے طنز کو سحر جلال کی
خالی رہے گی مسند اب اس باکمال کی
لیکن یہ بات چھوٹ تھی قحط الرجال کی
ہر خندۂ نشاط می آنسو لئے ہوئے
وہی اٹھا شعور کی خوشبو لئے ہوئے

ثانوی تعلیم کے بعد جب وطن سے حصول تعلیم کی خاطر شہر عظیم آباد (پٹنہ) کی سمت آئے اور یہاں ان کی وابستگی پٹنہ کالجیٹ اور پٹنہ کالج سے ہوئی تو ان کی طبیعت کی مناسبت سے ایک نہایت سازگار اور خوشگوار ماحول نصیب ہوا۔اس ماحول نے ان کی شاعیر کو کمال کی منزل تک پہنچایا۔جب پٹنہ کالج میں ۱۹۳۰ء میں تعلیم کی غرض سے داخل ہوئے تو اس زمانے میں پٹنہ کالج سائنس کالج اور بی این کالج میں بزم ادب بزم سخن اور بزم اردو کے زیر اہتمام عظیم الشان مشاعرے اور جلسے منعقد ہوا کرتے تھے۔جن میں مقامی شعرائے کرام کے علاوہ ملک کے بڑے اور نامور سخن وروں اور فنکاروں کی آمد ہوتی تھی۔

انجم مانپوری جو بہار کے بانی ظرافت سمجھے جاتے ہیں انہوں نے ان دنوں، جوار دو ادب میں ترقی پسند تحریک کے وجود کا زمانہ تھا واہی کی پہلی غزل کو اپنے رسالہ ندیم میں شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے واہی کی کئی نظمیں مثلاً کسان، ومزدور، وغیرہ ساغر نظامی کے رسالہ ''ایشیا'' جوش کے 'کلیم' اور نیاز فتح پوری کے ''نگار'' وغیرہ میں شائع ہونے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی بحثیت سنجیدہ شاعران کی پہچان قائم ہوگئی۔پھر وہ آگے چل کر طنزیہ ومزاحیہ شاعر کی طرف متوجہ ہوگئے۔شاعیر کے اس شغف نے واہی کو اپنے حلقہ احباب میں بلندی و کامرانی کی منزل پر پہنچا دیا۔واہی کی پوری شعری زندگی کا محاسبہ کریں تو ان کی شاعری کی عمر ۷۰ برسوں پر محیط نظر آتی ہے۔سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں انہوں نے پٹنہ کے بزم ادب کے ایک سالانہ مشاعرے سے شعر وسخن کا آغاز کیا۔جس میں پہلی بار

ایک غزل پڑھی تھی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

آیا ہوں لے کے عالم امید دہر میں
اب جا رہا ہوں یاس کی دنیا لئے ہوئے
کانٹو! بجھالو پیاس کہ راہ دراز سے
آیا ہوں جام آبلہ پا لئے ہوئے

''بزم ادب'' پٹنہ کالج میں جب واہی نے پہلی بار مذکورہ کلام پڑھا تو حاضرین انگشت بدنداں رہ گئے۔ انہیں خوب داد ملی۔ وہ برابر آگے کی طرف بڑھتے رہے۔ ابتدا میں واہی نے پٹنہ کالج کی ہی ایک عظیم ہستی پروفیسر عبدالمنان حسینی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ جنہوں نے واہی کے دل ودماغ کو شعر گوئی کی طرف مائل کیا تھا۔ ابتدائی غزل کے نمونے ملاحظہ ہوں:

پسینہ موت کا آیا کسی بے بس کے ماتھے پر
ندامت کا کسی کی آنکھ میں آنسو جھلکتا ہے

جہاں تک واہی کی طنزیہ وظریفانہ شعری تخلیقات کا سوال ہے تو اولاً انہوں نے ایک نظم 'ایم ایل اے' لکھی۔ یہ نظم ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم نے دور دور کی فضاؤں کو ظریفانہ کلام کی خوشبوؤں سے معطر کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واہی کی تصویر لوگوں کے دل ودماغ پر چھا گئی۔ اور وہ سب کے ہردلعزیز بن بیٹھے۔ حالانکہ واہی اپنے تخلیقی سفر کا آغاز تو سنجیدہ وہ انقلابی شاعری سے کیا تھا۔ لیکن بعد میں ان کا رجحان طنز ومزاح کی سمت مائل ہوا۔ اس ضمن میں جابجا کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ یہی واقعہ ان کی ظریفانہ شاعری کا سبب بنا۔ نظم ایل ایل اے واہی کی پہلی طنزیہ اور ظریفانہ تخلیق تھی۔ جو لوگوں کے لئے تفنن ودلچسپی کا سبب بنی۔ ایسے ان کے عزیز دوست اور بہار کے مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی نے اپنے اخبار میں شائع کر کے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سہیل عظیم آبادی صاحب جو واہی کے قریبی دوست تھے پہلے شخص ہیں جنہوں نے واہی کی اس تحریک کی لوکو بڑھائے رکھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ پھر واہی نے حالات کے تقاضے کے تحت اسی نہج پر برابر نظمیں لکھیں۔ جس کا سلسلہ تازگی قائم رہا اور ملک کے مختلف مشہور رسائل وجرائد میں ان کی نظمیں مسلسل شائع ہوتی رہیں۔ واہی کی نظمیں ''اودھ پنچ'' ''بھوپال پنچ'' ''سرپنچ'' (ہفتہ وار) کے علاوہ قومی و بین الاقوامی سطح پر شائع ہونے والے رسائل ''آج کل'' دہلی، ''آثار'' کلکتہ ''شاعر'' ممبئی، ''کراچی، ''نقوش'' لاہور، 'نمکداں' کراچی، ''شگوفہ'' حیدرآباد 'ہماری زبان'' علی گڑھ ''تلاش'' دہلی، ''صبح نو'' اور ''اشارہ'' پٹنہ اور ''صنم'' اور بہار کی خبریں وغیرہ میں چھپتیں۔ واہی کی نظموں کی طباعت اور اشاعت کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ اکبر کے بعد اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والے تمام مزاح نگاروں میں واہی 'سرخیل' ہیں۔

جہاں تک واہی کے ادبی کارناموں کا سوال ہے تو ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک درجن ہے۔ جن میں ان کی نثری کتاب بھی شامل ہے۔ ''واہیات'' ان کی پہلی ظریفانہ شعری تصنیف ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا مجموعہ ''طنز و تبسم'' مکتبہ ادب گردنی باغ سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی کتابیں منظر عام پر آتی رہیں۔ تیسرا مجموعہ کلام ''نشتر و مرہم'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ حیدرآبد کی جانب سے شائع ہوا۔ کلام بزم نازک ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اسے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مرتب کر کے نسیم بک ڈپو لکھنو کے زیر اہتمام ۱۹۷۲ء میں چھپوایا۔ علاوہ ازیں واہی کی کتاب ''نام بہ نام'' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ واہی کا ساتواں اور سب سے مشہور و معروف مجموعہ کلام ''شعرستان واہی'' ہے۔ یہ ۱۹۸۲ء میں زیور طبع آراستہ ہوا۔ ان کتابوں کے علاوہ واہی کی کتابوں میں ایک کتاب ''چٹ پٹی نظمیں'' ہے یہ ۷۲-۱۹۷۱ء میں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئی جو اردو ہندی میں نئی چیز ہے۔ یہ مجموعہ ہندی میں اردو ظرافت کا ایک نادر تحفہ ہے واہی کی یہ خوش نصیبی ہے کہ زیادہ تر کتابیں ان کی حیات میں ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔ واہی ان کے لازوال کارناموں کے علاوہ ان کی تحریروں میں تقریباً بیس مقالات، دو درجن کتابوں پر تبصرے، تجزیے اور متعدد کتابوں کے مقدمے دیباچے اور آرا شامل ہیں۔ غرض کہ اردو ادب پر واہی اک بہت بڑا احسان ہے۔ انہوں نے اپنی ذات، تعقل پسندی اور جدوجہد سے اردو ادب کے سرمایہ میں مزید ایک بڑا اضافہ کیا ہے جسے اردو کی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ واہی صاحب کی ہمہ گیر شخصیت پر ملک کے کئی اسکول کالج یونیورسٹیوں میں اردو کے نصاب میں ان کی نظمیں شامل رہی ہیں۔ اور اب بھی ہیں۔ لکھنو یونیورسٹی کے اردو نصاب میں آج سے تقریباً ڈیڑھ دہائی قبل ہی ان کا شعری مجموعہ ''واہیات'' شامل تھا۔ ۱۹۸۵ء میں رانچی یونیورسٹی، جھارکھنڈ کے تحت اسی یونیورسٹی کے لکچرر محمد عقیل اشرف، کو تحقیقی مقالے رضا نقوی واہی کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض کی گئی ہے۔

واہی کی ادبی کارنامون پر جہان تک ایوارڈ سے نوازے جانے کا سوال ہے تو سب سے پہلے ریاست بہار کی مایہ ناز اور ملک کی قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ نے ۱۹۶۳ء میں ان کی کتاب ''طنز و تبسم'' پر ڈھائی سو روپئے کا انعام دے کر اس سلسلے کا آغاز کیا۔ پھر یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور محکمہ راج بھاشا کے مولانا مظہر الحق ایوارڈ پر جا کر منتہی ہوا۔ دیگر انعامات و اعزازات میں کلام نرم و نازک پر اترپردیش اور بہار اردو اکادمی نے بالترتیب ایک ہزار پانچ سو روپئے ''نام بنام'' پر اترپردیش اردو اکادمی نے ایک ہزار روپیہ، ''متاع واہی'' پر اترپردیش اردو اکادمی اور میرا اکادمی اور میرا اکادمی دہلی نے پانچ پانچ سو روپئے شعرستان واہی پر بہار اور اترپردیش

ISSN No.: 2395-2016

اردو اکادمیوں نے دو دو ہزار روپے اور بنگال اردو اکادمی نے پانچ سو روپے دیئے۔ اردو شاعری اور بہار پر راشٹر بھاشا پریشد پٹنہ نے پانچ سو روپے اور ادبی ادارہ ''اعتراف'' پٹنہ نے شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھوں گیارہ ہزار روپے کے ذریعہ خدمات واہی کا اعتراف کیا۔ واہی صاحب کو ان کے تخلیقی کارناموں کے اعتراف میں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ جن لوگوں کے نام واہی نے منظوم خطوط کا مجموعہ ''نام بنام'' لکھا، اسی سمت اشارہ ہے۔ واہی نے جہاں ماہرین ادب سے تعلقات کی بنا پر منظوم مکتوب قلمبند کئے ہیں شعر و ادب کے درخشندہ ستاروں اور دلدادوں کے لازوال کرداروں پر بھی خطوط لکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ واہی کی نظمیں جہاں عوام کے درمیان مقبول ہیں وہیں دوسری زبان سے سروکار رکھنے والے حضرات بھی ان کی نظموں سے محظوظ ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے مختلف مقامات سے مدح واہی میں ان کے دیوان دیوانے دل کی روشنائی میں قلم ڈبوئے دیکھے جاتے ہیں۔

واہی کی فنکارانہ عظمت و اہمیت کے اعتراف میں سینکڑوں تاثراتی و تنقیدی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ واہی صاحب کی ایک بڑی خوبی ان کی منکسر المزاجی بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گرد ہمہ وقت طلبا اساتذہ اور احباب جمع رہتے تھے۔ وہ سب سے یکساں طور پر خوش دلی سے ملتے تھے۔ اور سب کی ضیافت میں لگے رہتے تھے۔ چھوٹے بڑے امیر غریب اور حاکم محکوم سب ان سے قریب تھے اور یہ بھی سب سے قریب رہتے تھے۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

نورعالم خان

پروفیسر قمر رئیس کی پریم چند شناسی

قمر رئیس اردو دنیا کا ایک اہم نام ہے۔ان کی تنقید سے اردو دنیا کو ایک خاص قسم کی روشنی سے آگہی ملی۔قمر رئیس کو بیک وقت مختلف اصناف پر مکمل دسترس تھی۔ابتدا میں شاعری سے شغف رکھتے تھے لیکن بعد میں فکشن اور ڈرامے پر فوقیت کے ساتھ تنقیدی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔اردو کے گلستان میں صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ہندوستان کے باہر از بکستان کے ذرات کو بھی انھوں نے اپنے رشحاتِ قلم سے سرفرازی عطا کی ہے۔کئی ایک شعرا کے شعری ترجمے کر کے اپنی اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔وہ ایک بڑے نقاد ہیں بعض اہم ناقدوں کے ساتھ قمر رئیس پریم چند کے اہم نقاد تصور کیے جاتے ہیں۔انھوں نے مضامینِ پریم چند کو بھی مرتب کیا اور اپنا اختصاص پریم چند کے مطالعہ کو بنایا۔پریم چند شناسی میں اردو کے چند اہم ناقدین کے ساتھ ساتھ قمر رئیس کا بھی نام لیا جاتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ اردو دنیا میں جب بھی پریم چند کے فکر و فن پر گفتگو ہوگی اس وقت قمر رئیس کا نام استناد کے طور پر لیا جائے گا۔

خاص کر انھوں نے تحقیق و تنقید میں اپنی ایک ان مٹ شناخت قائم کی اور آگے چل کر ایک بڑے نقاد کی حیثیت سے پہچانے گیے۔اس سلسلے میں انھوں نے کئی اہم جگہوں سے بیش قیمتی انعامات بھی حاصل کیے۔اسی طرح آگے چل کر ایک بہت بڑے افسانہ اور ناول نگار منشی پریم چند کی تحریروں کو تنقیدی نظریے سے جانچا اور پرکھا اور کئی کتابیں تصنیف کیں جیسے تلاش و توازن، 1965ء، تنقیدی تناظر اور تعبیر و تحلیل، اردو افسانوی ادب بیسویں صدی میں اہم ہیں۔ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر قمر رئیس کی اہم تصنیف ہے۔اس کے علاوہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ اور نیا افسانہ مسائل و میلانات، ترجمہ کا فن اور روایت بھی ان کی اہم تصانیف ہیں۔قمر رئیس بنیادی طور پر افسانوی ادب فکشن تنقید کے ماہر خاص طور پر پریم چند کی فکشن پر ان کی گہری نظر ہے فکشن تنقید کو انھوں نے خصوصی طور پر اپنی علمی کاوش کا میدان بنایا لیکن پریم چند پر انھوں نے کافی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں جیسے پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، پریم چند شخصیت اور کارنامے، پریم چند فکر و فن، جو پریم چند صد سالہ تقریب اور

ISSN No. 2395-2016

جشن 1980 کے موقعے پرڈاکٹر قمر رئیس نے جو مقالہ پیش کیا تھا وہ بعد میں کتابی شکل میں 1980ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پریم چند شناسی کے حوالے سے ان کے مثبت اور مدلل مضامین سامنے آئے جس سے پریم چند شناسی کی کئی نئے راہیں کھلیں۔ ترقی پسند تحریک سے بھی قمر رئیس کا تعلق بہت گہرا رہا ہے۔ ادب کی تفہیم وتوضیح میں شروع ہی سے ترقی پسندانہ رہا۔ شعر وادب کی قدر وقیمت کے تعین میں مارکسی تنقید کوانھوں نے سب سے زیادہ کارآمد قرار دیا جس کے نتیجے میں پریم چند کو قمر رئیس نے بہت بہتر انداز میں سمجھا اور جانا ہے۔ قمر رئیس سے پہلے بہت سے ادیبوں نے پریم چند پر اپنی چشمِ بصیرت ڈالی اور بہت کچھ لکھا لیکن جس تہہ داری اور گہرائی سے پروفیسر قمر رئیس کی رسائی ہوئی ہے سارے ادیب اس سے کوسوں دور رہ گیے ہیں۔ اس لئے قمر رئیس ایک بڑا نام ہے۔ انھوں نے منشی پریم چند پر ہر طرح سے نظر ڈالی اور اپنی ژرف بینی اور دور اندیشی سے کام لے کر پریم چند پر ہزاروں باب روشن کر دیئے ہیں۔ جس کے ذریعے پریم چند کی اہمیت پھر سے ایک بار مسلم ہوگئی ہے

قمر رئیس نے اپنے تحقیقی مقالے میں پریم چند کے ناولوں کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر بڑی مہارت کے ساتھ روشنی ڈالی اور کسی بھی گوشے کو مبہم نہیں ہونے دیا۔ علی گڑھ میں انھوں نے رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا جو موضوع تھا۔ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار'' اس میں انھوں نے پریم چند کی ناول نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس کے سارے اصول وضوابط سے بحث کی ہے اور ساتھ ساتھ ناولوں کی قدر وقیمت کی تعین بھی کی ہے۔ ساتھ ساتھ پریم چند کی زندگی اور ادب پر بہتر گفتگو کی ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند پر باتیں کرتے ہوئے ان کے جذبات کے بجائے علمی تحقیق وتجزیہ پر اپنے مقالے کی بنیاد رکھی ہے اور اس میں پریم چند کی زندگی کے محرکات، تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات پریم چند کے اسلوب وہیئت وغیرہ پر خوبصورت طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ قمر رئیس نے اپنے تحقیقی مقالے کو تین ادوار پر تقسیم کیا ہے اور تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔ پہلے باب میں منشی پریم چند کی زندگی (بچپن تا آخر عمر) کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس مطالعے میں پیش آنے والی سبھی چیزوں کو قلمبند کیا ہے جیسے بچپن کی محرومی، ناکامی کم عمر میں شادی، نوکری اور مستعفی ہونے کے وجوہات، فلم کمپنی سے وابستگی اور معدے کی بیماری جیسے مہلک امراض کا ذکر بہتر طریقے سے کیا ہے۔ قمر رئیس کہتے ہیں کہ پریم چند کی زندگی کے نشیب وفراز محرومیوں اور ناکامیوں نے ان کو ایک ایسا قالب دیا جس نے پریم چند کو گاؤں اور مظلوم طبقے کی بے ریا زندگی کو سمجھنے کا موقع فراہم کر دیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند پر تبصرہ کرتے ہوئے اس زمانے کے سبھی حالات کو پیش کیا ہے اور دیہاتی منظر کشی کر کے ایک ایسا نمایاں وصف بیان کرتے ہیں جس کے ذریعے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور اس طرح پریم چند کو سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

دوسرے باب میں قمر رئیس نے منشی پریم چند کے ذہنی اور فکری پسِ منظر کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح پریم چند اپنے عہد کی زندگی اور معاشرے سے اپنے فن کی خاطر مواد اخذ کر لیتے ہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی قمر رئیس نے اس دور کے پیچ وخم کو بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس وقت جو حالات تھے انگریزوں کا تسلط۔ سماج اور معاشرے کی بدحالی اور پھر رویندر ناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو، راجہ رام موہن رائے، کشیپ چند رسین، سوامی دیا نند سرسوتی، مہاتما گاندھی وغیرہ کی بڑھتی ہوئی قومیت اور آزادی کی تحریک وغیرہ۔ ان سے متاثر ہوکر پریم چند نے ملکی وقومی خدمات انجام دیں۔ ادب چونکہ سماج اور زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے زمانے کے اتار چڑھاؤ نے ادب کو متاثر کیا اور اس ضمن میں پریم چند کے قلم نے بڑی زودنویسی کی راہ اختیار کی اور حالات کے مدنظر انھوں نے حقیقت بیانی سے کام لیکر اردو ادب کو ایک پلیٹ فارم عطا کیا۔ اور اس کے ساتھ ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔ ترقی پسند تحریک میں منشی پریم چند نے قلم کے علاوہ عملی شرکت بھی کی۔

تیسرے باب میں مغربی علوم سے استفادہ کرنے والے ادیبوں نے ملک کی نوتعمیر کی بابت جو رویے اختیار کیے ان کا خصوصی ذکر ہے۔ مولوی نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ہاتھوں جس ناول نگاری کا دور شروع ہوا وہ مغرب کے اثرات کی دین تھا۔ حالانکہ اس کے بعد کچھ ملکی مسائل پر بھی اصلاحی ناول لکھے گیے لیکن ان میں تاثر کی کمی تھی۔ اس لیے کہ ہندوستانی معاشرہ مغرب سے تعلق نہیں رکھتا۔ سیاسی اور سماجی حالات اور جنگِ عظیم نے ہندوستانیوں کو بیحد متاثر کیا تھا اور ان ناول نگاروں نے جب اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا تو ان کی کوشش محض خواص تک محدود ہوکر رہ گئی۔ اس لئے کہ ان شخصیتوں میں زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق شہر سے تھا اس لئے ان کی تحریروں سے ہر آدمی کو متاثر ہونا ضروری نہیں۔ ایسے میں ایک آواز پریم چند کی آئی اور انھوں نے پورے حالات کو متاثر کیا اور لوگوں کو عیش پرستانہ زندگی سے نکالنے کی کوشش کی اس وقت ہندوستان کے عوام وخواص ہندوستان کی اصل ترقی ونوتعمیر کی ڈور کو سلجھانے لگے۔ قمر رئیس کہتے ہیں کہ پریم چند کی ذہنی وفکری بالیدگی نے اس پورے سماج اور سیاسی پسِ منظر کو کھول کر پیش کیا ہے۔

چوتھے باب میں مصنف نے پریم چند کے ابتدائی دور کے ناولوں کا جائزہ لیا ہے اس ضمن میں پریم چند کے تین ناول۔ ''ہم خرما وہم ثواب'' جلوۂ ایثار'' اور ''بیوہ'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی تحقیق وتاریخی اعتبار سے یہ بات واضح کی ہے کہ ہم خرما وہم ثواب ہی پریم چند کا باقاعدہ پہلا ناول ہے جو چھپ کر شائع ہوا ساتھ ساتھ مصنف نے پریم چند پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے جس کے ذریعے کئی خامیاں بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ظاہر کی بات ہے کہ جب کسی چیز پر تنقید نگاہ ڈالی جائے گی تو اس میں کچھ اچھائی یا برائی ضرور نظر آئے گی اور یہ ساری

چیزیں فطری بھی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی تحقیق کے مطابق

''پریم چند کا پہلا ناول اسرارِ معابد تھا جو مکمل نہ ہوسکا اور جس کی قسطیں بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار ''آوازِ خلق'' میں اکتوبر 1903ء سے فروری 1905ء تک شائع ہوئیں۔''[۱]

قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں پر اپنی گہری نگاہ ڈال کر اس کی وضاحت میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اوران کے سبھی ناولوں کی اہمیت، حالات کے اعتبار سے پیش کر کے ایک بڑا کام کیا ہے۔ جس ناول کا ذکر کیا تو اس کے پیچھے جو بھی سیاسی یا سماجی محرکات در پیش تھے اس کا خلاصہ اور اس کی اہمیت مکمل طریقے سے بیان کی ہے۔ جیسے ''جلوۂ ایثار''، ہم خرما و ہم ثواب'' وغیرہ کے ذکر حالات کے مطابق پیش کیے ہیں۔ قمر رئیس ہم خرما و ہم ثواب کو کردار نگاری کے اعتبار سے ناول کی صفِ میں جگہ نہیں دیتے۔ یہ بات مصنف کی بجا ہے کہ اس میں کرداروں کی کمزوری ہے لیکن اگر اس کو ناول نہیں کہیں گے تو کہیں گے کیا؟ جو خامیاں تھی ان کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں پریم چند کی توجہ قصہ بیانی پر ہے نہ کہ ناول کی فنی تکمیل پر۔ اس لئے مصنف پریم چند کی اس ناول کو ناول ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے اگر کوئی دس ناول لکھتا ہے تو دسوں میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور نظر آئیں گی یہ فطری تقاضا ہے کہ انسان کبھی کبھی اپنے راستے سے دانستہ طور سے بھی بھٹک جاتا ہے لیکن بھٹکنے کے بعد احساس بھی ہوتا ہے اس غلطی کو اتنی بڑی بھی نہیں ماننا چاہیے جائے گی کہ انسان دوبارہ اپنی منزل کا نام تک بھول جائے۔

اس طرح مصنف نے اپنے مقالے کے پانچویں باب میں پریم چند کے دوسرے دور کے ناولوں مثلاً ''بازارحسن''، ''گوشہ عافیت''، ''نرملا'' اور ''غبن'' کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ بازارِ حسن پریم چند کا ضخیم ناول ہے۔ اس ناول کے بارے میں قمر رئیس کا کہنا ہے کہ اس ناول سے متعلق پریم چند کی یہ رائے درست نہیں ہے کہ انھوں نے اس میں بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس ناول کے ذریعے ہندوستانی عورت کی مظلومی و مجبوری کو دکھایا ہے جو ہمیشہ سے مرد کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہوتی رہی پریم چند کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس قصہ میں میں نے ایک اخلاقی بے شرمی یعنی
بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے''[۲]

گوشہ عافیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اس ناول کے ذریعے پریم چند نے پہلی بار مظلوم کی آواز اوران کی دردناک زندگی سے اپنے ناول کی تکمیل کی ہے۔ اس ناول میں کسان، غریب، مزدور اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے حالات کے ذریعے ہندوستان کے سیاسی، و سماجی اور معاشرتی حالات کی عکاسی کی ہے اس کے

ذریعے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک پریم چند کا سیاسی و سماجی شعور کتنا بلند اور پختہ ہو گیا تھا۔ڈاکٹر قمر رئیس کے اس تجزیاتی و معروضی نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ارتضٰی کریم لکھتے ہیں۔

''پریم چند کی جانب وہ صرف ''ہمدردانہ'' نہیں بلکہ ناقدانہ، نگاہ ڈالتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید معیاری ہو جاتی ہے۔انھوں نے گوشۂ عافیت کا بڑا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور فنی تکمیل، تکنیک، موضوع اور مقصد کے لحاظ سے پریم چند کے اچھے ناولوں میں اسے شمار کرتے ہیں۔''[۳]

اس کے بعد منشی پریم چند کے دو ناول نرملا (1923) اور غبن (1930) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قمر رئیس اس کو فنی اعتبار سے کامیاب ناول بتاتے ہیں کہتے ہیں کہ اس ناول میں پریم چند نے ایک سماجی برائی جہیز کا پہلو اٹھایا ہے اور پھر قاری کے سامنے اس لعنت کو موثر انداز میں بیان کر کے اس کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔جہیز کا مسئلہ تو آج پورے ہندوستان کا موضوع گفتگو بنا ہوا ہے اسی کو پریم چند نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ جہیز کے لیے خاطر خواہ رقم نہ ہونے کی وجہ سے ایک لڑکی بے میل شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔شوہر اور بیوی کی عمر میں اس بڑے فرق نے آخر کار نرملا کی جان لے لی۔نرملا ناول کے متعلق قمر رئیس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

اس طرح پریم چند کلیانی اور نرملا کو نئے حالات سے دوچار کر کے قاری کے لیے کہانی میں تجسس اور دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔کلیانی کی منتوں کے باوجود بابو بہال چند اور انکا لڑکا، نرملا سے شادی کرنے کے لیے رضامند نہیں ہوتے۔اسلیے کہ وکیل صاحب کی اچانک موت کی وجہ سے انھیں جہیز میں زیادہ رقم ملنے کی توقع نہیں رہتی۔مجبور ہو کر کلیانی نرملا کے لیے دوسرے بر تلاش کرتی ہے لیکن ہر نوجوان لڑکا اپنی خاندانی حیثیت استعداد اور کاروبار کی مناسبت سے جہیز کا طالب ہوتا ہے۔صرف چالیس سال کی عمر کے طوطا رام بغیر جہیز کے شادی کرنے پر رضامند ہیں۔کلیانی جہیز نہیں دے سکتی۔اس لے نرملا کی شادی طوطا رام سے ہو جاتی ہے۔''[۴]

''ناول ''غبن'' بھی اسی طرح ایک گھریلو اور سماجی ناول ہے جس میں سماج میں پیش آنے والے مسائل پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔قمر رئیس اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہے کہ اس ناول میں متوسط گھرانے کا ایک شخص اپنی کھوکھلی نمائش پرستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے دفتر میں غبن کر کے فرار ہو جاتا ہے اس عمل کے پیچھے سماج کا وہ فرسودہ شوق ہے جو زیور کو عورت کی کمزوری بنا دیتا ہے اور اسے سماجی عزت و وقار کا باعث سمجھا جاتا ہے۔بیوی کی چندن ہار حاصل کرنے کی خواہش شوہر کو غبن کے عمل تک پہونچا دیتی ہے۔آخر کار ہیروئن زیور سے محبت ختم کر کے اپنے گھر کی خوشیاں دوبارہ حاصل کرتی ہے۔

قمر رئیس لکھتے ہیں کہ جب ہندوستان میں عہدِ غلامی اور سرمایہ داری کا شور و غوغہ تھا اس وقت پریم چند نے 1924ء میں اپنا ایک ضخیم ناول ''چوگانِ ہستی'' لکھ کر اپنے عہد کے دو اہم مسائل پر گفتگو کی تھی۔ایک سرمایہ

داری کی لعنت اور دوسری صنعتی عہد کی برائیاں۔قمر رئیس کہتے ہیں کہ یہ پریم چند کا سب سے ضخیم ناول ہے جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اس ناول کو پریم چند اپنا سب سے کامیاب ناول کہتے ہیں۔اس ناول کے ضمن میں مصنف نے جو تجزیہ کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند لا مذہب ہوتے ہوئے بھی مذہب کے بنیادی اصول یعنی ''سب کچھ اوپر والے کی مرضی سے ہونے'' کی بات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس ناول کے تعلق سے مصنف نے یہ کہا ہے کہ اس ناول کو لکھتے وقت پریم چند تاریخ، سماج، سیاست، ملک وقوم کی بدحالی، قوموں کا حال اور مستقبل سب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

پردۂ مجاز کے حوالے سے قمر رئیس کہتے ہیں کہ یہ فوق الفطرت عناصر کی وجہ سے پریم چند کا سب سے متنازعہ ناول ہے اور اسے پریم چند کے سرسوتی پریس میں سب سے پہلے شائع ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ناول ''میدانِ عمل'' میں ہندوستان کا سیاسی نشیب وفراز دکھایا گیا ہے۔محنت کشوں غریبوں ومزدوروں پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے جاتے ہیں ان کو اور چھوا چھوت کی بیماری کو بھی قمر رئیس نے بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول ''گئودان'' جو پریم چند کا آخری اردو ناول ہے اسے پریم چند کا سب سے کامیاب ناول ہونے کا اعجاز حاصل ہے ڈاکٹر قمر رئیس نے ''گئودان'' کو پریم چند کی پوری زندگی کی کمائی بتایا ہے اور اس ناول میں پریم چند کا فن درجہ کمال کو پہونچا ہوا ہے۔اس میں ہوری، دھنیا، گوبر، اور ہیرا جیسے کردار موجود ہیں لیکن اس میں ہیرا اپنے بھائی کی گائے کو زہر دیکر ماردیتا ہے اور ہوری جو کہ ایک نہایت غریب مزدور ہے اور قرضوں سے پٹا ہوا ہے اور غربت کی وجہ سے وہ کام بھی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کو سن کر آدمی شرم سار ہو جائے۔اور ہوری ان چیزوں کے ساتھ اپنی گائے کے ذریعے خوشحالی کی توقع تو کرتا ہے مگر یہ توقع وفا نہیں ہوتی اور یہ خواہش لیے ہوری مرجاتا ہے۔اس میں بھی امیر غریبوں کا خون چوستے اور آرام سے رہتے ہیں۔قمر رئیس نے منشی پریم چند پر بہتر طریقے سے نظر ڈالی ہے اور ہر اعتبار سے جانچنے پرکھنے اور پریم چند کے نفسیاتی شعور کی تہہ تک پہونچ کر پریم چند کی ذاتی خیالات کی نقاب کشائی کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔یہاں قمر رئیس تمام غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں: اقتباس

> ''پریم چند کی زندگی میں کچھ ایسے حادثات کا سراغ بھی ملا ہے جن کو انھوں نے ہمیشہ راز بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے بے تکلف دوستوں پر بھی کبھی ظاہر نہ ہونے دیا اور اگر کسی نے اصرار یا استفسار کیا تو اصل واقعات پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کیا اس لئے کہ ان کا انکشاف زندگی کے اس آورش اور زندگی گزارنے کی اس اخلاقی تصور کے منافی تھا جس کی وہ

تبلیغ کر رہے تھے اور جسے وہ عملی زندگی بنا کر دیکھنا چاہتے تھے۔'' ۵

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قمر رئیس نے پریم چند کی تحریروں پر بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے ورنہ اور بہت سے ادبا نے پریم چند پر قلم اٹھایا لیکن اس تہہ تک نہ پہنچ سکے جس تہہ تک قمر رئیس کی رسائی ہوگئی ہے اسی لیے تمام نقادوں میں قمر رئیس سرِ فہرست ہیں۔ اور یہی نہیں قمر رئیس نے اپنے اعتبار سے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جس پر گفتگو نہ کی ہو۔

ناولوں کے مکمل تجزیے کے بعد زبان و بیان اور فن پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور پریم چند پر ایک بڑا کام کر کے پریم چند کو ہمیشہ کیلیے زندہ و جاوید کر دیا ہے اور ایسی شمع روشن کی جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔ قمر رئیس نے ناولوں کے ذریعے سے ان کے ادوار کو تقسیم کر کے ناولوں کے ساتھ پریم چند کی اہمیت بھی مسلم کر دی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ناولوں کے ادوار کے حساب سے حالات کی عکاسی بھی پیش کی ہے۔ منشی پریم چند کی زبان و بیان پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''پریم چند کی تصانیف نے ایک ایسی ادبی اور معیاری زبان کو رواج دینے کی کوشش کی ہے جو بول چال کی زبان سے قریب تر ہو اور زبان کے نئے تقاضوں کو پورا کرتی ہو'' ۶

پریم چند کے صد سالہ تقریب اور جشن 1980ء کے موقع پر ''جشن پریم چند کمیٹی'' میں سکریٹری کے حیثیت سے ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنا مقالہ ''پریم چند فکر و فن'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ یہی مقالہ کتابی شکل میں دسمبر 1980ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ انھوں نے یہ کتاب پانچ ابواب پر تقسیم کی تھی جس میں پریم چند کی پوری زندگی پیدائش سے لیکر آخری وقت تک تفصیل سے لکھے گئے ہیں لیکن ان کے ابواب کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلا باب سفر کی منزلیں، دوسرا باب گاندھی واد سے سماج واد تک، تیسرا فرقہ وارانہ ہم آہنگی، چوتھا تصورِ حیات اور پانچواں پریم چند کی روایت ہے۔ اس میں پریم چند کی ابتدائی زندگی سے لیکر دیہاتی، سیاسی، معاشی حالات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے اور ان سبھی ابواب پر قمر رئیس نے مکمل تبصرہ کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے پریم چند کی تصانیف اور تحریروں کا تعارف پیش کیا ہے۔ جو نواب رائے کے نام سے شائع ہوئیں ان میں ''سوزِ وطن''، ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''کشنا'' اور ''روٹھی رانی'' وغیرہ شامل ہیں۔ اور اس بارے میں پریم چند کی تحریریں فن بدلتی ہوئی زندگی ملازمت گھریلو حالات سرکاری ملازمت سے آزادی اور پریم چند کے فکری، سماجی اور قومی شعور پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ایک جگہ پریم چند کے فکروفن پرتذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ کے وقت پریم چند کا فکری سماجی اور قومی شعور اس قدر بالیدہ ہوگیا تھا کہ انھوں نے برطانوی حکومت سے انحراف ہوکر اپنی نوکری سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ اور ملک کی ترقی اور فلاح میں لگ گیے جس کے پاداش میں پریم چند کو جیل کی بھی ہوا کھانی پڑی۔ قمر رئیس پریم چند کی فکری ارتقا کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند کس طرح اپنے ہم عصروں میں انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک جگہ پریم چند کو گاندھی جی کے قلب ماہیت میں دکھایا گیا ہے۔ مگراس کی تفصیل سے وضاحت نہیں کی ہے۔ تبدیلی قلب کے حوالے سے اگرایک دو اقتباس پریم چند کی تصانیف سے حوالے کے ساتھ دیتے تو قاری کے سامنے ساری باتیں بہتر طریقے سے آجاتی جیسے پریم چند اس تاثر کو اپنی تخلیق میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

’’براشخص بالکل ہی برانہیں ہوتا اس میں کہیں فرشتہ ضرور چھپا ہوتا ہے یہ نفسیاتی حقیقت ہے۔ اس پوشیدہ یا خوابیدہ شے کو ابھارنے اور اس کو سامنے لانا ایک کامیاب افسانہ نگار کا شیوہ ہے۔‘‘ ۷

اس اقتباس کے ذریعے پریم چند کے افکار و خیالات پر گاندھی جی کی اثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ پریم چند گاندھی جی کے کچھ خیالات سے متفق نہیں تھے۔ جیسے مذہبی عقائد، اہنسا پر بہت زیادہ زوراور سرمایہ داری سے بیزاری وغیرہ۔ اور دوسرے یہ کہ پریم چند فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پریم چند ہندو اور مسلم دونوں کی نکتہ چینی سے نہیں گھبراتے تھے اس لیے کہ وہ سماج میں مساوات کے حامی تھے اور سماج کو بہتر اور پُر امن دیکھنا چاہتے تھے اگر کہیں کوئی فرقہ وارانہ سانحہ پیش آتا تو پریم چند دلبرداشتہ ہوجاتے تھے اور ان کو بہت تکلیف پہونچتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تعلق سے حج اکبر،، فاتحہ، مندر، مسجد ادیب کی عزت اور اہنسا وغیرہ پر بہترین موضوعات تحریر کیے جن کے ذریعے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثالیں ملتی ہیں۔

قمر رئیس کے تعلق سے یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ وہ مارکسی تنقید سے متاثر تھے اور اس کے چلتے ترقی پسند تحریک میں شامل ہوگیے۔ اس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ تحریر کیے جانے والے ناول اور افسانوں پر ان کی گہری نظر تھی لیکن ان کی دلچسپی پریم چند کی تخلیقات میں زیادہ تھی۔ اس لیے انھوں نے پریم چند پر بڑی دیانت داری اور ایمانداری سے کام کیا ہے۔ اور پریم چند پر بہت سے مضامین لکھتے رہے۔ جس سے پریم چند کی خدمات کا ایک مرکز قائم ہوگیا 1962ء میں ’’پریم چند شخصیت اور کارنامے‘‘ جو کہ قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ہے شائع ہوئی اور اس میں مقدمے کے علاوہ تین اور مضامین شامل ہیں یہ مضامین ’’پریم چند کی فلمی زندگی‘‘ ان کے ابتدائی ناول اور پریم چند کی زندگی میں رومان کی اہمیت سے متعلق ہیں۔

ISSN No. : 2395-2016

اس کتاب کے مقدمے میں اردو ہندی دونوں پر پریم چند کی مقبولیت وافادیت خاص کر افسانوی ادب میں ان کی اولیت وافادیت پر غیر جانبدارانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور دھنپت رائے کے تخلیق کردہ افسانوں و ناولوں کے موضوعات اور ملک کے محنت کش طبقہ کے بارے میں پریم چند کے افکار وعمل پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے موجودہ دور میں ان کی اہمیت وافادیت کے ساتھ پریم چند کی معنویت پر بھی روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔ جس کا لُب لباب پریم چند کی اردو زبان وادب سے متعلق والہانہ محبت اور اردو کے حوالے سے پریم چند پر مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ادب اور زندگی سے متعلق پریم چند کے خیالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخر میں انھوں نے پریم چند پر لکھے ہوئے مضامین، کتابوں اور تبصروں پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

فراق گورکھپوری، ممتاز حسین، سید احتشام حسین، وقار عظیم، اور دیانارائن نگم جیسے اکابرین ادب کے مضامین کے علاوہ اس کتاب میں روسی نقاد وی، ایس بیسکر ودنی کے بہترین مضامین کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر وبیشتر مضامین میں پریم چند کے افسانوی ادب کی قدر وقیمت کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ آگے چل کر اس کتاب کا ہندی میں ترجمہ پریم چند کی وچار یاترا کے نام سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے تحقیقی زاویہ وتنقیدی صلاحیتوں سے پریم چند کے کرداروں میں حقیقی ادراک حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو سماج ومعاشرت کی اصل پہچان تھے۔ البتہ ڈاکٹر قمر رئیس کا نقطہ نظر مارکسی اور سائنٹفک تھا۔ اسی نظریہ کے تحت انھوں نے پریم چند کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ اور ایسے نقاد کے نزدیک ادیب کی داخلی اور خارجی دونوں زندگیاں اس کے تخلیقی عمل کے محرک ہوئی ہیں۔ قمر رئیس نے اس وقت کے سماج کے سیاسی و تہذیبی ومعاشرتی اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ پریم چند کے ذہن ووقار کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جہاں تک دیگر ناقد اور محقق رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ پریم چند کی حقیقت پسندی واقعیت نگاری اور فکری رویوں کے پردے کے آڑ میں ناقد ڈاکٹر قمر رئیس ان محرکات کا پتہ لگاتے ہیں۔ جہاں پریم چند کے ذہن میں نچلے طبقے سے ہمدردی، حب الوطنی دیہاتوں کی بدحالی کو لیکر اس میں سدھار لانے کے خواب کی جڑیں تعمیر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ البتہ یہی کسان، مزدور اور سماج کے پسماندہ لوگ پریم چند کی اصل جولان گاہ تھے اسی زمینی سطح سے انھوں نے ایسے ایسے کرداروں اور ہیرو کی تخلیقات دریافت کیں کہ کردار کے ہیروں نے ادب میں اپنا مقام بنالیا اور اس میں متوسط طبقہ سے اٹھ کر ہیرو کا کردار پورے اردو ادب میں سایہ فگن ہوئے اور یہ ہیرو کے کردار ہندوستان کے دل کی دھڑکن ثابت ہوئے۔ چنانچہ ملک کے سیاسی حالات کا تاثر پریم چند نے بھی لیا۔ انھوں نے عوام کے درد کو عوام ہی کی طرح محسوس کیا کیونکہ وہ خود عوام میں سے تھے۔ صرف ایک آواز، بے غرض محسن، اور خون سفید کو مصنف نے اس عہد کے

سماجی وسیاسی حالات کا عکس بتایا۔علاوہ ازیں چوگان ہستی، میدان عمل، گوشہ عافیت، گئودان وغیرہ کے ہیرو کو گاؤں اور عام زندگی کا آئینہ بنا کر پریم چند نے خوبی سے پیش کیا۔مصنف مطالعہ کے بعد اس نقطہ پر پہنچتے ہیں کہ پریم چند کے ہیرو صرف سماج وسیاست کے نمائندہ کردار ہی نہیں بلکہ عموماً وہ زندگی کا لطف لیتے ہوئے بہترین طریقے سے زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔قمر رئیس نے پریم چند کے ہیرو کے خدوخال پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''پریم چند کے اصل ہیرو سورداس یا ہوری نہیں بلکہ ہندوستان کے دہ کروڑوں کسان اور محنت کش عوام ہیں جو ظلم و استحصال کے اس نظام میں حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔جو بھوک، افلاس اور جہالت کے ہاتھوں اپنی انسانیت اور انسانی وقار سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔تباہی اور موت کی گھاٹیوں کی طرف بڑھتے ہوئے یہ شکستہ حال ہیرو، روشنی کے ایسے دیے ہیں جو ارد گرد کے بھیانک اندھیروں کا احساس شدید کرتے ہیں۔''۸

پریم چند شناسی کے لحاظ سے اس مضمون کی اہمیت مسلم ہے۔جس زاویہ نظر سے اس کا مطالعہ کیا گیا ہے قمر رئیس سے پہلے کسی اور نقاد نے پریم چند کی تخلیقات کا اس طرح مطالعہ نہیں کیا ہے۔

مزکورہ اقتباس کی روشنی میں ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ پریم چند کے کردار ہمیں اس وقت کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر قمر رئیس کے تجزیاتی نقطہ نظر نے پریم چند کے تصورِ آزادی میں ان لوگوں کی آزادی کی گونج سنی ہے۔جو ہندوستان کے آزادی کے ستر سال بعد بھی آزاد اور سرخرو نہیں ہیں۔دور حاضر میں پریم چند کی شناخت ان کی معنویت نئی نسل تک پہچانے میں قمر رئیس کی سعی قابل تعریف ہے۔چونکہ پریم چند کی شخصیت اتنی تہہ دار ہے کہ ہر دور میں ان کی شخصیت کے پرچھائیں کی پرتیں کھلتی ہوئی نظر آئیں گی۔چنانچہ قمر رئیس جیسے نقاد کا نام پریم چند کے باب میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

حواشی

۱۔ قمر رئیس، ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' دہلی، 2012، ص:115

۲۔ ایضاً، ص:143

۳۔ اردو فکشن کی تنقید اور ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم بشمول قمر رئیس: ایک زندگی مرتب ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ص: 360

۴۔ قمر رئیس، ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' دہلی، 2012، ص:193

۵۔ پریم چند ''پریم چند کی زندگی میں رومان'' مرتب قمر رئیس، شخصیت اور کارنامے، ص:431

۶۔ اردو فکشن کی تنقید اور ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم بشمول قمر رئیس: ایک زندگی مرتب ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ص:364

۷۔ پروفیسر قمر رئیس، ''تعبیر و تحلیل (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، پریم چند کے افسانے ایک جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1996، ص:71

۸۔ پروفیسر قمر رئیس، ''تعبیر و تحلیل' پریم چند کے ہیرو ایک سماجیاتی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1996، ص:

☆☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ یاسمین
"چاند منزل" آشیانہ کالونی، حاجی پور۔ 844101 (بہار)

حیدر علی آتش ایک مطالعہ

حیدر علی آتش کا شمار اردو کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے زمانے سے لے کر آج تک مختلف نقادوں نے مختلف انداز سے ان کی سخنوری تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ آزاد، حالی، امداد امام اثر اور سید سلیمان ندوی وغیرہ نے آتش کے تغزل کو تسلیم کیا ہے۔ آتش مصحفی کے شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے وہ دہلی سے بہت قریب تھے۔ ان کا فن گرچہ پورے طور پر لکھنوی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ان کی فکر میں دہلی اور لکھنو دونوں کی دھوپ چھاؤں ملتی ہے۔

آتش اردو کے ایک صاحب طرز غزل گو شاعر تھے۔ آتش کے والد دہلی سے فیض آباد چلے آئے تھے اور وہیں آتش کی پیدائش ہوئی۔ ان کا پورا نام خواجہ حیدر علی تھا اور لفظ خواجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندانوں میں پیری مریدی اور تصوف کا سلسلہ تھا۔ ان کی زندگی لکھنؤ میں گذری جہاں وہ آخری دم تک رہے۔

لکھنؤ اسکول کے بانی ناسخ اور آتش ہی مانے جاتے ہیں۔ دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد دہلی سے ممتاز شعراء، ادباء، فن کار اور ارباب رامش ورنگ سب کے سب نے لکھنؤ کی راہ اختیار کی۔ لکھنؤ کی رنگارنگی اور رنگ و سرود میں دہلی کی سادگی گم ہوگئی اور تصوف کی جگہ تعشق نے لے لی۔ اگرچہ آتش کی پیدائش صوفی خاندان میں ہوئی مگر جس ماحول میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی وہاں رنگ ونور کی محفل اپنی انفرادی شان کے مطابق جلوہ گر تھی۔ نوابوں کی عیش پرستی اور اس کی دولت پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ قصیدے پر قصیدے لکھے جا رہے تھے گویا قصیدے کی صنف شباب پر تھی۔ مبتذل اور فرسودہ مضامین اور اشعار کی فراوانی تھی۔ ماحول میں کیف ومستی چھائی ہوئی تھی۔ معشوق کی سراپا نگاری، زیورات اور لباس، حرکات وسکنات، متانت وحیا کے بجائے شوخی اور بے حیائی پر شعراء کی نگاہ مرکوز تھی۔ چنانچہ آتش نے بھی اپنی شاعری کا آغاز اسی پس منظر میں کیا۔ ذیل کے چند اشعار سے اس حقیقت کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے:

چھلے جڑا پہنے ہوئے پور پور میں — دکھلا رہے ہیں رسم کو جڑ اور نگار ہاتھ
ہر روز روز عید ہے ہر شب شب برات — سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

حالات نے آتش کو اپنی تعلیم کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ ان کا زمانہ حیات ۱۷۷۸ء سے ۱۸۴۷ء تک ہے۔ اگرچہ آپ پورے طور پر حالات کے سپرد ہوگئے تھے لیکن اس کے باوجود انہیں شاعری سے بے پناہ محبت تھی اس لئے انہوں نے اس فن میں بہت نام پیدا کیا۔ یہ امر مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی فن کی نمایاں کامیابی کا انحصار براہ

ISSN No. : 2395-2016

راست فنکار کی قوت تخیل اور ذوق سلیم پر موقوف ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے آتش کو نمایاں کامیابی ملنے کا خاطر خواہ فائدہ یہ ہوا کہ اس فن میں انہوں نے سینکڑوں شاگرد چھوڑے جن میں دیا شنکر نسیم، رند، خلیل، نواب مرزا شوق اور صبا وغیرہ زیادہ مشہور ہوئے۔ آتش کے مقامی ہم عصروں میں سب سے زیادہ مشہور امام بخش ناسخ تھے۔ آتش کو دربار لکھنو سے وظیفہ کی رقم مقرر تھی۔ لکھنؤ کے اس دور کی شاعری اپنے انداز بیان لب ولہجہ اور مضامین کے اعتبار سے ایک ایسا رنگ رکھتی ہے جو دبستان دہلی کے شعراء مثلاً سودا، ذوق، درد، میر، مومن اور غالب وغیرہ کے کلام سے بالکل منفرد ہے۔

لکھنؤ کی شاعری موضوع، ہیئت، خیالات ومحسوسات یا واردات کیفیات کے قلبی پیش کش سے زیادہ اسلوب، طرز، ہیئت، لب ولہجہ اور انداز بیان پر توجہ دیتی ہے۔ اس میں داخلی احساسات کے بجائے خارجی مضامین پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کا اثر صاف طور پر نمایاں ہے۔ لکھنؤ شعراء کی نظر حسن اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیات سے زیادہ حسن کے لوازم پر پڑتی ہے۔ اس لئے ان کے شعراء نے کنگھی، چوٹی اور مبالغہ حد تو یہ ہے کہ محرم اور انگیا تک کا ذکر کیا ہے۔ یعنی خیال اور موضوع کے سلسلے میں پاکیزگی اور ابتذال کے فرق کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ان کی اصلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خیالات جیسے بھی ہوں لیکن اس کے پیشکش نہیں۔ عروض وبلاغت، علم وعروض اصطلاحوں کی پوری کوشش کی جائے۔ ان کے ہم عصر اور حریف ناسخ لکھنوی نے تو زبان کی درستگی کی ایک باضابطہ کوشش بھی شروع کی تھی۔ جس کی رو سے کچھ الفاظ رکھے گئے اور کچھ نکالے گئے اور اس طرح ان کے نزدیک اردو زبان پاک، وصاف بنائی گئی۔ دبستان لکھنؤ کے ان شاعروں کے کلام میں صفائی، محاورہ بندی اور روزمرہ یا مختلف صنعتوں کا استعمال کر کے یا سنگلاخ زمینوں اور مشکل قافیہ اور ردیف میں اشعار کہہ کر کے اپنی قدرت کلام کا شوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ یہ چیزیں بجائے خود ان کے نزدیک شوق گوئی کا مقصد بن گئی تھیں۔ یہ شاعری عبارت، بناوٹ، تصنع اور آورد سے پاک تھی۔ ان حالات کے پیش نظر ناقدین نے لکھنؤ کی شاعری کے لئے خارجیت کی اصطلاح وضع کی اور چونکہ دہلی کے شعراء عام طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ داخلی جذبات کو تاثر سوز و گداز اور فطری کیفیت کے ساتھ نمایاں کریں اس لئے دبستان دہلی کی شاعری داخلیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کے شعراء کے نزدیک بالخصوص شاعری ایک محض لفظی کھیل یا انداز بیان کی شعبدہ بازی رہی ہے اور ان کا کلام عام طور پر اثرات اور سچی شعریت کے اوصاف سے بہت دور نظر آتا ہے۔ عام طور سے آتش بھی خیال ومضمون سے زیادہ الفاظ وہیئت کی ہی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کہ کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

لیکن جو چیز آتش کو لکھنؤ کے چند دوسرے شعراء مثلاً ناسخ اور امانت لکھنوی وغیرہ سے ممیز کرتی ہے وہ یہ کہ آتش کے دل میں شاعری کی آگ واقعی روشن تھی۔ ان کے کلام میں رنگینی کیف ومستی اور شعریت کی مثال کثرت

ISSN No. : 2395-2016

سے ملتی ہے۔ ندی، جوش اور مستی کے انہیں نمونوں کی بنا پر کچھ لوگ آتش کو اردو کا حافظ بھی کہہ دیتے ہیں۔

آتش کی شاعری میں خارجیت کا عنصر غالب ہے لیکن ان کی خارجیت میں وہ شدت اور بے راہ دی نہیں جو امانت لکھنوی یا دیاشنکر نسیم وغیرہ کا خاصہ تھا۔ درحقیقت آتش نے اپنی خارجیت میں داخلیت کو شامل کرنے کی کوشش کی جس سے ان کے یہاں تغزل کا ایک جاندار رنگ پیدا ہو گیا۔ تغزل کا یہ رنگ ان کے بہت کم اشعار ہی میں نہیں بلکہ آنند پوری کی غزلوں میں موجود نظر آتا ہے اور یہ بات آتش کے فطری شاعر ہونے کی روشن دلیل ہے۔ ثبوت کے لئے ان کی غزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے مطلع ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

آتش نے اپنے کئی اشعار میں تصوف کے بہت سارے باریک اسرار و رموز پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً

حباب آمسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کے دریا کی جدائی کا
چاروں طرف سے جانا ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

ان شعروں میں صوفیانہ مسائل کی محض رسمی نظم بندی نہیں ہے۔ طرز ادا کی صفائی اور شائستگی، تشبیہ کی ندرت اور تازہ کاری نیز کیفیت و تاثر کا شعروں میں موجود رہنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آتش کو ایسے مضامین سے فطری لگاؤ تھا۔ آتش کے کام کی بنیاد ان کے مشاہدوں اور تجربوں پر تھی۔ دردمندی اور لب و لہجہ کا کلاسیکی رچاؤ آتش کی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ الختصر اپنی ان خصوصیات شاعرانہ کی بنا پر آتش نے صرف اپنے زمانے کے بہت سے شعراء کو متاثر کیا بلکہ ان کے بعد کے بھی کئی اردو شعراء پر ان کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں چکبست، میر انیس اور یگانہ یاس چنگیزی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ بلاشبہ آتش اردو کے ایک منفرد اور صاف طرز غزل گو شاعر ہیں۔

☆☆☆

فرحت بانو
ریسرچ اسکالر، مگدھ یونیورسیٹی گیا، 8678051395

جابر حسین کی افسانہ نگاری

جابر حسین کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اتنی جامع شخصیت بہار میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ شعروادب کے علاوہ انھوں نے سیاست میں بھی اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اس سے پہلے کہ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے کچھ لکھا جائے ان کے احوال وآثار کے تعلق سے کچھ باتیں تحریر کردی جائیں۔

سید جابر حسین کے احوال وکوائف پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:۔

> ''سید جابر حسین اصلی نام ہے لیکن جابر حسین کے قلمی نام سے معروف ہیں۔ ان کے پردادا محمد ہاشم حسین آباد، شیخ پورہ ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے۔ واضح ہو کہ اسی حسین آباد کی رہنے والی پروین شاکر بھی تھیں۔ بہار حسین آبادی ایک اہم پر گو شاعر کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں جن کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے ملتا ہے۔ جابر حسین اس خانوادے کے چشم وچراغ ہیں۔

جابر حسین نے بہار یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مونگیر کے ایک کانسٹی ٹیوٹ کالج میں لکچرر ہوئے۔ پھر ریڈر اور پروفیسر بھی لیکن زیادہ تر ان کی توجہ سیاست سے رہی۔ ۱۹۷۷ء میں مونگیر اسمبلی حلقے سے ایم ایل اے ہوئے اور وزیر صحت ہو گئے۔ ۱۹۹۴ء میں بہار قانون ساز کاؤنسل کے رکن نامزد کئے گئے اس کے بعد ۲۴ جولائی ۱۹۹۶ء کو کاؤنسل کے چیرمین ہو گئے۔ چیرمین شپ کی مدت کے خاتمہ کے بعد مئی میں دوبارہ قانون سازیہ کاؤنسل کے رکن ہوئے اور اسی سال ۳۰ جنوری کو دوبارہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک بہار ریاستی اقلیتی کمیشن کے صدر رہے۔

> جابر حسین اردو ہندی اور انگریزی زبانوں میں لکھتے رہے ہیں۔ اب تک سولہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں انہوں نے اردو فارسی اور ہندی زبان کی چوالیس تخلیقات کی ترتیب و اشاعت کا کام سرانجام دیا۔ اردو میں دستاویز کے علاوہ خبر نامہ بھی نکالتے رہے ہیں۔ دستاویز دراصل کاؤنسل کی کارگذاریوں پر محیط ہوتا ہے اردو مرکز کے ادبی رسالہ ''ترجمان'' اور ''اردو نامہ'' کے اڈیٹر رہے ہیں۔ ان کی اردو تصنیف وتالیف اس طرح ہیں۔

ایک ندی ریت بھری اشاعت ۱۹۹۲ء بہار کی پسماندہ مسلم آبادی (تجزیہ ۱۹۹۴ء) سن اے کاتب (ڈائری

۱۹۹۷ء) ریت پر خیمہ (ڈائری ۲۰۰۲ء) بے اماں (ڈائری ۲۰۰۲ء)۔

ان کی کتابوں کو الگ کیجئے تو بھی اردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں انہوں نے کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ دوسری کتابوں کے علاوہ وہاب دانش، پرکاش فکری اور صدیق مجیبی کے شعری مجموعے شائع کئے اور کئی دوسری اہم کتابیں بھی۔ لیکن ان کی حیثیت بنیادی طور پر ایک افسانہ نگاری ہی کی ہے۔ انہوں نے افسانے اردو ڈائری کی سرحدیں ملادی ہیں۔

جابر حسین کا افسانوی مجموعہ "سن اے کاتب" ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی پشت پر ناشر کی طرف سے ایک نوٹ درج ہے۔ اس کے چند ملاحظہ کیجئے۔

"اس کتاب میں جو کردار آپ کو ملیں گے وہ سب کے سب زندہ کردار ہیں۔ آپ چاہیں تو بہار کے گاؤں میں اپنی آنکھوں سے خود دیکھ سکتے ہیں۔

جابر حسین نے کہیں بھی کسی واقعے کا ذکر کرتے وقت نہ تو کرداروں کے نام بدلے اور نہ جگہوں کے۔ ان کا ماننا ہے کہ فرض اور قیاس ناموں سے ان تحریروں کی حقیقی روح مجروح ہوسکتی ہے۔ یہی سبب ہے خطرہ مول لیکر بھی کرداروں اور ان کے واقعاتی پس منظر کو اسی شکل وصورت میں آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جابر حسین نے جن حادثات و واقعات کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی قلمی تصویر براہ راست صفحہ قرطاس پر اتار دی۔ حتیٰ کہ مقام اور کردار کے نام تک نہیں بدلے۔ لیکن سماج کی سچائی اور ان کی عکس ریزی جابر حسین کے یہاں سپاٹ اور سیدھے بیانیہ کے طور پر نہیں بلکہ فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ رپورتنگ اور رپورتاژ سے بڑھ کر فنکار کا احساس ان بیانات میں رنگارنگی پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو پروفیسر وہاب اشرفی نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"جابر حسین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سچائیوں کو فکشن بننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ تصور یہ ہے کہ فکشن میں جھوٹ کی آمیزش سچ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہ کبھی جھوٹ فکشن بن کر سچ سے زیادہ تابناک ہو جاتا ہے۔ لیکن جابر حسین اپنی کہانیوں کو سچی کہانیاں کہتے ہیں لہٰذا ان میں دوہری آنچ محسوس کرنی چاہئے لیکن مشکل یہ ہے کہ خالق کا سچ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ذرا بھی آرائش کو برداشت نہیں کرتا۔ نتیجے میں آرتگی سے ماورا ان کے سارے افسانے دارفتگی کی سرحد پر نظر آتے ہیں۔

جابر حسین کے افسانے ضخامت کے اعتبار سے مختصر ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دوسرے عناصر ترکیبی لحاظ سے بھی مختصر افسانے کی تعریفِ پر پورے اترتے ہیں۔ ان کا سماجی شعور حد درجہ بالیدہ ہے۔ بیشتر افسانے بے حد پر اثر ہیں۔ جابر حسین نے ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں رونما ہوئے واقعات وحادثات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن واقعات و حادثات کی تکرار عام نگاہوں میں اپنی اہمیت و معنویت کھو رہی ہے۔

ISSN No. : 2395-2016

ہماری اجتماعی زندگی میں ان کی اہمیت بہر حال مسلم ہے۔ان واقعات وحادثات کے بار بار رونما ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ بے حس ہو چکا ہے۔خامیوں اور خرابیوں پر اب ہم نہیں چونکتے ہیں نہ ان کے خلاف نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ان افسانوں کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تین چار دہائیوں میں ہم اپنی سماجی زندگی کی کن اچھائیوں سے محروم ہو گئے ہیں اور بتدریج ہوتے چلے جارہے ہیں۔

''جابر حسین کا افسانوی مجموعہ'' سن اے کاتب روایت سے وابستہ بھی ہے اور اس سے الگ بھی۔روایت سے اس کی وابستگی اس لئے کہ اس کے مزاج میں پریم چند کے تیور کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور الگ اس طرح ہے کہ'' برہنہ حرف نہ گفتن'' کے خلاف جابر حسین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سچائیوں کو فکشن بننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔حالانکہ تصور یہ ہے فکشن میں جھوٹ کی آمیزش سچ سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی کہ کبھی جھوٹ فکشن بن کے سچ سے زیادہ تابناک ہو جاتا ہے۔لیکن جابر حسین اپنی کہانیوں کو سچی کہانیاں کہتے ہیں۔لہٰذا ان میں دوہری آنچ محسوس کرنی چاہئے لیکن مشکل یہ ہے کہ خالق کا سچ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ذرا بھی آرائش کو برداشت نہیں کرتا ہے۔نتیجے میں آرستگی سے ماورا ان کے سارے افسانے ایک خاص قسم کی وارفتگی کی سرحد پر نظر آتے ہیں۔ادب میں مختلف ہونا بڑی بات ہے۔میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ کوئی بڑی تخلیقی قوت یا خود بڑی تخلیق سامنے ہو اور اسے مثالی بنا کر اگر خالق کچھ کہنا چاہتے تو وہ ہمیشہ اس آئیڈیل سے کمتر کی کوشش ہوگی۔ظاہر ہے فنکار جو آگے بڑھنا چاہے گا وہ بندھے ٹکے ماڈل کو توڑنے پر مجبور ہوگا۔غالباً یہ فکر جابر حسین کے تخلیقی رویہ میں جاری وساری رہی ہے ورنہ انگریزی ادب کا ایک اچھا طالب علم اور استاد ہونے کے باوجود کیا جابر حسین کو اس کی خبر رہی ہے کہ استعارہ ساری تخلیق کے جوہر کو مزید صقیل کرتی ہے؟ لیکن نہیں، یہ سب کچھ جاننے کے باوصف ایک نئی راہ اختیار کرنے کا عزم اور طلب بھی ہے اور Challenging بھی میرا ذاتی خیال ہے کہ عمومی طور پر جابر حسین اپنے تمام افسانوں میں ایک Protest کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ہر سطح کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانا چاہتے ہیں۔ننگے بھوکے دلتوں کی مزاج پرسی کرتے ہوئے استحصال کرنے والوں کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں اور انسانیت کی شیرینی کو ہر سطح پر پہنچانا چاہتے ہیں۔

''۔۔۔۔واضح ہو کہ جابر حسین مابعد جدیدیت رویہ کے فنکار بن کر ابھرتے ہیں اس لئے ان کا ذہنی تعلق سب الٹران سے رہا ہے۔ان کا مرکزی مطالعہ پس ماندگان اور دلت رہے ہیں۔اس لحاظ سے بھی ان کی اہمیت ہے''۔

غرض کہ جابر حسین زندگی اور معاشرے کے استحصال اور اس سے پیدا ہونے والے دکھوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔یہ کام وہ کسی رپورٹر کی طرح نہیں کرتے اس میں کوئی صحافتی انداز اختیار بلکہ ہر جگہ تخلیق کی سطح محفوظ رکھتے ہیں۔گویا ان کی نگاہ میں مواد کو فنی طور پر برتنے کا نام ہی فنکاری ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے دل میں چبھتے ہیں اور محفوظ ہو جاتے ہیں۔یہی ان کا وصف خاص بھی ہے۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

طاہرہ خاتون
ریسرچ اسکالر (اردو) ایل این متھلا یونیورسٹی، در بھنگہ

اردو کا ایک منفرد افسانہ نگار۔ڈاکٹر محمد محسن

ڈاکٹر محمد محسن بین الاقوامی شہرت کے ماہر نفسیات تھے۔انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ قارئین کو شعور، لاشعور، وراثت اور ماحول کے ناگزیر اثرات سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر محمد محسن نے اڈنبرا یونیورسٹی انگلینڈ سے نفسیات میں پی ایچ۔ ڈی کیا تھا۔۱۹۶۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ نفسیات مقرر ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن یو جی سی پروفیسر کی حیثیت سے مزید پانچ سال شعبہ سے جڑے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اونچے اونچے نفس بخش عہدوں کے لیے آفر ملے لیکن انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔

ڈاکٹر محمد محسن کی وابستگی ملک کے بہت سے علمی، ادبی، ثقافتی اور ملی اداروں سے بھی رہی۔ بہت سے اعزازات وانعامات سے بھی نوازے گئے۔ان کی ادبی زندگی ناقابل فراموش رہی ہیں۔

ڈاکٹر محمد محسن کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ان کا پہلا افسانہ جو جولائی ۱۹۳۷ میں ''انوکھی مسکراہٹ'' کے نام سے ماہنامہ ''ساقی'' دہلی میں چھپا تھا، ادبی دنیا میں بے حد مقبول ہوا۔انہوں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۴ء تک یعنی صرف آٹھ سال افسانہ نگاری کی اور ان آٹھ سالوں میں صرف تیس افسانے لکھے جو ماہنامہ ''ساقی'' دہلی، ''معاصر'' پٹنہ اور ماہنامہ ''سہیل'' گیا میں شائع ہوئے۔ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ ''انوکھی مسکراہٹ'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔اس میں ۱۴ افسانے ہیں۔ان کا افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' مختلف درجات کے نصاب میں شامل رہا ہے۔یہ افسانہ اپنے طرز کا انوکھا نفسیاتی افسانہ ہے۔اردو کے کئی افسانہ نگاروں نے اس طرز پر افسانے لکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی اس مقام کو حاصل نہیں کر سکا۔

ڈاکٹر محمد محسن نے اپنے بیشتر افسانوں میں ورثہ اور ماحول کے ناگزیر اثرات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں کے کردار شعور سے زیادہ لاشعور کی گہرائی میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر قیام نیر اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد محسن کے افسانوں میں انسانی نفسیاتی کیفیات کی عکاسی ہر جگہ نظر آتی ہے۔چونکہ وہ ایک ماہر نفسیات انسان ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں نفسیاتی رنگ پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔''
>
> (بہار میں اردو افسانہ نگاری۔ڈاکٹر قیام نیر۔آزاد پریس، پٹنہ۔۱۹۹۵ء، ص:۲۴۲)

ISSN No. : 2395-2016

افسانے کے علاوہ ڈاکٹر محمد محسن کے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے ''نفسیاتی زاویئے'' (۱۹۸۰) اور ''جائزے'' (۱۹۸۷ء) ''سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' (منٹو کی حیات اور فن پر مبنی)، ''زخم کے پھول'' شعری مجموعہ (۱۹۸۸) اور خود نوشت سوانح حیات ''لمحوں کا کارواں'' (۲۰۰۲) شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد محسن نے انگریزی زبان میں بہت سے نفسیاتی مضامین لکھے ہیں۔ انگریزی میں لکھی ہوئی ان کی کئی کتابیں ملک و بیرون ملک کے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر محسن عظیم آبادی نے اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن انہیں زیادہ مقبولیت افسانے ہی کہ وجہ سے ملی۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے کرداروں میں فرائیڈ کے نظریات کی آئینہ سامانی شعوری طور پر کی ہے۔ چونکہ وہ فرائیڈ کے نظریات سے متاثر رہے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی گرہیں کھولنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ ''انوکھی مسکراہٹ'' شائع ہوا۔ اس میں صرف ۱۴؍افسانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ رسائل وغیرہ میں شائع ہونے والے افسانوں کی تعداد ۱۸ ہے۔ یعنی انہوں نے کل ۳۰؍افسانے لکھے۔ اتنے کم افسانے لکھنے کے باوجود افسانہ نگاری کے باب میں انہوں نے اپنا نام سنہرے حرفوں میں لکھوالیا ہے۔ کم افسانے لکھنے کے باوجود انہوں نے افسانوی ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔ اتنے کم افسانے لکھنے کے باوجود انہیں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانوں میں کتنی خوبیاں ہیں۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فطرت انسانی کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے انسانی شخصیت کی تعمیر کے دوگونہ نفسیاتی عناصر ورثہ اور ماحول کے ناگزیر اثر کو دکھایا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار شعور سے زیادہ لاشعور کی گہرائیوں میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان سے انسانی شخصیت کی گہرائی کا جلوہ نمودار ہوتا ہے:

> ''آپ اگر اپنے روزمرہ کے کردار کا صحیح جائزہ لیں تو بیشتر حالات میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کا ارادہ کچھ اور ہے اور آپ کا عمل کچھ اور۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے عمل و کردار کی کوئی غرض و غایت نہیں گو آپ انہیں بروئے کار لانے پر مجبور ہیں۔ انسانی قوت ارادی کا استحکام آپ کو بالکل متزلزل معلوم ہوگا اور اس کی آزادی قطعاً بے معنی۔''
>
> (تعمیر جنوں)

ڈاکٹر محمد محسن نے زیادہ تر افسانے انسانی نفسیات پر مبنی ہی لکھے ہیں لیکن ان کے کچھ افسانے ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ''مزدور کا بیٹا'' ان کا ایسا ہی افسانہ ہے جو ادبی حلقوں میں خاصا مقبول بھی ہو چکا ہے۔ دراصل ترقی پسند تحریک نے پورے اردو ادب کو متاثر کیا تھا۔ اس تحریک نے بہت سے شعلہ بیان اور شعلہ قلم فنکاروں کو پیدا کیا۔ بڑے بڑے ادیب و شاعر اس تحریک سے متاثر ہو کر شاہراہ ادب پر تیزی سے دوڑنے لگے۔ روایت سے بغاوت ہونے لگی۔ ادب کو ایک مخصوص نظریئے سے دیکھا جانے لگا۔ بھوک، پیاس، مزدوروں

اور کسانوں کا استحصال، طبقاتی کشمکش وغیرہ کے علاوہ بہت طرح کی اصطلاحیں ادب میں جگہ پانے لگیں۔ ایسے ہیں ڈاکٹر محمد محسن جیسے نفسیاتی افسانہ لکھنے والے افسانہ نگار بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ وقت اور حالات کے مطابق ان کے کئی افسانوں میں ان حالات کی ہلکی پھلکی جھلک نظر آنے لگی۔ پروفیسر کمال الدین کے مطابق:

''ان حالات کی صرف ہلکی سی جھلک ان کے بعض افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کا دیہات گاتا مسکراتا، روتا بسورتا نظر آتا ہے نہ سدرشن بالی، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کا پیارا نیارا اور انوکھا گاؤں اور نہ اس کے باشندے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نہ نیاز فتحپوری کی تخلیقیت وتصوریت ہے نہ سجاد حیدر کا معصوم رومان، ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کا فیشن آیا ہے نہ اختر اورینوی کی رومان بھری حقیقت نگاری ہی ملتی ہے۔ انہوں نے سب سے ہٹ کر اپنے افسانوں کی بنیاد انسان کے نفسیاتی عوامل ومحرکات پر رکھی ہے۔''

(تنقید کی زبان۔ ڈاکٹر ایم کمال الدین۔ آزاد پریس، پٹنہ، ۲۰۰۰،ص:۸۹)

ڈاکٹر محمد محسن کے افسانوں کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے تحلیل نفسی پر مبنی افسانے لکھے اور ایسے کردار وضع کئے جن کی نفسیات کسی نہ کسی واقعے یا حالات سے متاثر رہی۔ انہوں نے بچپن میں ذہن پر پڑنے والے انمٹ واقعات پر مبنی افسانے لکھے۔ بچپن کا دور انسانی نفسیات کی تشکیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ بچپن میں اگر کسی حادثے کا اثر ذہن پر پڑ جاتا ہے تو وہ زندگی بھر قائم رہتا ہے۔ ماحول کے اثرات غیر محسوس طریقے سے انسان کی شخصیت میں جذب ہوجاتے ہیں، بعد میں چل کر انسان اضطراری طور پر وہ کام کرنے کو مجبور ہوجاتا ہے، جس کو وہ نہیں بھی کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد محسن کے افسانوں کے پلاٹ کی بنیاد انسانی نفسیات پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار ذہنی کوائف کی عکاسی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

زبان وبیان کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے دلکش ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور رواں ہے۔ اگر کہیں جدت کی کمی دکھائی دیتی ہے تو کہیں تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

''انوکھی مسکراہٹ''، ''تعمیر جنوں''، ''ردعمل''، ''نئی ماما''، ''مزدور کا بیٹا''، ''خون کا اثر''، ''احساس گناہ'' اور ''جھوٹی بھوک'' وغیرہ ڈاکٹر محمد محسن کے بہت ہی اچھے افسانے ہیں۔

اب تک ان کے فن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اپنے افسانوں کی بدولت وہ اردو ادب میں ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے کیونکہ ان کے افسانوں کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔

افسانہ نگاری کی دنیا میں ان کا نام ادب واحترام سے لیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

شافعہ بانو: (پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر)
شعبہ اردو: کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر

ذوقی: ادب کے آئینے میں

ہندوستان کے صوبہ بہار نے جہاں زندگی کے بہت سے شعبوں میں بڑے بڑے فنکار و دانشور اور اہل قلم پیدا کیے ہیں، وہیں ادب سے تعلق رکھنے والے کئی ادیب جن میں بیدلؔ عظیم آبادی، جوششؔ، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادیؔ، جمیل مظہری، کلام حیدری، عبدالصمد، حسین الحق، شفق، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم وغیرہ جیسے ادب کے اہم ستون بھی ہمیں سرزمین بہار سے ہی ملے ہیں۔ ان عظیم ادیبوں میں ایک اہم شخصیت مشرف عالم ذوقی کی ہے جو نہ صرف قلم کے دھنی ہیں بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک، سچّے، ہمدرد اور حساس دل و دماغ کے انسان بھی ہیں۔

مشرف عالم ذوقی ۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء میں، صوبہ بہار کے ایک شہر (آرہ) میں سید نسل کے ایک چودھری خاندان میں اس عالمِ آب وخاک میں نمودار ہوئے۔ ان کا خاندان نہایت خوشحال، سماج میں باعزت اور علم دوست خاندان تھا۔ مشرف عالم ذوقی کے دادا چودھری محفوظ عالم ایک مشہور وکیل تھے اور سیاست سے بھی اُن کا گہرا تعلق تھا اُن کے گھر مہاتما گاندھی سے لے کر محمد علی جوہر اور اُن کی والدہ بھی آ چکی تھیں۔ ذوقی کا گھر کوٹھی کہلاتا تھا جہاں آئے دن شعر و ادب کی محفلیں منعقد ہوتی رہتیں تھیں۔ اسی ادبی ماحول میں مشرف عالم ذوقی نے آنکھیں کھولیں جہاں ان کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔ اُن کے والد جناب مشکور عالم بصیریؔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ بصیریؔ تخلص رکھا تھا۔ نہ صرف۔ شاعری کرتے تھے بلکہ خاموشی سے ادبی مضامین وغیرہ بھی لکھا کرتے تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُن کے گھر میں اردو، انگریزی کی بہت ساری کتابیں موجود تھیں۔ اُن کے چھ بچے تھے اور وہ ہمیشہ اپنے بچوں سے تعلیم کی طرف سخت توجہ دینے کو کہتے تھے۔ والد کے ساتھ والدہ بھی جو زیادہ پڑی لکھی نہ تھیں پھر بھی وہ اکثر بچوں کو پڑھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ بقول ذوقی: ''ہم تمام بچوں سے یہ کہا جاتا تھا کہ تعلیم ہی تمہاری زندگی کے لئے راستہ ہموار کر سکتی ہے'' ذوقی کے والد اُن کے بہت اچھے دوست اور آئیڈل تھے۔ زندگی کے ہر پہلو پر بحث ومباحث کرتے تھے اور قدم قدم پر ذوقی کی رہنمائی کرتے تھے۔ مشکور عالم بصیریؔ صاحب ہر روز اپنے بچوں کو داستانیں سُنایا کرتے تھے۔ اپنے والد کے کہانی کہنے کے انداز کے بارے میں ذوقی یوں رقمطراز ہیں:

''وہ ڈرامائی انداز میں ان کہانیوں کو بیان کرتے۔ آج محفلوں میں کہانیاں سُناتے ہوئے میں کسی حدتک اس انداز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر وہ ہنر کہاں جو ابّا حضور مرحوم کے پاس تھا۔''۱

ذوقی نے ابتدائی تعلیم کا آغاز قرآن شریف سے کیا۔ اسکے بعد ان کا داخلہ ''جین اسکول'' میں کروادیا گیا۔ اسکول کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ذوقی کہتے ہیں:

''میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ تب میں نے پہلی بار ریڈیو کے ایک پروگرام میں حصہ لیا۔ اُس وقت میرے ہندی کے گرو ہندی کے بہت بڑے ساہیتہ کار ''مدھوکر سنگھ'' تھے۔ مجھے یاد ہے۔ کہ اس دن مدھوکر سنگھ نے کلاس میں چھٹی کر دی تھی اور سارے بچوں کو بلا کر کہا کہ ''دیکھو ہمارے کلاس میں ایک ساہیتہ کار بچہ بھی ہے۔ اُسکی کہانی سُنو''۔ تو آٹھویں کلاس میں میری کہانی سُنی گی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ پرنسپل اور تمام بچے میری کہانی سن رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو بہت عجیب محسوس کرر ہا تھا کہ مجھے ایک نیا نام دیا گیا ہے جو ان لوگوں سے کہیں الگ تھا۔''۲

ذوقی کے ادیب بننے میں انکے خاندان اور ان کے والدین کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ذوقی کے ساتھ انکے بھائی بہن بھی ادب سے وابستہ ہیں اور اچھا ادب تخلیق کرر ہے ہیں۔ اُن کے بڑے بھائی ''مسرور آوری'' اردو کے ایک بڑے انشائیہ نگار ہیں۔ ان کی کتاب ''شرفوں کا ہوٹل'' شایع ہو چکی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ان کے پورے خاندان کو ہے۔ ذوقی نے ایم۔ اے تاریخ میں کیا اور ادب سے پورے طور پر وابستہ ہو گئے۔ ابتدائی کہانیاں بچوں کے رسالہ ''پیامِ تعلیم'' میں شایع ہوئی۔ اس ضمن میں ذوقی رقمطراز ہیں:

''ابّا حضور فرمایا کرتے تھے کہ بیٹا، ۲۴ سال کی عمر تک اگر کوئی شاہکار نہیں لکھا تو پھر کبھی نہیں لکھ پاؤ گے۔ بس ان کی یہ بات گانٹھ سے بندھ گئی اور ناول کا سفر شروع ہوا۔''۳

یہ وہ زمانہ تھا جب مشرف عالم ذوقی مطالعہ میں مگن تھے اور ۲۰ سال کی عمر میں چار ناول لکھ چکے تھے۔ ''عقاب کی آنکھیں''، ''نیلام گھر''، ''لمحہ آیندہ''، اور ''شہر چپ ہے۔'' پہلے ناول ''عقاب کی آنکھیں'' کی بنیاد بچپن میں سکیس کے اثرات پر رکھی گی تھی۔ اس ناول کے پیشِ لفظ میں ذوقی نے لکھا ہے:

''یہ ناول میری زندگی کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کو میں نے انتہائی کم عمری میں تحریر کیا۔ اس وقت میری عمر ہوگی یہی ۱۶۔ ۱۷ سال خواہش تو تھی کہ سب سے پہلے یہ ناول منظرِ عام پر آتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔''۴

اس ناول میں ایک بچے کے ذریعۂ انسانی فطرت سے فرار چاہنے والے ایک نفسیاتی مریض کی کہانی کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ محض ۱۷ سال کی عمر میں کوئی کیسے اتنا بڑا شاہکار لکھ سکتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس سے لے کر حفیظ بنارسی نے اس ناول کو بڑا ناول تصوّر کیا ہے۔ حفیظ بنارسی نے اس ناول کے متعلق لکھا ہیں

ISSN No. : 2395-2016

"یہ ناول ایک زندہ اور متحرک ناول ہے۔ روانی کسی بھی ناول کی جان ہوتی ہے اس ناول میں بھی Movement پورے طور پر موجود ہے۔ پڑھنے والے کو کسی بھی جگہ اکتاہٹ نہیں محسوس ہوگی اور وہ یہ جاننے کے لیے بیتاب ہوگا کہ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا" میری دلی خواہش ہے کہ اس انقلابی ناول کو زیادہ لوگ پڑھیں اور اس میں پیش کردہ خیالات سے مستفید ہوں۔ شاعر اور ادیب صرف زندگی کی ہو بہو عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ زندگی کی تہذیب وتزئین اور تعمیر کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ناول کی جس سے ملک میں امن وامان قائم ہو، بقائے باہم کا جزبہ پیدا ہو سخت ضروری ہیں۔ بحمداللہ مشرف عالم ذوقی نے اس کام کو بخوبی انجام دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ناول کو ادبی دنیا میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اسے زبردست مقبولیت حاصل ہوگی۔"۵

'عقاب کی آنکھیں' ناول کے علاوہ نیلام گھر، شہر چپ ہے، ذبح، مسلمان، بیان، پو کے مان کی دنیا، پرفیسر اس کی عجیب داستان، لے نس بھی آہستہ، آتشِ رفتہ کا سراغ، نالہ شب گیر، تک کا یہ سلسلہ ذوقی نے ہنوز جاری رکھا ہے۔ ذوقی کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ عالمی ادب پر بھی انکی گہری نظر ہے۔ وہ گہرائی سے معاشرہ اور سماج میں آنے والی ہر تبدیلیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ذوقی کے ناولوں میں سیاسی وسماجی بصیرت اور آگہی کی جو مثالیں نظر آتی ہیں وہ دور تک دکھائی نہیں دیتیں۔ اُن کی تحریر میں موجودہ سیاست کو سمجھنے کے بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ تقسیم کا معاملہ ہو، آزادی کے بعد ہونے والے فسادات ہوں یا کوئی اور سانحہ مثلاً بابری مسجد پران کا ناول "بیان" سامنے آیا۔ مسلمانوں کی پسماندگی اور آزادی کے بعد کے بدلتے حالات کو لے کر 'ذبح' اور بیان" جیسا ناول لکھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ذوقی نے اردو ناول کو علمی اور فنی نقطۂ نظر سے اُسی مقام پر پہنچادی ہے جہاں لیوتا   لستائے، بالزاک، دوستوفسکی جیسے عظیم لکھنے والوں کے بت تعمیر ہیں۔ ذوقی کا کنیوس بہت پھیلا ہوا ہے۔ ان کے موضوعات متنوع اور مسائل نہایت ہی پیچیدہ اور بے شمار ہیں۔ ذوقی کے منفرد موضوع، اندازِ بیان، تاریخی واقعات، مشاہدے کی گہرائی ایسے ناول بنا دیتے ہے جس کا ذکر موجودہ زمانے کے اہم ناولوں میں کیا جاسکتا ہے۔

ناولوں کے علاوہ افسانوی مجموعوں میں "بھوکا ایتھوپیا"، "منڈی"، "غلام بخش"، صدی کو الوداع کہتے ہوئے"، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے"، ایک انجانے خوف کی ریہرسل وغیرہ شایع ہو چکے ہیں۔ ذوقی کہانیوں میں نت نئے موضوعات کو برتتے رہتے ہیں۔ برصغیر کے اقلیتی ڈسکورس اور سماجی و انسانی سروکاروں کی انہوں نے اپنی تحریروں میں بھرپور ترجمانی کی ہے۔ "بھوکا ایتھوپیا" میں ۲۳ کہانیاں ہیں۔ ان میں زیادہ تر کہانیاں ہجرت کے قریب اور سلگتے مسائل کی کہانیاں ہیں۔ درصل تقسیم ہند ۱۵ سال کے بعد ذوقی کا جنم ہوا اور تقسیم کا گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں تھا۔ فرقہ وارانہ دنگے فساد جاری تھے۔ ذوقی کی

ابتدائی کہانیاں تقسیم کے بطن سے ہی جنمی تھیں۔ جیسے مرگ نیتی، ہم خوشبو خریدیں گے، ہجرت، مت رو سالک رام، اسی فساد کی دین تھیں۔ اس دور میں ادب کے حوالے سے نئے نئے مباحث سامنے آرہے تھے۔ کبھی جدیدت اور مابعد جدیدیت کے مباحث تھے تو کبھی ترقی پسندی کے بدلتے رجحانات تھے۔ ایسے میں ذوقی نے خود کو کبھی کسی ازم یا نظریہ کا پیروکار بننے نہیں دیا۔ انہوں نے جو بھی دیکھا، جن مسائل اور مشکلات سے انسان دوچار تھا اُن موضوعات پر اپنا خونِ جگر صرف کر کے ذوقی کہانی بُنتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ سر محمد اقبال کا ایک شعر ملاحظ ہو

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

مشتاق احمد اپنی کتاب ''جدید حسیت کا فکشن نگار'' میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر محمد حسن نے عصری ادب میں، نورتنوں کی فہرست میں ذوقی کو پہلے نمبر پر رکھا۔ یہ وہ دور تھا جب زمینی سچائیوں کو بیان کرنے کے ہنر میں اپنے عصر کے تمام افسانہ نگاروں سے کافی آگے نکل گئے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں ذوقی کی عمر بہ مشکل ۲۴ سال کی رہی ہوگی۔ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کے فن پاروں کو دیکھتے ہوئے اگر اردو کے ممتاز ناقد ڈاکٹر محمد حسن نے اس وقت انہیں پہلے پایدان پر جگہ دی تھی تو یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بہت عرصہ پہلے ہی ذوقی کے اندر عظیم افسانہ نگار کو محسوس کر لیا تھا۔''[۶]

اُن کا افسانوی ادب اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندی اور دوسری زبانوں کے رسائل و جرائد میں اُن کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہندی میں اُن کی کہانیوں کے ۱۹ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادب کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس پر ذوقی نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ انہوں نے تقریباً ۱۰۰ سے زائد تنقیدی مضامین لکھے اور ۱۰۰ سے زائد ڈوکومنیٹری فلمیں بھی بنائی ہیں۔ اُن کا ایک مشہور ڈرامہ ''گڈ بائے راجنیتی'' بابری مسجد پر لکھا ہوا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ذوقی کی وابستگی دوردرشن سے ہوئی تھی اُس وقت سیرل بھی بنائے۔ یہاں تک کہ اُن کے ناول ''مسلمان'' پر 'ملت' کے نام سے سیرل بنایا جو مشہور ہوا۔ مشرف عالم ذوقی کی ۵۰۰ سو کہانیاں ہندوستان و دیگر ممالک کے رسائل میں شایٔع ہو چکی ہیں۔

ذوقی کی ہمہ جہت شخصیت کا سب سے بڑا پہلوان کا مودبانہ رویہ ہے۔ وہ انگریزی، اردو اور ہندی کے اچھے قاری اور ادیب ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات کے عوض عالمی فروغ اردو دوحہ قطر سے بھی نوازا گیا۔ ذوقی کی کہانیوں میں ہجرت، غلامی، آزادی کے علاوہ مستقبل کی گونج بھی سُنی جاسکتی ہے۔

ذوقی حالاتِ حاضرہ کی کرب کو افسانہ بنا دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ مجموعی طور پر
یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج اردو فکشن پر کوئی بھی گفتگو ذوقی کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

☆☆☆

داؤد احمد

باندہ (یو۔پی)

اردو میں ناولٹ نگاری

ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی اہم مسئلہ اور اس کے خاص پہلوؤں کا مختصراً جائزہ لیتا ہے۔جس کی اپنی الگ تنظیم ہوتی ہے جو ناول سے قدرے مختصر مگر طویل افسانے سے زیادہ طویل اور تفصیلی ہوتا ہے۔ ناولٹ بھی ناول کی ایک شاخ ہے۔وہ ناول سے ایسا کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔بلکہ ناول کے فنی ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ناولٹ قصہ گوئی کے فن میں ایک جدت طرازی اور تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے نئے پیدا ہونے والے نئے فنکارانہ شعور نے اس کی تخلیق کی ہے۔اس کی ایک مخصوص ہیئت ہے وہ پڑھنے والوں پر ایک خاص طرح کا اثر کرتا ہے۔اردو ادب میں ناولٹ ایک اہم اور مقبول صنف کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ناولٹ ہیئت کے لحاظ سے ناول سے بہت قریب ہے۔کوئی بھی ادب خلاء میں پرورش نہیں پاتا،ادیب اپنا اظہار اپنی تخلیق کے توسط سے کرتا ہے۔دوسری اصناف کے بہ نسبت ناولٹ میں مقصد ابھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔چونکہ ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی خاص مسئلہ کو اپنا موضوع بناتا ہے۔اس لئے یہ ضروری نہیں کہ اس مسئلہ کا حل بھی مہیا کرے۔ناولٹ میں مقصد یا نقطۂ نظر کی افادیت تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی رقمطراز ہیں:

"ناولٹ کسی مخصوص فلسفۂ حیات کے بغیر نہیں کہا جا سکتا۔زندگی سے متعلق بغیر کسی واضح نقطۂ نظر کے اس کا ڈھانچہ تیار نہیں ہو سکتا اور اگر تیار بھی ہو جائے تو یہ عمارت استوار نہیں ہو سکتی بلکہ وہ واقعات کے مدو جزر کرداروں کے اقوال وافعال اور حرکات وسکنات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔"(۱)

ناولٹ نے اپنے ابتدائی دور سے آج تک تکنیک کے لحاظ سے کئی منزلیں طے کی ہیں اور تکنیک واظہار سے کئی اہم ناولٹ معرض وجود میں آچکے ہیں۔آج جو ناول شائع ہو رہے ہیں،تکنیک واسلوب کے لحاظ سے وہ ناولٹ کے دائرے میں ہی آئیں گے کیونکہ ناول کے لوازمات کو پیش کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج ناول نگاران فرائض کی ادائیگی سے بھاگ رہا ہے۔اس کا سبب آج کا مشینی دور اور کمپیوٹرائزڈ زندگی بھی ہے۔اب سماج میں کسی کے پاس فرصت درکار نہیں

کہ وہ بیٹھ کر ساری کائنات کے مسئلوں اور گتھیوں کو سلجھائے اسی ضرورت کے تحت افسانے وجود میں آئے چونکہ افسانے اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ کچھ لمحوں میں ختم ہو جاتے ہیں گویا قاری کو نہ ہی ذہنی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی پوری تشفی۔اور ان ضرورتوں کو ناولٹ سے پورا کیا جا رہا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی کے الفاظ میں ''ناولٹ ہی ایک سمجھوتے کی صورت پیش کرتی ہے۔''(۲)

ناولٹ کا میدان ناول کی طرح وسیع نہیں ہوتا کہ اس میں پلاٹ در پلاٹ اور ذیلی پلاٹ برتا جائے۔ناولٹ کا مزاج صرف سیدھا سادہ پلاٹ برداشت کر سکتا ہے۔پیچیدہ پلاٹ ناولٹ کے لئے ضروری نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے پلاٹ سادہ ہونا چاہئے....''ناول کی طرح موضوع ناولٹ کا بھی انسانی زندگی ہی ہوتی ہے لیکن اس انسانی زندگی سے وہ عموماً سادہ ہوتی ہے یعنی پلاٹ کا پلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتا اور افکار و واقعات اس میں نہیں سموئے جاتے ہیں۔'' ناولٹ کا ہیرو یا مرکزی کردار ایک طرح سے خاص ذریعہ جو پوری تخلیق میں رواں دواں نظر آتا ہے۔اس کے کرداریت، تشخص اور کارکردگی کے باعث ہی وہ سارے واقعات کا مرکزی لفظ بن جاتا ہے۔ناولٹ کی ساری خوبیاں اور دلکشی اس کے اردگرد رہتی ہیں اور پوری کہانی کے سارے واقعات سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔کردار کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔کردار کے تشخیص اور عمل کی تعبیر کرتے وقت مصنف کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس کے کردار حساس فطری اور آسان ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قاری کے ذہن و قلب کو متحیر کر دیں۔ناولٹ میں سارا زور مرکزی کردار پر صرف کرنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب ہر گز نہیں کہ ان کے علاوہ جو کردار پیش کئے جاتے ہیں جامد ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کرداروں کا تعلق مرکزی کردار کی اہمیت اور افادیت کو بڑھانے کے ساتھ ہی ساتھ ان کا اپنا مقام بھی معین و مخصوص ہے۔ناولٹ کے کرداروں کو نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی دکھایا جاتا ہے۔ظاہر ہے ایسا کرنے سے ان کی سیرت اور تشخیصیت نمایاں ہوتی ہے۔یہ کرداریت، داخلی کشمکش اگر ان کے سماجی کاموں میں رکاوٹ بنکر نہیں آتا تو بلاشبہ ناولٹ اپنے دلکش تاثرات پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

ناولٹ میں مکالمہ کی اپنی خاص اہمیت ہے۔جس کے سہارے پلاٹ اور کرداروں کا ارتقا ہوتا ہے۔مکالمہ نگاری کے لئے ناولٹ نگار کو ذہن و شعور کی گہرائیوں سے کام لینا پڑتا ہے اور فنی بصیرت اس کے لئے لازمی امر ہے۔اگر ماحول کو سامنے رکھے بغیر مکالمے سے کام لیا جاتا ہے تو تخلیق کے سارے پہلو ہم آہنگ نہ ہو پائیں گے اور ناولٹ اپنے فن پر پورا نہیں اتر سکتا۔ناولٹ کی اولین شرائط میں شامل ہے کہ مکالمہ برمحل ہوں، طویل اور بے جا باتوں سے پرہیز کیا جائے۔اگر ان چیزوں سے احتراز

نہ کیا گیا تو ناولٹ کے مکالمے مجروح ہو کر بے جان ہو جائیں گے۔ناولٹ نگار اپنا موثر اور واضح مفہوم دینے والی چیزیں پیش کرے اور رمز و اشارے کنائے کی مدد سے وہ اپنی زبان کو ترتیب دے۔ ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر گھنشیام مدھوپ مکالمہ کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کہانی کے ارتقا اور کردار نگاری، دونوں کو ظاہر کرنے میں ناولٹ کے مکالمے کافی ہوتے ہیں چونکہ اس کا پلاٹ مختصر ہوتا ہے۔ تفصیل اور بیانیہ انداز تقریباً نہیں ہوتا۔''(۳)

مکالمے کی زبان کرداروں کے لحاظ سے ترتیب دی جانی چاہئے ۔ناولٹوں میں کردار شہری اور کلچرڈ طبقہ کا ہے تو اس کو اپنے ماحول کا مترجم ہونا چاہئے۔اسی طرح اگر کسان مزدور جو دیہات میں زندگی گزارتے ہیں اور اپنی مخصوص زبان میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کی زبان اسی طرح کی ہونی چاہئے۔ناولٹ نگار کو اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے سبھی کرداروں کی اپنی زبان ہو۔ جہاں تک مکالمہ کا سوال ہے ناولٹ میں مکالمہ ایک ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ مقصد، اس لئے ماولٹ نگار کو مکالمہ پیش کرتے وقت واقعات ماحول حالات اور کرداروں کے مزاج پر گہری نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔اگر یہ تمام لوازم مدغم ہیں تو بلاشبہ ناولٹ کامیاب ہوگا۔مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناولٹ کے لئے مکالمہ بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ پلاٹ کردار یا زبان۔

ناولٹ نگار زندگی کے کسی خاص مسئلہ کو ہمارے سامنے ایک مجسمہ کی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔اس کا حل تلاش کرنا قاری کی ذمہ داری ہوتی ہے۔لیکن اگر غور وخوض کیا جائے تو مصنف کا یہ عمل مقصد ہی میں شمار کیا جائے گا کہ وہ سماج اور زندگی کے کسی پیچیدہ اور عصری مسئلے کو ہمارے سامنے پیش کر دے۔لیکن اس کا حل یا تفصیل بیان کرنا اس کا کام نہیں۔ناولٹ کا خاتمہ اس طرح ہونا چاہئے کہ قاری کچھ لمحہ کے لئے تفہیم اور تجسس میں مبتلا ہو جانے پر مجبور ہو۔ناولٹ میں مقصد کی پیش کش ایسی ہونی چاہئے کہ قاری کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دے۔ناولٹ نگار بہ حیثیت رہنما یا سماجی کارکن کام نہیں کرتا بلکہ وہ جس معاشرے میں زندگی گذارتا ہے اسی سماج کے عصری زیر و بم کی عکاسی کرتا ہوا اس کے اہم اور مقدم مسئلے کو پیش کرنا ہی اس کا عین مقصد ہوتا ہے۔ناولٹ نگار کا مشاہدہ وسیع بسیط، عمیق اور گہرائی کا حامل ہوتا ہے۔وہ زندگی اور سماج کے تمام تغیرات، محرکات، تجربات ومحسوسات سے خاصی واقفیت رکھتا ہے۔ظاہر ہے جس فنکار کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوگی اس کی تخلیق میں پیش کردہ تجزیہ زندگی میں بلا کی گہرائی اور گیرائی نظر آئے گی۔ناولٹ کا دائرہ چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا ناولٹ نگار کو غزل گو کی طرح ہونا چاہئے۔جو ایک شعر میں کبھی کبھی اتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے کہ جس کی تفسیر ضخیم کتابوں پر بھی بھاری ہو جاتی ہے۔ناولٹ کی

ارض القا پر قدم رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف اپنی شخصیت کو کبھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ اس کے تجربات ومحسوسات خود بخود باہر آجاتے ہیں۔ غرضیکہ ناولٹ کسی ایک خواب کی تجسیم پیش کرتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ جوئے شیر کا لانا ہے۔ کیونکہ پلاٹ کے مطابق ہی کرداروں کی تخلیق کرنا ہوتی ہے۔ کرداروں کی تعداد ضرور کم ہوتی ہے لیکن ان کی شخصیت کو ابھارنے کے لئے کار آگہی اور توجہ درکار ہے۔ شخصیت پیدا کرنے کے لئے ناولٹ نگار کو ماہر نفسیات کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ دل ودماغ کے تموج کی تصویر پلاٹ میں فعالیت پیدا کرتی ہے اور کرداروں کی جاذب توجہ بناتی ہے۔ ناولٹ کا کردار بالخصوص ہیرو کو کبھی کبھی غیر معمولی بھی بنانا پڑتا ہے کیونکہ اس سے اس کی شخصیت کے خال وخط پوری طرح ابھر سکتے ہیں۔ اس کو خود سے کشمکش میں مبتلا کیا جاسکتا ہے اور اس کشمکش میں اس کی شخصیت نکھرتی ہوئی دکھائی جاسکتی ہے۔ ناولٹ کی کامیابی یا ناکامیابی کا دارومدار کردار نگاری پر ہے۔

ناولٹ نگار خالق ہوتا ہے۔ وہ جس دنیا کی تخلیق کرتا ہے وہ ہمارے محسوسات ،محرکات، جذبات، مشاہدات اور مثبت نتائج کی دنیا ہوتی ہے۔ اپنے تہہ گیر مشاہدے کے ذریعہ وہ ایسے کردار اور ایسی صورت حالات کو متصور کرتا ہے۔ جس سے تھوڑی دیر کے لئے قاری یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ واقعات سے دوچار ہو رہا ہے۔ ناولٹ میں پیش کردہ تجزیہ زندگی کا بڑا تہہ گیر تجزیہ ہوتا ہے۔ ناولٹ نگار کی چشم مشاہدہ کسی ایک ہی افق پر مرکوز نہیں ہوتی اسے ہمارے محرکات ومحسوسات کا ارتقائی علم رہتا ہے وہ اپنے تجربات کا سیر حاصل نچوڑ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ ناولٹ نگار جس مقصد کو سامنے رکھ کر ناولٹ کی تعمیر کرتا ہے اس میں سے مواد اور اسلوب کی آمیزش کا فنی طریقہ اظہار ہی تکنیک کی کامیابی ہے۔ ہمارے ناولٹ نگاروں نے شعور کی رو، حوالا جات اور Association of Ideas وغیرہ کی تکنیک کا برمحل تجزیہ کیا ہے۔ بیانیہ اسلوب میں ناولٹ زیادہ لکھے گئے اور آج بھی لکھے جارہے ہیں لیکن کچھ فنکاروں نے اس میدان میں کئی تجربے کر کے اس صنف ادب کو فروغ دیا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے ناول اور ناولٹ میں کوئی فرق نہیں۔ کم وبیش اسی طرح کے اسلوب میں ناولٹ بھی لکھے جارہے ہیں۔ ناولٹ سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ نرائن لکھتے ہیں:

''ناولٹ میں اسٹائل کے وہ سبھی اجزاء موجود ہیں جو کہ ناول میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ سوانحی، بیانیہ، خطوط کی شکل میں، منظوم، ٹکڑوں ٹکڑوں میں اور ان سب کو ملا کر ایک مجموعی اسلوب بھی رہا ہے ان اسلوب میں مختلف ضخیم ناول کے میدان میں اب تک جتنے طرز کا استعمال کیا گیا ہے ناولٹ میں بھی ان سبھی اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔'' (۴)

ISSN No. : 2395-2016

ناولٹ کے اسٹائل کی تقلید اردو ناولٹ نگاروں نے مغربی ادب کے ناولٹ سے کی ہے گو کہ آج ان رائج اسلوب میں اردو کا اپنا الگ طریقۂ کار ہے جس کے سبب متعدد جدید تجربے دیکھے جا سکتے ہیں ۔جن اسالیب میں ناولٹ لکھے جا رہے ہیں ان میں بطور خاص بیانیہ اسلوب، نفسیاتی اسلوب، خطوطی اسلوب، ڈائری اسلوب، سوانحی اسلوب، علامتی اسلوب، اساطیری و دیگر اسالیب ہیں۔

ناولٹ دراصل ناول کی ہی ایک ایسی شکل ہے جو ماحول اور اس کی تفصیلات میں فرق پیدا کرتی ہے ۔ناولٹ میں بھی ناول ہی کی طرح کردار نگاری، پلاٹ، زبان و اسلوب اور عصری ماحول کی عکاسی کی جاتی ہے ۔ناولٹ کے مستقبل اور امکانات پر غور کیا جائے تو یہ چیزیں خاص کر مددگار ثابت ہوں گی کہ ناولٹ میں بھی اسٹائل کے وہ سبھی اجزاء موجود ہیں جو کہ ناول میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ ''آتم کتھانک شیلی''، بیانیہ طرز، خطوط کی شکل میں منظوم، ٹکڑوں ٹکڑوں میں اور ان سبھوں کو استعمال کر کے ایک مجموعی اسلوب بھی رہا ہے۔ان اسلوب میں مختلف ناولٹ بھی لکھے جا چکے ہیں ۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضخیم ناول کے میدان میں اب تک جتنے طرز کا استعمال کیا گیا ہے۔ناولٹ میں بھی ان سبھی اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کی قدروں کو اور روایتوں کو ناولٹ اور ناول دونوں میں برابر طور سے اہمیت دی گئی ہے ۔ناولٹ میں بھی ناول نگار اپنی بات کو اتنی ہی گہرائی سنجیدگی اور پر اثر انداز ڈھنگ سے پیش کر سکتا ہے جتنا ناول میں ۔(۵)

اردو میں ابھی اچھے ناولٹ کم لکھے گئے ہیں ۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ناول نگاری کی کوئی مضبوط روایت موجود نہیں، جب اچھے ناول ہی نہیں لکھے گئے ہیں تو پھر ناولٹ کی نازک تکنیک کو کس طرح برتا جا سکتا ہے ۔ناول نگاروں میں لے دے کر ایک پریم چند ہیں جنھوں نے بعض اچھے ناول لکھے ہیں ۔لیکن تکنیک کے اعتبار سے ان کے ناولوں کو بھی شاہکار نہیں کہا جا سکتا۔ پریم چند میں ناولٹ کی تکنیک کا شعور نہیں تھا یہ شعور ہمارے یہاں ان کے بعد کے لکھنے والوں نے ناولٹ کی تکنیک کا تجربہ کیا ہے۔سید سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات''، عصمت چغتائی کا ''ضدی'' اور عزیز احمد کا ''مرمر اور خون'' اور ''ہوس'' کسی حد تک اس تکنیک کے تحت شمار کئے جا سکتے ہیں۔

ناولٹ کے اسالیب سے متعلق جو باتیں مجموعی طور پر کہی جا سکتی ہیں وہ یہ کہ بیانیہ اسلوب ناولٹ کو کچھ زیادہ راس آیا۔ البتہ کچھ نئے تجربے ضرور ہوئے جو ناولٹ کی سادہ نگاری سے مختلف اور تجرباتی قسم کے ہیں ۔ناولٹ کے لئے تخلیقی زبان کا ہونا اولین شرط ہے یہ الفاظ دیگر جس سماج میں ہم سانس لے رہے ہیں اسی معاشرے کی روزمرہ کی زبان ہونی چاہئے کیونکہ قواعد اور لغت سے مرصع زبان

ناولٹ کا مزاج برداشت کرنے سے قاصر ہے۔کامیاب ناولٹ نگار اپنے مقصد اور فن کو بروئے کار لانے کے لئے اپنی زبان ہی استعمال کرتا ہے لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ناولٹ کی زبان سادہ بھی ہوتی ہے اور تخلیقی بھی۔یعنی علامتی زبان میں بھی ناولٹ لکھے جاسکتے ہیں چونکہ زبان واقعہ یا قصہ بیان کرنے کا ذریعہ ہے،اصل مقصد نہیں۔ناولٹ نگار کی زبان سادہ بھی ہوسکتی ہے تخلیقی بھی اور علامتی بھی۔اس لئے یہ پابندی عائد کرنا کہ ناولٹ کی زبان صرف سادہ ہونی چاہئے غلط ہے۔ناولٹ نگار اپنے اظہار کے لئے جو بھی طریقہ اختیار کرتا ہے وہ مناسب ترین ہوتا ہے لیکن اگر وہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو قصہ کو کمزور کرتی ہے یا کسی طرح ناولٹ کو کمزور کرتا ہے تو یہ اس کی خامی کہی جاسکتی ہے۔اردو میں کامیاب ناولٹوں کی زبان ہمارے سماج اور معاشرے میں بولی جانے والی زبان ہی ہے۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ناولٹ علامتی نہیں ہوسکتے یا علامتی زبان میں ناولٹ نہیں لکھے جاسکتے۔تجربات کے لئے ادب کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

حواشی

۱۔ڈاکٹر عبادت بریلوی: ناولٹ کی تکنیک مشمولہ نقوش،لاہور شمارہ ۲۰۔۱۹،صفحہ۔۲۰۷

۲۔ڈاکٹر احسن فاروقی: ادبی تخلیق اور ناول،صفحہ۔۱۳۷

۳۔ڈاکٹر گھنشیام مدھوپ: ہندی لگھو اپنیاس،صفحہ۔۶۰

۴۔ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن: ہندی اپنیاس کلا،صفحہ۔۲۶

۵۔ایضاً....

ISSN No. : 2395-2016

رابعہ خاتون
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

شفق کی افسانہ نگاری

پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر مظفر اقبال، مشفق خواجہ وغیرہ کی کتابوں اور تحقیقی مقالوں سے بھی ثابت ہے کہ بہار ابتداء سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں ہر عہد میں نامور شعراء وادباء کے تاریخ ساز علمی وادبی کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ رہے ہیں۔ اردو فکشن کے حوالے سے بھی صوبۂ بہار کی ادبی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ جس کا اعتراف نامور ناقدوں اور محققوں نے بھی کیا۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی اردو افسانہ ایک نئی تاریخ رقم کرنے میں کامیاب ہے۔ سہیل عظیم آبادی سے لے کر مشرف عالم ذوقی نے اردو فکشن کو ایک نیا وقار اور عالمی ادبی معیار سے روشناس کرایا ہے۔

بہار میں اردو افسانے کی ایک عظیم روایت ہمارے سامنے ہے۔ ناول ہو یا افسانہ، یہاں کے فکشن نگاروں نے ہر عہد اور بدلتے ہوئے قومی حالات کے تحت کئی شاہکار تخلیقات اردو ادب کو دیئے ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی، علمی و ادبی تحریکات، ملک کی آزادی، تقسیم وطن، فرقہ وارانہ فسادات اور ان تمام معاملات و موضوعات کو قلم بند کیا ہے جو اس عہد کے مطالبات میں شامل تھے۔ یہ کہنا کسی طور غلط نہیں ہوگا کہ اردو کی افسانوی روایت میں صوبۂ بہار کا کردار نہ صرف قابل ذکر ہے بلکہ ایک خاص اہمیت کا حامل بھی ہے۔ بہار کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اردو کی خواتین ناول نگاروں کی تاریخ میں ''اصلاح انساء'' کو اوّلیت کا مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ بقول سید احمد قادری:

> ''بہار میں اردو افسانے کی شاندار روایت رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی محمود کا افسانہ ''چھاؤں (مطبوعہ مخزن جنوری ۱۹۰۴ء) اگر صرف ایک ماہ قبل شائع ہو جاتا تو اس وقت بہار کو اردو افسانے کا دوسرا نہیں بلکہ پہلا موجد قرار دیا جاتا۔ اس لئے کہ راشد الخیری اپنے افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کے مخزن، دسمبر ۱۹۰۳ء کی اشاعت سے اردو افسانے کے امام تسلیم کیے گئے۔''

یہ ایک علمی، ادبی اور تاریخی صداقت ہے کہ بہار ابتداء ہی سے اردو فکشن کا ایک اہم مرکز ومحور رہا ہے یہ اور بات ہے کہ اس جانب تحقیقی وتنقیدی کام ذرا تاخیر سے ہوا۔ بہر کیف اس میں کسی شک وشبہ کی کہیں کوئی

گنجائش نہیں کہ صوبۂ بہار ہر اعتبار سے ہر عہد میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد آج بھی اردو زبان و ادب کے حوالے سے جو علمی و ادبی کام بہار میں ہو رہا ہے اسکی کوئی دوسری نظر دور تک کہیں اور نظر نہیں آتی۔

بہار میں اردو افسانے کے اوّلین دور میں علی محمد، محمد مسلم عظیم آبادی، علی اکبر کاظمی، جمیل مظہری، نورالہدیٰ ندوی، آفتاب حسن، فائز عظیم آبادی وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ دوسرا دور ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز سے ہوتا ہے اس عہد میں سہیل عظیم آبادی، پروفیسر سید اختر اور ینوی، شکیلہ اختر، ذکی انور، شین مظفر پوری، کلام حیدری، غیاث احمد گدّی، الیاس احمد گدّی، انور عظیم، محمد محسن، اختر قادری، وہاب اشرفی نے اردو افسانے کو ایک نئی سمت اور نئی راہ سے روشناس کرایا۔

بہار میں اردو افسانے کا تیسرا دور احمد یوسف، شفیع جاوید، ظفر اوگانوی، ذکی انور، فاروق راہیب، منظر کاظمی، گربچن سنگھ، شفیع مشہدی، حسین الحق، عبدالصمد، شوکت حیات، شموئل احمد، شفق، شمیم افزا قمر علی امام، ذکیہ مشہدی، مشرف عالم ذوقی، صلاح الدین پرویز، غضنفر، قمر جہاں، شمیم صدقہ، اعجاز شاہین، قاسم خورشید، مشتاق احمد نوری، شمیم قاسمی، فخر الدین عارفی وغیرہ نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک نئی تازگی و توانائی سے ہمکنار کیا۔

جدید اردو افسانے کی تاریخ میں شفق کی خدمات نہ صرف قابل ذکر ہے بلکہ ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا شمار اردو فکشن کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شفق کے یہاں زندگی اور زمانے کے دکھ درد، انسانی قدروں کی پامالی، حق تلفی و ناانصافی ڈوبتے ابھرتے، ہنستے بولتے انسانوں کی ترجمانی ہم آسانی سے انکے افسانوں میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں افسانوی زبان و بیان اور برتنے اور سنوارنے کا ہنر بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے افسانوں کے ذریعے سماجی و معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کچھ اس طرح سے کی ہے کہ یہ ہمارے اردگرد کی زندگی سے وابستہ و پیوستہ معلوم ہوتے ہیں۔ سماج اور سماجی زندگی سے وابستہ ان کے کردار اکثر و بیشتر افسانوں کے کردار بنتے ہیں۔ کہانی اور قصہ گوئی کے ہنر سے نہ صرف وہ واقف ہیں بلکہ اسے برتنے کا ہنر بھی بخوبی جانتے ہیں۔ پلاٹ و کردار میں استعاراتی و علامتی ماحول کو نہایت ہی خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کچھ اس انداز سے شفق کے یہاں جابجا آسانی سے تلاش کئے جاسکتے ہیں جیسے وہ ہمارے اسی ماحول و معاشرے کے زندہ کردار ہوں۔ افسانے کے لئے جن باریک بینی اور ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بخوبی اس فن سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ افسانے کس طرح زندگی سے ہمکنار ہوتے ہیں اس کا بھی انہیں بخوبی مشاہدہ ہے۔ میرے خیال میں شفق جدید اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنا ایک الگ ہی مخصوص و منفرد مقام و

ISSN No. : 2395-2016

مرتبہ بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ بقول نامور فکشن نگار حسین الحق:

"مختصر یہ کہ شفق کا فن مسلسل مائل بہ ارتقار ہا اور وسیع تر انسانی صورت حال سے ہم آہنگ بھی۔ ظاہر ہے جس فنکار کا فن مسلسل بہ ارتقاء ہو اور اس کی فکر وسیع تر انسانی صورت حال سے ہم آہنگ ہو اس کے فنی بلوغ اور وسیع تر موضوعاتی افق کو تسلیم نہ کرنا ادبی بے ایمانی کے مترادف ہوگا۔"

سچ یہ ہے کہ غیاث گدی، سریندر پرکاش، بلراج مین را، انور سجاد، خالدہ اصغر، احمد یوسف، کلام حیدری وغیرہ کے بعد اور آس پاس سامنے آنے والے افسانہ نگاروں میں شفق بہت اہمیت اور اعتبار کے حامل تھے اور رہیں گے۔

یوں تو شفق کا افسانوی سفر 1970 سے قبل شروع ہو چکا تھا اور کئی افسانے بھی منظر عام پر آچکے تھے مگر 1970 کے بعد ان کے افسانوں نے ایک نئی کروٹ لی۔ ان کے یہاں اب پورے آب و تاب کے ساتھ افسانہ پوری شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت اور انسانی نفسیاتی پیچ وخم کو بالکل ہی ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کا انداز سامنے آتا ہے۔ سیاسی و سماجی اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رنگ روپ کے پس منظر میں ان کا افسانہ "دوسرا کفن" سامنے آتا ہے۔ پریم چند نے اپنے شاہکار افسانہ "کفن" کو جس موڑ و منزل کو پہنچایا وہاں سے شفق کا "دوسرا کفن" کی شروعات ہوتی ہے۔ گاؤں والوں سے حاصل کفن کے پیسہ کو گھیسو اور مادھو موج مستی اور عیش و مسرت میں کٹا کر بے سدھ پڑ جاتے ہیں اور جب خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو بدھیا کی چتا کہ کفن اور گاؤں والوں کی لعنت ملامت کا خوف ان دونوں کو ستانے لگتا ہے اور گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں:

"گاؤں سے کچھ پہلے ایک سوکھا ہوا پیڑ دیکھ کر گھیسو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، ہم بھی کتنے مورکھ ہیں کفن کفن کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی چیز آگ ہے، ہمیں چتا کی کوئی فکر نہیں آخر لکڑی چاہئے کہ نہیں۔"

مادھو نے باپ کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ بڑوں کی بدھی بڑی ہوتی ہے۔ کفن نہیں تو ہم چتا کی لڑکی لے گاؤں جائیں گے۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا اچھا رہے گا۔

شفق نے اپنے اس افسانے کے ذریعہ جمہوریت میں انصاف کے ساتھ ترقی و خوشحالی کا منظر نامہ بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ شفق کے تمام افسانوی مجموعے "سمٹی ہوئی زمیں"، "سب گزیدہ"، "شناخت" اور "وراثت" کے تمام افسانے نہایت خوبصورتی اور دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ جدید اسلوب کے ساتھ ساتھ استعارہ، تلمیح اور علامت پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

☆☆☆

ریحان احمد قادری

ریسرچ اسکالر، (اردو) ایل۔این۔ایم۔یو، دربھنگہ

عطا عابدی کی نظمیں

(ایک تعارفی مطالعہ)

عطا عابدی اردو شعر ادب کی دنیا میں شگفتہ و پاکیزہ فکر و آواز کے سبب اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ شعر و ادب کے علاوہ تحقیق و تنقید اور ادبی صحافت کے حوالے سے بھی ان کی خدمات قدر و قیمت کی روشن جہتیں طے کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی ادبی کارگزاریاں وسیع اور متنوع ہیں۔ حمد و نعت کے تین مجموعے، غزلوں کے دو مجموعے، نظموں کے دو مجموعے، تحقیق و تنقیدی مضامین کے دو مجموعے اور ادب اطفال کے ضمن میں کہانیوں اور نظموں کا الگ الگ ایک ایک مجموعہ ان باتوں کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں، ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ شخصی و تاثراتی مضامین، انٹرویوز، مختلف رسالوں میں شائع کالم اور افسانوی نگارشات بھی عطا عابدی کی ادبی خدمات کے حوالے ہیں۔ ان سب کاموں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور شعر و ادب میں ان کی سرگرمیاں قابل رشک قرار پاتی ہیں۔

جہاں تک ان کی نظموں کا تعلق ہے ان پر بہت کم گفتگو ہوئی ہے۔ شعر و ادب کے باب میں ان کی غزلوں کی پذیرائی خوب ہوئی ہے۔ وقت کے متعدد مشاہیر ادب نے ان کی غزلوں پر لکھا اور داد تحسین سے نوازا ہے۔ نظموں پر لوگوں کی توجہ کم ہوئی ہے لہٰذا عطا عابدی کی نظمیں بھی وقت کے اس مزاج کے سبب سیر حاصل گفتگو کا موضوع نہیں بن سکیں حالانکہ انہوں نے ایک ساتھ غزل اور نظم کا سفر شروع کیا تھا۔ ایک ساتھ سفر کے باوجود وہ غزل میں آگے ہو گئے تو اس کی وجہ بھی ہوگی۔ خود عطا عابدی کے لفظوں میں:

> ''میں نے غزل و نظم ساتھ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ابتدا میں غزلوں سے زیادہ نظمیں شائع ہوئیں بعد میں غزل نے یوں اسیر بنایا کہ نظم کی طرف توجہ کم رہی۔''

(زندگی، زندگی اور زندگی/عطا عابدی/۲۰۱۰/ص:۱۰)

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ نظم کی طرف توجہ کم ہوگئی یا لوگوں نے بے اعتنائی برتی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ لہٰذا وہ مزید لکھتے ہیں:

"کچھ رسالوں میں شائع نظموں کے سبب کئی تحریروں میں ان کا ذکر آیا جو حوصلہ بخش ثابت ہوا۔ زیر نظم مجموعہ نظم کو اس حوصلے کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے......." (ایضاً)

ہر چند کہ حمد و نعت نظم کا ہی صنفی حصہ ہے لیکن عام طور پر لوگ اسے الگ صنف کے طور پر لیتے ہیں۔ نظموں کے حوالے سے گفتگو مقصود ہو تو اس میں حمد و نعت کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا یہاں بھی وہی روش اختیار کر رہا ہوں اور عطا عابدی کی تحریر کردہ حمد و نعت کے مجموعے "آئینۂ عقیدت"، "عکس عقیدت" اور "افکار عقیدت" کے مطالعے سے فی الوقت خود کو الگ کر رہا ہوں۔

عطا عابدی کی نظمیں مجموعی طور پر سب سے پہلے "زندگی، زندگی اور زندگی" کی صورت میں سامنے آئیں۔ نظموں کا یہ مجموعہ ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں ۵۶ نظمیں شامل ہیں۔ مجموعہ میں شامل نظم "سعی رائیگاں کا چاند" سب سے پرانی اور ابتدائی نظم کہی جا سکتی ہے کیونکہ یہ نظم جہاں ادارہ حلقۂ فکر وفن دربھنگہ کے کتابچہ "وادیٔ نشاط" (۱۹۸۲ء) میں بھی شامل ہیں وہیں ماہنامہ ساز سرمدی دہرہ دون کی شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں شامل نظمیں اور ان کے اشاعتی حوالے اس طرح ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

نظم کرب آگہی حُب دنیا کے اسیر افراد کے تعلق سے غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ یہ نظم آکاشوانی پٹنہ کے اردو پروگرام سے ۲۲؍ مارچ ۱۹۹۸ء کو کونشر ہوئی تھی۔ پھر یہ ترجمان دو عظیم آباد کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء اور دوماہی دستخط بارکپور کے شمارہ ۲؍ اکتوبر دسمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ نظم "خاموشاں" خاموشی کی قوت گویائی پیش کرتی ہے۔ یہ نظم ایوان اردو دہلی کے خاص شمارہ اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ "معمول"، نظم مختصر ہے لیکن اثر دار ہے۔ یہ سہ ماہی "جہان اردو" دربھنگہ میں ۲۰۰۱ء میں اور ماہنامہ صریر کراچی جنوری ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ ایک نظم قطرے کی خطا ہے جو رسالہ سرسبز دھرم شالہ کے شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی اس نظم کے ذریعہ شاعر نے قطرہ اور سمندر کے مابین کے اپنے سفر کو روداد دی ہے۔ نظم "حلقۂ تنقید" سب سے پہلے ایک نظم کے عنوان سے ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی کے شمارہ جولائی ۱۹۹۳ء اور اس کے بعد دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوئی جن میں ماہنامہ سفید چھڑی سرگودھا کے سالنامہ ۱۹۹۶ء شامل ہے۔ یہ نظم علیم صبا نویدی اور ڈاکٹر جاویدہ حبیب کی کتاب "اردو نظم کے سلسلے" (۲۰۰۸ء) میں منتخب بھی کی گئی ہے۔ اگلی نظم "لفظ لفظ انتشار" ہے جو قدرے طویل ہے۔ پابند معریٰ طرز کی یہ نظم کئی فکری و عملی گوشوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ نظم "ترجمان ۲" عظیم آباد (اکتوبر ۱۹۹۹ء) اور ماہنامہ صریر کراچی (سالنامہ ۲۰۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔ نظم "زوال حرف حرف" وقت کے چارہ گر سے مخاطب ہے اور کئی سوالات سامنے لاتی ہے۔ اس کی اشاعت سہ ماہی "استعارہ" دہلی (اکتوبر نومبر دسمبر ۲۰۰۰ء)

اور ماہنامہ ''آئندہ'' کراچی نومبر دسمبر ۲۰۰۲ جنوری ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔

نظم ''جاگتی آنکھوں کا کرب'' درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ہے اور تلخ حقیقت کے حوالے سے سوالوں پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یہ پہلے پہل ماہنامہ بہار پٹنہ جون ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی پھر دوسری جگہ شامل اشاعت ہوئی۔ ''زندگی ردعمل''، مختصر نظم ہے لیکن زندگی کا حوالہ منفرد طور پر سامنے لاتی ہے۔ سہ ماہی جہان اردو دربھنگہ کے شمارہ ۲۰۰۱ء اور صریر کراچی جنوری ۲۰۰۲ میں شائع یہ نظم فراق گورکھپوری کے مصرعے کا حوالہ دے کر خوبصورتی سے اپنی بات کہہ جانے کا خوب ہنر دکھاتی ہے۔ نظم سوال بے حسی و بے عملی کی زندگی کو آئینہ دکھانے کا کام کرتی ہے۔

ماہنامہ ''تحریر''، ممبئی میں شائع یہ نظم کہیں پابند کہیں معریٰ ہیئت میں ہے۔ سہ ماہی ''نیا ورق''، ممبئی کے شمارہ نومبر تا فروری ۲۰۰۳ء میں شائع نظم ''زندگی سانس لیتے ہوئے بھی، وقت کی بے اماں ساعتوں میں زندگی سے ہم کلام ہے۔ یہ نظم سہ ماہی انتساب سرونج اپریل تا جون ۲۰۰۹ء میں محمد سالم امریکہ کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہوئی تھی۔ نظم ''اے زندگی بتا ذرا'' مشہور کارٹونسٹ عرفان احمد کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ یہ نظم از اول تا آخر وقت کی بے رحم ساعتوں کے سبب زندگی کی بے رنگی کا نوحہ ہے۔ ماہنامہ ''آجکل'' نئی دہلی (جنوری ۲۰۰۳ء) میں شائع یہ نظم مرثیہ کی کیفیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ ''زاویہ'' سویڈن (ستمبر ۲۰۰۷ء) میں شائع نظم ''زندگی تحریر''، قلم کار کے لکھنے کی کمزوری یا مضبوطی کا اشاریہ نما ہے۔ اسی طرح ''بیباک'' مالیگاؤں (ستمبر ۲۰۰۸ء) میں شائع نظم ''زندگی تشریح'' زندگی کے بے تکلف امور سے آشنا کرانے کی اچھی کوشش ہے۔ نظم ''زندگی تلاش'' انسان کی پرواز کی حقیقت عیاں کرتی ہے۔ نظم فریب وحسرت سہ ماہی تشطیر لاہور (جولائی اگست ۱۹۹۹ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ذریعہ شاعر نے لمحے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے فریب حسرت کو آشکار کیا ہے۔ نظم زندگی چہرہ (مطبوعہ ادبی گزٹ مئوناتھ بھنجن جنوری ۲۰۱۱ء میں اپنی چالیس سالہ زندگی کو شاعر نے آئینہ چہرہ کیا ہے۔

سہ ماہی ''تمثیل نو'' دربھنگہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء) اور مباحثہ پٹنہ (دسمبر تا جنوری ۲۰۰۳-۴ء) میں شائع نظم ''سب خاموش ہیں''، میں حالات کی ستم ظریفی اور اپنوں کی بے حسی کی فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ ماہنامہ عالمی ''منشور'' کراچی میں شائع نظم ''سایہ سایہ دھوپ'' کے ذریعہ شاعر نے سائے کی دھوپ اور اس دھوپ کے مضمرات پر روشنی ڈالنے کی خوب کوشش کی ہے۔

نظم اے کاش کے ذریعہ شاعر نے اس جذبہ کو زبان دی ہے جس کے تحت مجبوری کے سبب انسان کسی کو فیض پہنچانے سے قاصر رہتا ہے۔ سرسبز (جنوری تا مارچ ۲۰۱۰) میں شائع یہ نظم معریٰ مجبور تمنا کا خاکہ بڑے اچھے ڈھنگ سے کھینچتی ہے۔

''سعیٔ رائیگاں کا چاند'' شاعر کے اولین دور کی نظم ہے اور یہ اسی دور میں شائع بھی ہوئی۔ نظم اس قدر علامتی پہلوؤں سے آراستہ اور سنجیدہ اطوار کی حامل ہے کہ ابتدائی حوالے سے اسے ان کی بہترین نظم کہی جاسکتی ہے۔ یہ نظم وادی نشاط (دربھنگہ) اور ماہنامہ ساز سرمدی دہرہ دون میں ۱۹۸۳ء کے اوائل میں شائع ہوئی تھی نظم ملاحظہ ہو''جب کبھی ماضی کا سورج / دیتا ہے یادوں کی دھوپ / ذہن و دل کی دیواروں / کو تو یہ دیواریں / چاہتی ہیں کہ روک دیں / مستقبل کی جانب بڑھتے والا حال کا ہر ایک قدم / وقت ان ساری کاوشوں کو / سعیٔ رائیگاں کے نام / دیتا ہے / عقل بھی اسے تسلیم کرتی ہے / باوجود اس کے / شب امید بستر احساس اق پر لیٹا ہوا / جذبات کی نگاہوں سے / خوابوں کے آسمان کی طرف / دیکھتا رہتا ہوں میں ٹکٹکی باندھے ہوئے / نہ جانے کیوں / سعیٔ رائیگاں کا چاند!''

نظم ''اندیشۂ فردا'' فردا کے اندیشہ سے عبارت ہے اور دور بینی کا تاثر دیتی ہے۔ یہ نظم سہ ماہی اثبات ونفی کلکتہ (جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اسے ''دوآشیانہ'' (مرتب سید جاوید حسن / ۲۰۰۸ء) میں بھی شامل کیا گیا۔ نظم ''زخم'' زخم زخم صورت اجاگر کرنے کے باوجود رجائیت سے پُر ہے۔ سب سے پہلے یہ نظم اردو چینل، ممبئی (اپریل تا جولائی ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوئی۔ نظم ''حادثہ'' ایک بڑے حادثہ کے پس منظر اور پیش منظر کو انسانی زندگی سے منسوب کرتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ ماہامہ شمع نئی دہلی دسمبر ۱۹۹۵ء کے علاوہ ادب ساز دہلی (اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء) میں بھی یہ نظم شائع ہوئی۔ چار نظمیں ''سپنا''، ''انگارے''، ''تجربے'' اور ''انبساط'' منفرد ہیئت وانداز کی نظم ہے۔ اسی اطوار کی نظم اس سے پہلے نظر سے نہیں گزری ہے۔ یہ چاروں نظمیں ایک ساتھ ماہنامہ ''صریر'' کراچی (جنوری ۲۰۰۰) اور نیا سفر، الہ آباد (جنوری۔ جون ۲۰۰۰) میں شائع ہوئیں۔ نظم ''سائے کی دھوپ'' کے ذریعہ شاعر نے وحشت نما ماحول کی تعبیر دانشورانہ انداز میں پیش کی ہے۔ صریر کراچی (ستمبر ۲۰۰۰ء) اور گلبند، احمد آباد (ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء) میں شائع یہ نظم حالات کی تکلیف دہ صورت حال کا آئینہ ہے۔ اگلی چند نظمیں ''بچپن اور ساون''، بچپنا، وہم، اعتبار امکاں، گلے میں اٹکی ہوئی ہڈی، پیوند، اور ''تین پودوں کا باغ'' شاعر کے ابتدائی دور کی نظمیں ہیں جو ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء کے درمیان مختلف رسالوں میں شائع ہوئیں۔ ان نظموں میں بھی موضوع کے ساتھ سنجیدہ رویے اختیار کئے گئے ہیں۔ ''عکس ناتمام'' کے ذریعہ شاعر نے اردو کی قابل احترام شخصیت حیات اللہ انصاری کی شخصیت وتحریر کو آئینہ صفت کیا ہے۔ یہ نظم ماہنامہ ''معلم اردو'' لکھنؤ کے حیات اللہ انصاری نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ نظم ''خواب کی دلی'' کے ذریعہ شاعر نے دہلی سے وابستہ یادوں بلکہ انہیں محبت و چاہت کو منفرد اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم آئینہ کلامی، پابند نظم ہے اور وقت و حالات کے منفی رویہ پر واضح اور موثر تبصرہ ہے۔ نظم ''عہد زریں'' کا سحر بچپن سے منسوب مناظر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔ کتاب نما دہلی (مارچ ۲۰۰۴ء) میں شائع یہ نظم دلچسپ اور پر اثر ہے۔ نظم ''سچ مت بولو''

ISSN No. : 2395-2016

طنزیہ تیور لئے ہوئے ہے اور ہمیں اندر تک متاثر کرتی ہے۔ ہفتہ روزہ بلٹز اردو ممبئی (اکتوبر ۱۹۹۳ء) اور دیگر رسالوں میں شائع یہ نظم ہر دور کے ابن الوقتوں کو آئینہ دکھاتی ہے۔ نظم ''الوداع'' شاعر کو اپنے آپ کو موجودہ دیار سے آگے کی تحریک دیتی ہے۔ ''اف میری نادانیاں'' وقت سے پہلے انتباہ کی صورت ہے۔ یہ غفلت شعار لوگوں کے لئے پیام بیداری ہے۔ اسی طرح نظم ''اے میرے ہم سفر'' بھی عزم و عمل کی تحریک سے مملو ہے۔ یہ نظم دعوت دہلی (یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء) کے علاوہ بعد میں کئی رسالوں میں شائع ہوئی۔ نظم ''سال نو ایک احساس'' اردو ''اچھی کتاب'' اور ''عید کے دن'' اپنے اپنے موضوع پر منفرد سنجیدہ اور موثر حوالے سامنے لاتی ہے اور قارئین کو متاثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ تین نظمیں ''زخم کی آواز''، ''مخاطبہ'' اور ''جب تک پھول تھا''۔ آنگن میں شاعر کے بچے کی شہادت کے تعلق سے بھی توجہ طلب امور کی حامل ہے۔ ان نظموں کے ذریعہ شاعر نے اپنی زخمی احساسات و جذبات کو فنی پیکر دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نظم ''چراغ یادوں کے'' شاعر نے اپنے بڑے بھائی مرحوم کی ذات صفات کو جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم ''اے ماں'' کے ذریعہ شاعر نے مرحومہ سے مخاطبت کا حق فرزندی ادا کیا ہے۔ نظم ''تم کہاں گئے کہ'' اور ''کل اور آج'' میں شاعر نے والد مرحوم کی یادوں کو لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے۔ نظم ''لہو کا نوحہ'' واقعی لہو کا نوحہ ہے۔ ہر مصرعہ شاعر کی قابل رحم ساعتوں کا منظرنامہ ثابت ہوتا ہے۔ مجموعہ کی آخری نظم ''ہم کو آگے جانا ہے'' ۔اس نظم کے ذریعہ شاعر نے ہر حالت میں آگے بڑھتے رہنے کے اپنے عزم کا اظہار سادہ و شستہ انداز میں کیا ہے۔ عطا عابدی کی نظموں کی اس کتاب پر ہماری زبان، دہلی شہیر دھنباد، اردو بک ریویو نئی دہلی، زبان و ادب پٹنہ اور انتساب سرونج نے تبصرہ یا مضمون شامل اشاعت کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی اس کا تحریری ذکر ملتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ عطا عابدی کی نظمیں اسی کتاب ''زندگی، زندگی اور زندگی'' تک محدود ہیں بلکہ ان کی کئی نظمیں اب بھی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ یہ نظمیں رسالوں کی وساطت سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ کئی نظمیں ان کی کتاب ''دریچے سے'' میں بھی شامل ہیں۔ ''دریچے سے'' میں رباعیات، قطعات اور ہائیکو کے علاوہ وقت وقت کی کئی نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں ایک الگ فضا کی حامل ہیں۔ ان میں کچھ نظمیں عقیدت مندانہ ہیں تو کچھ تعزیتی و تہنیتی امور سے متعلق ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے، لہٰذا پھر کبھی سہی۔

المختصر عطا عابدی نے نظم نگاری میں بھی کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے اچھا خاصا سرمایہ پیش کیا ہے اور ان نظموں کا فکری اور فنی مطالعہ نظم نگاروں کی فہرست میں منفرد مقام عطا کرنے کا سبب بنے گا۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

ترنم پروین
ریسرچ اسکالر، ایل۔این۔ایم۔یو، دربھنگہ

آزادی کے بعد اردو میں خودنوشت سوانح نگاری

(ایک سرسری جائزہ)

اردو ادب میں خودنوشت ایک معتبر، معروف اور مقبول صنف ہے۔ یہ مصنف کی ذات کے حوالے سے اظہار حقائق اور اعترافات اور اس کی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور نظریات کی ایک ایسی مربوط داستان ہوتی ہے جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز سے پوری آگاہی ہوجاتی ہے۔

اردو میں خودنوشت سوانح نگاری کی مستحکم روایت ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش شاعروں اور ادیبوں کے یہاں ملتے ہیں لیکن اسے باضابطہ طور پر فن کا درجہ بیسویں صدی میں حاصل ہے۔

آزادی کے بعد اردو میں بہت سی خودنوشت سوانح منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس مدت کی سب سے پہلی خودنوشت سوانح حیات بیگم انیس قدوائی ''آزادی کی چھاؤں میں'' ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کی خون ریز اور دل دہلا دینے والے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اس میں مصنفہ نے صرف آزادی کے فوراً بعد کے قیامت خیز حالات بیان کئے ہیں۔ اس لئے یہ خودنوشت سوانح حیات کے ساتھ ساتھ رپورتاژ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کو پوری طرح پیش نہیں کیا ہے اس لئے یہ ایک ادھوری خودنوشت ہے۔

''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے امین شاد عظیم آبادی کی خودنوشت ہے جو ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ صیغۂ غائب میں لکھی اس خودنوشت کا مسودہ شاد نے تیار کیا لیکن وہ اسے اپنے ایک شاگرد کے نام سے شائع کروانا چاہتے تھے۔ ان کے شاگرد مسلم عظیم آبادی نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اس کتاب میں صاف لکھ دیا کہ یہ شاد عظیم آبادی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ تذکرہ مؤلف نے میری طرف سے صیغۂ غائب میں لکھا ہے مگر میں اسے اپنی طرف منسوب کرنا جائزہ نہیں سمجھتا۔

اس خودنوشت سے شاد کی ادبی اور علمی زندگی کے متعلق پوری معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ اس میں خودستائی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ساتھ اس میں ان کا کلام حد سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ یہ خودنوشت سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی ہے۔

آزادی کے بعد اردو ادبیات کے چند استاد ڈاکٹر اعجاز حسین کی خودنوشت ''میری دنیا'' (۱۹۶۵ء)

اپنی حیثیت تسلیم کروا چکی ہے۔ اس میں افسانۂ حیات، میرا شہر اور میری یونیورسیٹی، شعبۂ اردو کی یاد میں اور شاگردوں کے چہرے جیسے بہت سے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ پوری خودنوشت الہٰ آباد یونیورسیٹی، وہاں کے اساتذہ اور شاگردوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں نجی و رازدواجی زندگی پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ڈاکٹر اعجاز حسین کے حالات زندگی سے زیادہ الہ آباد یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔

''یادوں کی دنیا'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی خودنوشت ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ آٹھ ابواب پر مشتمل یہ خودنوشت ادب، تاریخ اور تہذیب کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ انہوں نے بہت عمدہ اسلوب میں ان گوشوں کی ترجمانی کی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اہم استاد اور محقق عتیق احمد صدیقی کی خودنوشت ''یادوں کے سائے'' مصنف کی زندگی کے ایک دور کی کہانی ہے۔ اس میں اس دور کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ سفرنامے کے انداز میں لکھی گئی اس خودنوشت میں تہران، بغداد اور قاہرہ کے سفر کے واقعات ہیں۔ اس میں ہندوستانی سیاست کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ اس خودنوشت سوانح میں مصنف کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دور کی خودنوشت ہے۔ زبان صاف ستھری اور شاعرانہ ہے۔

شاعر شباب اور انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ۱۹۷۴ء میں ''یادوں کی بارات'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اردو ادب میں اس کی حیثیت امتیازی ہے۔ پانچ حصوں پر مشتمل اس خودنوشت میں کئی ذیلی عنوان قائم کر کے مصنف نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم لکھنو کے زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

جوش ملیح آبادی الفاظ اور بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری اس کی مظہر ہے۔ اپنی خود نوشت میں بھی ان کا یہ انداز اور اسلوب ملتا ہے۔ اس میں تشبیہوں اور استعاروں کی فراوانی ہے۔ مترادف الفاظ کی بھرمار ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں بے مزگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً

> ''ذات وصفات کے تمام مسائل کو الٹوں، پلٹوں، پگھلاؤں، کھرچوں، کریدوں، ناپوں، جانچوں، تولوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، پھٹکوں، اساؤں، چھوؤں، چکھوں، سونگھوں، بلواؤں، سنوں اور دیکھوں۔''

(یادوں کی بارات۔ جوش ملیح آبادی۔ کلکتہ آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص:۱۹)

مشہور نقاد ادب کلیم الدین احمد نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنی تلاش میں'' لکھی ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں، دوسری ۱۹۸۲ء میں اور تیسری ۱۹۸۷ء میں چھپی ہے۔ یہ خودنوشت اردو ادب میں اونچا مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس میں تحلیل نفسی، خود بینی اور خود پسندی کی منفرد روایت قائم کی گئی

ہے۔ مصنف نے اس میں اپنی شخصی زندگی کی تفصیل وتشریح اس طرح قلمبند کی ہے کہ اس میں سنجیدگی اور متانت کا عنصر نمایاں ہوگیا ہے۔

پہلی جلد میں اپنی ولادت، تعلیم اور جوانی کے حالات پیش کئے ہیں۔ دوسری جلد میں کالج کی زندگی، کلکتے کا سفر، شادی، کیمبرج یونیورسیٹی کے احوال اور لندن سے تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس آنے اور کالج میں لکچرر مقرر ہونے کے واقعات قلم بند ہیں۔

تیسری جلد میں اہلیہ کے انتقال سے پیدا شدہ مسائل اور زندگی کے آخری ایام کا تذکرہ ہے۔

''اپنی تلاش'' کی تینوں جلدوں میں انہوں نے اپنی علمی اور عملی کارکردگی کے حوالے سے بچپن سے اخیر وقت تک کے حالات پر نظر ڈالی ہے اور اپنے عہد سے متعلق تمام تفصیلات کو سچائی اور سادگی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

فارسی شعروادب کے نامور استاد اور پٹنہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اقبال حسین کی ''داستان میری'' خودنوشت کے ذخائر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ۵۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں بائیس ابواب ہیں۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۹ء میں ہوئی تھی، دوسری اشاعت ۲۰۰۰ء میں ہوئی ہے۔ اس سے اس خودنوشت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ڈاکٹر اقبال حسین کی زندگی اور ان کے کارنامے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں مصنف کی زندگی کے واقعات، کچھ تاریخی حقائق اور کچھ اہم لوگوں کے حالات پوری سچائی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

''خواب باقی ہیں'' (۱۹۹۱ء) اردو کے نقاد بے بدل آل احمد سرور کی مشہور و مقبول خودنوشت ہے۔ اس میں ان کی پوری زندگی کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ان تمام شہروں کا ذکر بھی ملتا ہے جہاں جہاں وہ گئے تھے۔ عام طور پر خودنوشت سوانح نگار اپنی برتری جتانے کی کوشش کرتا ہے مگر آل احمد سرور نے ایسا نہیں کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نہ تو اپنا قصیدہ پڑھنے کا قائل نہ بے جا انکساری کا، جس طرح وقت گزرا، جو سوچا، جو کیا جو نہ کیا، جس طرح بکھرا اور سمٹا، ٹوٹا اور جڑا، جو پایا اور کھویا، اس کی جھلک تو بہر حال ان صفحات میں مل جائیں گے۔''
>
> (خواب باقی ہیں۔ آل احمد سرور۔ عام آفسٹ پرنٹرس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص:۶)

فن اور پیش کش دونوں اعتبار سے یہ خودنوشت ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ مشہور ترقی پسند نقاد اختر حسین رائے پوری اردو کے ایک اہم قلمکار تھے۔ انہوں نے ''گرد راہ'' کے نام سے اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھی ہے۔ اس میں مصنف نے واقعات سے زیادہ شخصیات کو اہمیت دی ہے۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، پطرس بخاری، آغا حشر کاشمیری، سید سلیمان ندوی، حسرت موہانی، سعادت حسین منٹو، سجاد ظہیر، رشید احمد صدیقی اور سروجنی نائیڈو وغیرہ کا مفصل خاکہ کھینچا ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک اور اشتراکی ادب پر زیادہ زور ڈالا گیا ہے۔ اس خودنوشت میں انداز بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

پاکستان کی معروف شاعرہ کشور ناہید کی خودنوشت ''بری عورت کی کتھا'' اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ یہ عورتوں کی شخصیت اوراس کی شناخت کی مکمل دلیل ہے۔نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب بری عورت کی کتھا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔یہ پورے معاشرے کی تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی نشیب وفراز کی ایک داستان ہے۔ اس سے اس دور کی عورتوں کے لباس، رسم ورواج، توہم پرستی اور تہذیب وتمدن کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس خودنوشت کا اسلوب شگفتہ اور شاعرانہ ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' جدید لب ولہجہ کے منفرد شاعر اختر الایمان (۱۹۹۷ء) کی خودنوشت سوانح ہے جو اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔اس میں انہوں نے اپنی شخصیت اور زمانے کے رائج رسم ورواج کو موضوع بنایا ہے۔بچپن سے لے کر فلمی دنیا میں جانے تک کے حالات، تجربات اور مشاہدات کو مصنف نے پوری غیر جانبداری کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔انہوں نے اس خودنوشت میں اپنے تخلیقی معاملات کا سرسری ذکر کیا ہے۔بہر حال اردو نثر میں یہ خودنوشت لکھ کر انہوں نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔مصنف نے اس خودنوشت کا آغاز افسانوی انداز میں کیا ہے۔نثر میں سادگی اور روانی ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی میں نفسیات کے استاد اور اہم افسانہ نگار محسن عظیم آبادی نے اپنی زندگی ہی میں اپنی خود نوشت ''لمحوں کا کارواں'' لکھا تھا لیکن وہ ان کے انتقال کے بعد ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ان کا انتقال ۱۹۹۹ء میں ہوگیا تھا۔ان کے لڑکے آفتاب محسن نے اسے چھپوایا۔سید محمد محسن کی خودنوشت سوانح میں ان کی خوبیاں اور خامیاں، کردار کی بلندی اور پستی، قابل ذکر اور ناقابل ذکر عادت وخصائل کا ذکر کھل کر کیا گیا ہے۔اس میں ۱۴را بواب ہیں۔''ماضی سے میرا رشتہ'' خانگی ماحول اور زندگی کے نشیب وفراز'' برطانیہ میں قیام کے دو سال'' اور'' میری افتادہ طبیعت'' اہم باب ہیں۔مصنف نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں بہت سی مخفی باتیں بھی درج کی ہیں۔جن کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''حافظہ شروع سے کمزور تھا اب ناکارہ ثابت ہوتا جارہا ہے۔حالیہ تجربات اور تاثرات، مشاہدے اور واقعات کو گرفت میں کرنا اور انہیں محفوظ کر کے ان کی بازیافت پر قابو رکھنا بس سے باہر ہوگیا ہے۔وقت پر کسی کا نام بھول جانا مرض کی صورت اختیار کرنے لگا ہے۔یادداشت کی صلاحیت بھی جواب دینے لگی ہے۔''
>
> (لمحوں کا کارواں، ڈاکٹر محمد محسن، دائرہ ادب، پٹنہ، ۲۰۰۲ء،ص:۱۰۱)

اس خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کی تفصیل بیان کرنے میں سچائی سے گریز نہیں کیا ہے۔انہوں نے کوئی بات گنجلک نہیں ہونے دی ہے جس کی وجہ سے ان کے خیالات قاری تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔اس میں ادبیت کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔اسلوب بیان آسان اور عام فہم ہے۔

ISSN No. : 2395-2016

اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی کی خودنوشت سوانح حیات ''قصہ بے سمت زندگی کا'' ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکی ہے۔انہوں نے اس خودنوشت میں اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔اپنی کمزوریوں اور کمیوں کو بھی انہوں نے سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کی شخصیت آئینہ ہوگئی ہے۔بچپن سے لے کر آخر عمر تک کے واقعات اور اپنے دوستوں اور دشمنوں دونوں کے حالات کو انہوں نے اپنی خودنوشت میں مقام عطا کیا ہے۔۳۲۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی ہے۔اس میں کل ۱۷ ابواب ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر وہاب اشرفی کی خودنوشت سوانح عمری ''قصہ بے سمت زندگی کا'' ان کی زندگی کے نشیب وفراز کی ایک داستان ہے جو دلکش اور دلپذیر انداز میں لکھی گئی ہے۔

ابھی حال ہی میں پروفیسر ایم کمال الدین کی خودنوشت ''چاندنی دھوپ کی'' (۲۰۱۷ء) شائع ہوئی ہے۔۴۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں ۳۷ روزن ہیں۔مصنف نے اس میں اپنے بچپن سے لے کر حال یعنی ۲۰۱۶ء تک کے حالات تک کے حالات وواقعات قلم بند کئے ہیں۔عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ خودنوشت سوانح حیات لکھنے کے بعد مصنف اپنا قلم تھامنے سے گریز کرتا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔آج بھی ان کا قلم چلتا دکھائی دیتا ہے۔خصوصیت سے شعروشاعری کے میدان میں وہ آج بھی متحرک ہیں۔

خودنوشت کے فن پر ان کی کتاب ''چاندنی دھوپ کی'' کھری اترتی ہے۔

چونکہ مصنف ایک انشائیہ نگار بھی ہیں ان کی خودنوشت کی زبان میں دلکشی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں طنز بھی ہے۔

یہاں جن خودنوشت سوانح نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ آزادی کے بعد اردو خودنوشت نگاری میں کئی اور لوگوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ان میں عبدالغفار بدھولی ''ایک طالب علم کی کہانی''، عتیق احمد صدیقی ''یادوں کے سائے'' خواجہ غلام السیدین ''اعمال نامہ'' سعیدہ بانو ''ڈر سے ہٹ کر'' رشید احمد صدیقی ''آشفتہ بیانی میری'' احسان دانش ''جہان دانش'' کنور مہندر سنگھ ''یادوں کا جشن''، نفیس بانو ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' ادا جعفری ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اویس احمد دوراں ''میری کہانی''، کلیم عاجز ''ابھی سن لو مجھ سے'' قمراعظم ہاشمی ''سرسری اس جہاں سے گزرے'' عبدالماجد دریا آبادی ''آپ بیتی'' زبیر رضوی ''گردش پا'' اور مسعود حسین خاں ''ورود مسعود'' وغیرہ۔یہ فہرست مکمل نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ان قلم کاروں کے علاوہ بھی دوسروں نے خودنوشت سوانح حیات لکھی ہے۔

مختصر یہ کہ آزادی کے بعد دوسری کئی نثری اصناف ادب کی طرح اردو خودنوشت کی بھی کافی ترقی ہوئی ہے اور اردو کے نثری ادب کے ذخیرے میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆

محمد ارشد حسین
ریسرچ اسکالر، للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

آپ بیتی: ایک تعارف

اپنی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال اور اپنی زندگی کے تجربات، واقعات و حادثات کو دوسروں کے ساتھ پیش کرنا آپ بیتی کہلاتا ہے۔ آپ بیتی میں متعلقہ شخصیت اپنی زندگی کے حالات مشاہدات اور تجربات بلکہ فکری نظریات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی زندگی کے اخلاق و عادات کا کوئی پہلو مخاطب کے سامنے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی شخصیت کے حوالے سے بلا تکلف اظہار حقائق کا نام آپ بیتی ہے۔

بقول عبدالمجید قریشی:

''آپ بیتی یا خودنوشت سوانح حیات جس کے اوراق میں انسان حیات مستعار کے مختلف ادوار کو بلا کسی تکلف اور تصنع کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس نے کن حالات میں اس جہان رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ کس طرح وہ طفل شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوا۔ اس کے طالب علمی کا زمانہ کیسے گزرا۔ عروس وشباب نے کیوں کر اسے خوش آمدید کہا۔ زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں نے کیسے اس کا خیر مقدم کیا۔ ان کے ساتھ تلخیاں، محرومیاں اور ناکامیاں کیسے اس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور کس طرح وہ اس گرداب بلا سے اپنی کشتی حیات کو بچاتا ہو نکلا۔ زندگی میں کن آدمیوں سے ان کا سابقہ پڑا اور ان کے متعلق اس کی آراء اور تاثرات کیا ہیں۔ اس زمانے کا طرز معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم و رواج کی کیا کیفیت تھی۔ غرض آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہماہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔''

(عبدالمجید قریشی، اردو ادب میں آپ بیتی)

مدیر ''نقوش'' محمد طفیل رقم طراز ہیں:

''آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے، جو خود اس نے بے کم و کاست اور براست قلم بند کر دی ہے،

جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں۔اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکیں۔"

(محمد طفیل۔تصریحات،نقوش آپ بیتی)

آکسفورڈ ڈکشنری میں آپ بیتی (Autobiography) کی تعریف ان الفاظ میں درج کی گئی ہے:

"The story of person's life written by that person"

(Oxfored Advanced learners Dictionary)

آپ بیتی کے حوالے سے ان تمام تعریفات میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی بھی شخص کا اپنی زندگی کے نشیب وفراز،خود پر بیتے ہوئے حالات، داخلی اور خارجی کیفیات، دلی احساسات، ذاتی اور شخصی تجربات،حیات مستعار، کامرانیوں اور ناکامیوں کو اسی طرح بیان کرنا کہ متعلقہ احوال کا کوئی گوشہ قارئین سے پوشیدہ نہ رہے۔آپ بیتی کہلاتا ہے۔اس میں آپ بیتی لکھنے والے کے عہد،طرز معاشرت اور اس زمانے کے رسم ورواج کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔

سچائی اور صداقت آپ بیتی کا بنیادی عنصر ہے۔انسان پر جو کچھ بیتتا ہے اسے خود اپنی تحریر میں پیش کرنا ہوتا ہے چاہے وہ اس کی زندگی کا مثبت پہلو ہو یا منفی پہلو۔اس لئے مصنف کو انتہائی مضبوطی کے ساتھ سچائی کا دامن تھامنا پڑتا ہے اگر چہ انسانی فطرت اپنی زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے پر آمادہ کرتی ہے جس سے اس کی نیک نامی ہو۔اور ان پہلوؤں کو ظاہر کرنے سے انکار کرتی ہے جس سے اس کی خوبصورت تصویر اور جمال آراء شکل پر بدنمائی کا دھبہ نظر آئے۔

آل احمد سرور رقم طراز ہیں:

"جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی ایک فن لطیف۔اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی سچائی ،بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے۔اس کا راستہ بھی پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔"

(خواب باقی ہے،فکشن ہاؤس لاہور،۱۹۹۴ء)

خلاصہ یہ ہے کہ آپ بیتی میں اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں بلکہ کبھی کبھی متضاد پہلوؤں کو پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔اگر چہ کچھ پہلوؤں کا تذکرہ کرنا مصنف پر گراں بھی گزرتا ہوگا۔جہاں کتابی زندگی میں کامیابی کا تذکرہ کرنے میں اسے بڑا لطف آئے گا وہیں ناکامیوں کے بیان میں

ISSN No. : 2395-2016

اسے سبکی محسوس ہوگی۔ جہاں قوم وملت کے لئے نمایاں خدمات کو تحریر کرنے میں اسے قلبی سکون ملے گا۔ وہیں ننگ قوم وملت اور قابل ملامت کردار کے تذکرے سے اس کے دل کو بے اطمینانی محسوس ہوگی۔ لیکن اس مشکل عمل کے باوجود مصنف اپنی زندگی کے ہر ان پہلو کو نمایاں کر کے اپنی تحریر میں پیش کرتا ہے تو وہ آپ بیتی فنی اعتبار سے معتبر مانی جاتی ہے اور فن کا بھی اعتبار حاصل کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ اپنی برائیوں کا چرچا وہ چٹخارہ لے کر نہیں بلکہ عبرت وموعظت کے پہلوؤں کو سمیٹتے ہوئے کرے۔

سچائی معنوی حسن ہے تو اسلوب ظاہری:

آپ بیتی کا بنیادی حسن تو بلاشبہ صداقت وسچائی ہے۔ تاہم ظاہری اور نمائشی حسن طرز بیان اور اسلوب ہے۔ جس طرح پلاسٹر کسی بھی دیوار کا ظاہری اور نمائشی حسن ہے۔ اسی طرح اسلوب نگاری آپ بیتی میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ اسلوب صرف آپ بیتی میں نہیں کسی بھی تحریر کو پر کشش بنا دیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ طرز واسلوب خیال کا لباس ہی نہیں بلکہ اس کی کھال ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی آپ بیتی ''نشان جگر سوختہ'' میں اسلوب کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ بیتی قلم بند کرنے والے اور اس کے قارئین میں کسی طرح کا بھی قلبی تعلق اور ذاتی رشتہ نہیں ہوتا۔ قاری آپ بیتی کا مطالعہ اس توقع پر کرتا ہے کہ دیکھیں کیا گزری تھی قطرے پہ گہر ہونے تک۔ اس لئے حقیقی ہونے کے باوجود بھی اسے محض حقیقی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس میں چہرے دگر بھی ہونی چاہئے۔''

☆☆☆

Md. Arshad Hussain
Research Scholor, LNMU, Darbhanga

پروفیسر طرزیؔ

ثنا خوشتر

خدا رکھے سلامت تجھ کو بیٹی ترقی پائے تو دونوں جہاں کی
علوم نافع کی پائے دولت ترقی تندرستی اچھی صحت
تو پائے بھی بلندی ہر طرح کی ترے حق میں جو ہو وہ خیر کل بھی
ثنا پا جائے ہر اقبال مندی قبول رب دعا ہوجائے طرزیؔ

ISSN No. : 2395-2016

جبیں فاطمہ
ریسرچ اسکالر، للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

اردو کے تین غیر مسلم افسانہ نگار

پریم چند، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی

داستان اور ناول کے برعکس افسانہ جدید صنعتی اور مشینی دور کی پیداوار ہے۔ اس دور کے انسان کو تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور زندگی کے نت نئے مسائل سلجھانے کے لئے شب و روز مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اس مشینی دور کی تھکا دینے والی تیز اور مصروف زندگی میں اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ فراغت سے بیٹھے اور بھاری بھرکم داستانوں کا مطالعہ کرکے جذباتی تسکین اور ذہنی تفریح کا سامان کر سکے۔ چنانچہ وقت کی کم دامنی کا یہ احساس ہی مختصر افسانے کی ایجاد کا باعث بنا۔ اور اس فن میں بہت سارے مسلم اور غیر مسلم افسانہ نگاروں نے طبع آزمائی کی جس میں پریم چند، کرشن چند اور راجندر سنگھ بیدی قابل ذکر ہیں۔

☆ پریم چند اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کو ابتدا سے ہی کہانیاں پڑھنے اور سننے کا شوق تھا اور یہی شوق چھوٹے چھوٹے افسانے لکھنے کا باعث بنا۔ ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز 1901ء سے ہوا، جب پریم چند نے رسالہ (زمانہ) کانپور میں مضامین لکھنے شروع کئے۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے، یہ بات بالکل واضح ہے کہ اردو کا پہلا اہم اور بڑا افسانہ نگار پریم چند ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک ایسا نام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح آپ نے پیار، محبت، عشق، ہیرو، ہیروئین، جیسے سطحی موضوعات کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ حقیقت پسندی کی طرف اپنے ذہن و قلم کا رخ جمایا۔ آپ کے قلم سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ آپ کی افسانہ نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور: 1903 تا 1909 تک ابتدائی کوشش

دوسرا دور: 1909 تا 1920 تک تاریخی اور اصلاحی افسانے

تیسرا دور: 1920 تا 1932 تک اصلاحی اور سیاسی افسانے

چوتھا دور: 1932 تا 1936 تک سیاسی اور فکری افسانے

آپ نے اپنے افسانوں میں سادہ زبان استعمال کی اور سنسکرت کے الفاظ کم استعمال کئے۔ آپ نے اکثر کرداروں کے مکالمے ان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق لکھے۔ آپ نے ہندوستان کے لوگوں کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا اس وقت جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت موضوعات عروج پر تھے۔ آپ کے افسانوی مجموعے درجہ ذیل ہیں: آنندی، پریم پچیسی، پریم بتیسی، زاد راہ، سوز وطن، واردات وغیرہ

☆ کرشن چند کی ابتدائی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان کا رومانی طرز نگارش ہے۔ وہ طبعاً رومانی فنکار تھے۔ لیکن

ان کا کمال یہ ہے کہ وہ زیادہ دیر تک اس رومانی فضاء میں کھوئے نہیں رہے اور جلد ہی اس فضاء سے نکل کر وہ حقائق کی دنیا کی طرف گامزن ہو گئے۔ چنانچہ "طلسم خیال" کے بعد ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "نظارے" کے نام سے شائع ہوا تو اس مجموعے کے افسانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے زاویہ نظر میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلی آرہی تھی۔ اور "ان داتا" میں تو کرشن چندر رومانی پرستی کی بجائے تلخ حقیقت نگار اور انقلاب پسند کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔

کرشن چند کے عظمت کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلا ایک تو یہ کہ ان کے افسانوں کے موضوعات میں براتنوی ہے۔ ان کے افسانوں میں فطرت کے حسن اور عورت کی رومانی دلکش کے علاوہ اپنے عہد کی وسیع عکاسی بھی ملتی ہے۔ ان کے مشاہدے کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ وہ اپنے موضوعات، اپنے گردوپیش کی دنیا سے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں سماجی معاشی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔

دوسری بات کرشن چند منظر کشی میں ید طولی رکھتے ہیں۔ بقول محمد حسن منظر نگاری میں آج تک ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ جبکہ اس کے علاوہ اپنے طرز نگارش کے ذریعے وہ افسانے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ علی سردار جعفری نے ان کی نثر کو شاعری کہا ہے جو شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی محفل لوٹ کر لے جاتا ہے۔

کرشن چند نے فسادات کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا چنانچہ ان کے مجموعے "نیم وحشی" کے سارے افسانے فسادات سے متعلق ہیں۔ ان کے باقی مجموعوں کا نام یہ ہیں: طلسم خیال، نظارے، ہوائی قلعے، گھونگھٹ میں گوری جلے، ٹوٹے ہوئے تارے، ان داتا، نیم وحشی، تین غنڈے، زندگی کے موڑ پر، نغمے کی موت وغیرہ

☆ ترقی پسند تحریک کے پہلے کانفرنس میں صدارت کرتے ہوئے جب پریم چند نے کہا تھا کہ "اب ہمیں اپنے حسن کا معیار بدلنا ہوگا" تو اس حسن کے معیار کو بدل کر حقیقت پسندی اور اصلاحی رجحانات قائم کرنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی بھی تھے۔ جنہوں نے اردو افسانہ نگاری کو ایک مضبوط ستون فراہم کیا۔ حانکہ راجندر سنگھ بیدی ترقی پسند تحریک سے اسی حد تک وابستہ تھے کہ اپنے اردگرد کے پس ماندہ ماحول کی مصوری اور مرقع کشی کر سکیں کیوں کہ بیدی کا خیال تھا کہ ادب کو تحریکوں کا پابند نہیں ہونو چاہئے۔ ان کی نظر میں سب سے اہم چیز انسان کا اپنا وجود اور اس کا اپناذہن ہوتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا شمار بھی اردو کے اہم افسانہ نگاروں کی فہرست میں ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے یہاں بھی کرشن چند کی طرح رومانیت سے حقیقت نگاری کی طرف مسلسل اور واضح سفر دیکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک بیدی کے افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی دکھوں، پریشانیوں اور محرومیوں کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل بیدی خود ایک دردمند شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی دردمند شخصیت کے بدولت ان کے افسانے پر بھی دردمندی کی فضاء چھا جاتی ہے۔ نقادوں نے بیدی کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ان کے کردار اپنے ماحول میں مکمل طور پر بسے ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بیدی افسانے کی جزئیات ،واقعات و کرداروں کے ماحول اور ان کی الجھنوں کا اور مسائل کا بہ نظر غائر مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کردار گوشت پوشت کے جیتے جاگتے انسان ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "لاجونتی" شامل ہیں۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

شموئل احمد

گائے ہماری ماتا ہے

شموئل احمد عہد جدید کے مشہور اور متنازعہ افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔آپ 4 مئی 1943ء کو بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔1968ء میں سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1973ء میں بوکارو میں بحثیت انجینئر ملازمت کا آغاز کیا۔شموئل احمد نے کم عمری سے ہی کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ان کا پہلا افسانہ ''چاند کا داغ'' رسالہ صنم، پٹنہ میں 1962ء میں شائع ہوا۔ ان کے ناول ''ندی'' اور ''مہاماری'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔شموئل احمد کی کہانیوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کے افسانوں فلم اسکرپٹ بھی بنائی گئی ہے۔ان کی اب تک دو درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔رابطہ شموئل احمد:9835299303

اب کچلنے کی ریت ہے۔اب ایک بار میں قتل نہیں کرتے ہیں۔اب ایک آدمی کو سب مل کر کچلتے ہیں۔اخلاق کچلے گئے۔پہلو خاں کچلے گئے۔اور وزیر محترم کو فکر تھی کہ باقی گوشت کہاں ہے؟ ایک گائے سے ڈیڑھ من گوشت برآمد ہوتا ہے۔اخلاق نے زیادہ سے زیادہ ایک کیلو گوشت کھایا ہوگا....باقی....؟ محترم کا اصرار تھا کہ اس کی جانچ ہونی چاہیے۔پہلو میاں تسکری میں کیوں لگ گئے؟ اس بات پر وزیر محترم ناراض تھے کہ جب گائے کی تسکری پر پابندی ہے تو میاں جی نے جرأت کیسے کی؟ گئو رکشک تو روکنے کی کوشش ضرور کرینگے۔

اور دیوار پر وقت کی تحریر تھی کہ تم لوگ گائے سے دور رہو ورنہ......

یہ تحریر سب سے پہلے معظم خاں نے پڑھی اور اپنی دونوں جرسی گائیں واپس کردیں جو انہیں تحفے میں ملی تھیں۔سیف کے دادا کے پاس بھی ایک جرسی گائے تھی جو کرشن مراری نے دی تھی۔کرشن مراری سے ان کا یارانہ پرانا تھا۔وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تو دوپلّی ٹوپی پہنتے اور دادا سے دعا کی درخواست کرتے۔دادا مصلّے پر بیٹھ جاتے اور کرشن مراری ٹوپی پہنے سامنے دوزانو ہو جاتے۔دادا سورہ یونس کے

ساتھ دعا مانگتے ''یا اللہ... جس طرح تو نے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے صحیح سلامت نکالا اسی طرح میرے دوست کو مصیبت کے پھندے سے آزاد کر....'' وہ کرشن مراری کو تعویز اور نقش وغیرہ بھی دیتے رہتے تھے۔کبھی الجامع کی تعویز دی تو کبھی یاحفیظُ کا نقش دیا۔ایک بار الغنیُ کا نقش دیا تو کرشن مراری کے کاروبار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔

کرشن مراری بوڑھے ہو گئے تھے۔یہاں ان کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔بیٹے نے اپنے پاس امریکہ بلا لیا تو جاتے جاتے اپنی جرسی گائے دادا کی نذر کر دی۔پندرہ سولہ سال کا مچنا بھی حصے میں آیا۔لمبوترے چہرے والا مچنا ذات کا ہری جن تھا۔وہ کالا بھجنگ تھا اور دانت بالکل سفید۔ہنستا تو چہرے کی سیاہی پھیلتی اور دانت جگمگاتے۔لیکن کرشن مراری نے اسے بچپن سے پالا تھا۔گائے کی دیکھ ریکھ وہی کرتا تھا۔گائے کو نہلاتا اور گوبر اٹھاتا لیکن دودھ دوسرا ملازم دوہتا جو ذات کا ہریجن نہیں تھا۔مچنا کی دلی تمنا تھی کہ کبھی وہ بھی دودھ دوہتا۔سر سر کی آواز کے ساتھ دودھ کی دھار بالٹی میں گرتی اور جھاگ سا اٹھتا تو مچنا پر نشہ سا چھانے لگتا اور بڑی حسرت سے سوچتا کہ کاش کبھی.....

وداع ہوتے وقت کرشن مراری جی نے مچنا کا ہاتھ دادا کے ہاتھ میں تھمایا بھی نہیں تھا کہ رقّت طاری ہو گئی'' اس کا خیال رکھنا، یہ میری آنکھ کا تارہ ہے...اور دادا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔

دادا نے آنگن کے کونے پر گوہال بنوا دیا۔مچنا کے لئے بھی چھوٹی سی کوٹھری بنوا دی اور اس کو دودھ دوہنے کا اختیار دیا۔مچنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اتنی عزّت کسی نے نہیں دی تھی۔دادا کے قدموں میں گر گیا اور دیر تک روتا رہا۔وہ گائے کو ماتا کہتا تھا۔دادا بھی ماتا کہنے لگے۔مچنا گھر کے دوسرے کام بھی کرنے لگا اور بہت جلد سب کا ہر دلعزیز بن گیا۔لیکن دادا نے اس کو اپنے لئے وقف کر لیا۔اس کی کھاٹ عقبی برآمدے کے کونے میں لگوائی۔خود برآمدے میں سوتے تھے۔دھوپ اور پانی سے بچنے کے لئے شہتیر سے برساتی لگا رکھی تھی۔ہر موسم میں ان کی کھاٹ یہاں پڑی رہتی اور وہ دن بھر پڑے حقّہ گڑگڑاتے رہتے۔بیچ بیچ میں اٹھ کر آنگن کی پھلواری پٹاتے۔ماتا کو گڑ کھلاتے اور یہ شعر گنگناتے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی اس مالک کو کیوں نہ پکاریں جس نے پلائی دودھ کی دھاریں۔

مچنا شعر پر سر دھنتا تھا۔ماتا بھی گردن ہلانے لگتیں۔مچنا نے بہت کوشش کی کہ شعر یاد ہو جائے لیکن کچھ الفاظ کی ادائگی میں گڑبڑ ہو جاتی۔تب دادا نے اسے مقامی بولی میں ازبر کرایا۔

رب کا سکر مناوہ بھیوا؛
جس نے ہمرو گائے بنایا

مچنا جھوم جھوم کر شعر پڑھتا اور دودھ دوہتا...سر...سر...ہمرو میّا کی دھار تو دیکھو....! ماتا روز دس کیلو دودھ

ISSN No. : 2395-2016

دیتی تھیں۔ایک دن دیکھا کھیاں پریشان کررہی ہیں۔دادا نے گوہال میں فوراً ٹیبل فین لگا یا۔

بوڑھے کے پاس مستقبل نہیں ہوتا۔پاس بیٹھ جاؤ تو ماضی کے قصے سنائے گا۔لیکن دادا کے ماضی میں ماتائیں سمائی ہوئی تھیں۔شام کو جب بستر پر پڑے حقہ گڑگڑاتے اور مجنا ان کے پاوں دباتا تو اس کو تاریخ کی گھٹی پلاتے کہ کس طرح ونووا بھاوے نے سن 1966 میں سارے ملک میں گائے کشی کے خلاف قانون بنانے کی مہم چلائی تھی اور اندرا گاندھی نے گائے رکشا آندولن میں گولی چلوادی تھی۔دادا مجنا کو سمجھاتے کہ ماتا جی بی جے پی والوں کے لئے خاص چیز رہی ہیں۔وہ ماتا کے ذریعہ ہندوں کو ایک جٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سن 1882 میں دیانند سرسوتی نے گئو رکشنی سبھا کی بنیاد ڈالی تھی جس کے کچھ عرصہ بعد اعظم گڑھ اور بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے تھے۔اور یہ کہ سن 1925 میں آر اس اس کی بنیاد...

آر اس اس تک آتے آتے حقہ کی نے منھ سے چھوٹ جاتی....دادا خرخر کرنے لگتے اور مجنا بھی ان کے پاوں پر لڑھک جاتا۔

اچانک جوگی مہیش نے بوچڑ خانے بند کرادیئے۔حکومت نے بھی جانوروں کی خرید وفروخت پر پابندی لگادی۔مہندر آچاریہ ناراض ہوئے کہ گائے کے کاروبار میں اسّی فی صد لوگ ہندو ہیں پھر ایک فرقہ کو نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے۔اسی دن سانڈ گھر میں گھسا اور دادا کے کولہے کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔

دیوار کی تحریر گہری ہوگئی۔دادا گہری نیند میں تھے کہ اچانک سانڈ کے رمبانے کی آواز سے نیند ٹوٹ گئی۔سیف بھی جاگ گیا۔سانڈ کو دیکھ کر اپنا کیمرہ لے آیا۔دادا نے دیکھا سانڈ ماتا جی سے اٹھکھیلیاں کر رہا ہے۔دادا ڈنڈا لے کر دوڑے۔سانڈ زور سے اچھلا۔پھولوں کی کیاری روندتا ہوا برآمدے میں گھسا اور دادا کی کھاٹ الٹ دی۔دادا نے بڑھ کر ڈنڈا جمایا تو سانڈ نے ان کو سینگ پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔دادا امرود کے پیڑ سے ٹکرا کر نیچے گرے۔کولہے کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔وہ زور سے چلاّئے۔ان کی آواز سن کر گھر کے افراد دوڑ کر آئے۔سب نے مل کر کسی طرح سانڈ کو دور بھگایا۔ان کو شہر کے اسپتال میں بھرتی کرنا پڑا۔صحت یاب ہونے میں دو ماہ لگ گئے۔

سارا منظر سیف نے وی ڈی او میں قید کرلیا تھا۔دو دنوں تک سوچتا رہا کہ اسے سوشل میڈیا پر ڈالنا چاہیے یا نہیں۔آخر اس نے فیک آئی ڈی کے ساتھ وی ڈی او لانچ کردیا۔منٹوں میں ردِّ عمل آنے لگے۔دوسرے دن سفید شرٹ اور ہاف پینٹ میں ملبوس کسی ونود بھاسکر کا وی ڈی او سامنے آیا۔بھاسکر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"ابھی تو ایک سانڈ چھوڑا ہے اور تمہاری ہڈّی ٹوٹ گئی۔

ایسے ایسے لاکھوں سانڈ ہیں۔اگر چھوڑ دیا تو کچلے جاوگے۔

گائے ہماری ماتا ہے اور تم اسے کھاتے ہو۔سالے...حرامی۔''

سیف وی ڈی او دیکھ کر محظوظ ہوا۔ یہ سوچ کر خوش ہوا کہ آر اس اس کی اولاد اس کی آئی ڈی کو کسی ہندو کی آئی ڈی سمجھ رہی ہے۔لیکن دادا ڈر گئے،انہیں احساس ہوا کہ گائے سے فاصلہ بنائے رکھنے میں خیریت ہے۔انہوں نے اخلاق اور پہلو خاں کے کچلے جانے کا وی ڈی او بھی دیکھا تھا۔ہر طرف سے لاٹھاں تلوار گڑانسے برس رہے تھے۔کوئی کمر پر وار کر رہا تھا،کوئی سر پر کوئی ٹانگوں پر کوئی سینے پر۔مر جانے کے بعد بھی کچلنے کا عمل جاری تھا۔دادا ہل گئے تھے۔اس وقت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ ان کی قوم کو مسیج تھا کہ گائے سے دور رہو۔اب انہیں ماتا جی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔انہیں یقین تھا کہ سانڈ پھر گھر میں گھسے گا۔اور دیوار کی تحریر بھی یہی تھی۔ وہ منتری کے اس بیان سے اور بھی سہم گئے تھے کہ گائے کی تسکری غیر قانونی ہے اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ انہیں روکنے کے لیے ہی گئو رکشک کمیتی بنی ہے۔یعنی مقتول مجرم تھا اور قاتک حق بہ جانب۔

سانڈ سب کے لیئے مسلہ بنا ہوا تھا۔اس نے سب کی فصلیں تباہ کیں۔اسے روکنے کا کسی میں یارا نہیں تھا۔جانور کی خرید فروخت بند تھی۔ پشو میلہ تو کب کا بند ہو چکا تھا۔جو جانور کسی لائق نہیں تھے انہیں بیچا نہیں جا سکتا تھا۔لوگ انہیں کھلا چھوڑ دیتے تھے جو کھیت خراب کر دیتے تھے۔بیمار ماتائں اسکول کے برامدے میں قیلولہ فرماتی تھیں۔ برامدہ گوبر سے بھرا رہتا۔بچّے گوبر صاف کرتے تب پڑھائی شروع ہوتی۔گاوں والے پہلے صبح اٹھ کر اپنا کام کرتے تھے۔اب صبح ڈنڈا لے کر کھیت جاتے کہ ماتا تو اندر نہیں گھس گئیں۔لاکھ پہرہ دو کوئی نہ کوئی جانور اندر گھس جاتا۔سب کو سانڈ کے مرنے کا انتظار تھا۔خود مار نہیں سکتے تھے کہ گئو کشی کے مرتکب ہوتے۔

دادا کے ماضی سے اب ماتائیں نکل گئی تھیں۔حقّہ گڑگڑاتے ہوئے وہ اب مجنا سے اس قسم کی گفتگو نہیں کرتے تھے کہ نہرو کے وقت میں یہ کوئی مسلہ نہیں تھا اور بی جے پی جب جن سنگھ ہوا کرتی تھی تو اس وقت بھی اس نے گائے کو سیاسی حربہ بنایا تھا۔دادا کو فکر تھی کہ ماتا جی سے چھٹکارہ کس طرح حاصل کیا جائے۔گاوں میں کسی کو دان کرنا مناسب نہیں تھا۔وہ یہی سوچتا کہ ماتا جی میاں جی کے گھر سے آئی ہیں۔ دادا نے سوچا کہ تھانے میں باندھ کر چلے آئیں۔ پولیس جو مناسب سمجھے گی کرے گی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔سیف کے کالج کا اکاونٹنٹ رمیش رجک گائے خریدنے کے لئے راضی ہو گیا۔مجنا کو چھٹپٹاہٹ ہوئی۔ماتا جی چلی جاینگی تو وہ سیوا کس کی کرے گا۔وہ اداس ہو گیا۔بھوک پیاس ختم ہو گئی۔ایک کونے میں گم صم بیٹھا پر نم آنکھوں سے ماتا کو نہارتا رہتا۔دادا نے تسلّی دی کہ بکری پالیں گے۔بکری سے ہندوٗں کا کوئی مذہبی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ بکری پالنا سنّت ہے اور پیغمبر بھیڑ بکری چرایا کرتے تھے۔لیکن مجنا بیمار پڑ گیا اور ماتا ماتا بڑبڑانے لگا تو دادا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مجنا کو ساتھ کر دینگے۔وہ ماتا کے ساتھ آیا تھا ماتا کے ساتھ

اپنے سماج سے جا ملے گا۔

سیف نے کورٹ سے گائے کی خرید فروخت کا مسودہ تیار کیا۔ گائے کی تصویر بھی منسلک کی تا کہ تسکری کا الزام نہیں لگے۔ اب مسلہ تھا گائے کو لے جانا۔ رمیش گائے اپنے گاوں بھیجنا چاہتا تھا جو دادا کے گاوں سے دو سو کیلو میٹر دور تھا۔ رمیش نے ٹرک کا انتظام کیا۔ دروازے پر ٹرک آ کر لگی تو گاوں والوں کو تجسس ہوا کہ کیا چیز ٹرک سے بھیجی جا رہی ہے۔ بات منٹوں میں پھیل گئی کہ دادا نے گائے بیچی ہے۔ گاوں کا سر پنچ براہمن تھا۔ اس کو فکر ہوئی کہ گائے کس نے خریدی؟ جب معلوم ہوا کہ کوئی رمیش رجک ہے تو سرپنچ کے ماتھے پر بل پڑ گئے.... شدر اور گائے....؟

رمیش کے پاس خرید کے کاغذات تھے۔ اس نے گائے ٹرک پر لدوائی مچنا کو ساتھ لیا خود بھی بیٹھا اور چل پڑا۔ سرپنچ نے گئو رکشک واہنی کو فون کر دیا کہ شدر جرسی گائے کی تسکری کر رہا ہے۔ ٹرک بلوا چوک سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ گئو رکشک ہتھیاروں سے لیس کھڑے تھے۔ راستہ بلّہ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ رمیش نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر کاغذ دکھایا۔

''باہر نکل سالا ــــ''

کاغذ دیکھنے کے بجائے کسی نے انہیں نیچے کھینچ لیا۔ بھارت ماتا کی جے کے نعرے سے فضا گونج اٹھی۔ رمیش ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگا۔

''میں مسلمان نہیں ہوں بھیّا..... میں مسلمان نہیں ہوں۔''

سر پر زور کی لاٹھی پڑی۔ ''چپ سالا دلت.....''

کچلنے کا عمل شروع ہو گیا۔ وہ چلّا تا رہا.... ''میں مسلمان نہیں ہوں.... میں مسلمان نہیں ہوں۔ آخری بار وہ زور سے چلّایا۔ ''میں ہندو ہوں....'' اس طرح چلّا تے ہوئے بھول گیا تھا کہ وہ دلت ہے اور براہما کے پاوں سے پیدہ ہوا ہے۔ اسے گائے رکھنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ مری ہوئی گائے کی چمڑی ادھیڑ سکتا ہے لیکن دودھ نہیں دوہ سکتا.........

اور دیوار پر نئی تحریر اُگ آئی تھی۔

'' ملیچھ کا ساتھ دو گے تو......''

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

نورشاہ (جموں وکشمیر)

آرزو

نام:نورمحمد شاہ، قلمی نام:نورشاہ، پیدائش:ڈلگیٹ درگہ جن سرینگر،9جولائی 1936 تعلیم:بی۔اے،ملازمت:ریٹائرڈ ڈائریکٹر محکمہ سائنس اینڈ ٹکنالوجی،حکومت جموں وکشمیر،وابستگی:مجلس ادارت''نگینہ انٹرنیشنل''سرینگر،جموں وکشمیر رائٹرس ایسوسی ایشن،اعزازات:ڈاکٹر برج پریمی لٹریری ایوارڈ،کرشن چندر ایوارڈ' دربھنگہ،اردو فاؤنڈیشن ممبئی ایوارڈ برائے افسانہ اور درجنوں ایوارڈ،تصانیف:افسانوی مجموعوں میں بے گھاٹ کی ناؤ،ویرانے کے پھول،ایک رات کی ملکہ،من کا آنگن اداس اداس،گیلے پتھروں کی مہک،بے ثمر سچ،آسمان پھول اور لہو وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ پانچ ناولٹ نیلی جھیل کالے سائے،پائل کے زخم،لمحے اور زنجیریں،آؤ سوجائیں اور آدھی رات کا سورج بھی ہیں۔نورشاہ نے کئی کتابیں ترتیب دی ہیں اور اسّی سے زائد ریڈیائی ڈرامے ہیں جو نشر بھی ہوئے ہیں۔نورشاہ پر کئی تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔خود انھوں نے تحقیق وتنقید میں طبع آزمائی کی ہے۔

پتہ:14/لل دید کالونی،غوری پورہ لنک روڈ،راول پورہ سرینگر،کشمیر۔190005

فون نمبر:9906771363ای میل:nagina968@gmail.com

''محبت حشمت دیکھتی ہے اور نہ غربت''

''یہ کتابی باتیں ہیں''

''میں کتابوں کی نہیں اپنی بات کررہی ہوں''

''کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''میں آپ کی بیوی ہوں۔شریک سفر ہوں۔آٹھ سال سے آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہ رہی ہوں اور بخوبی جانتی ہوں کہ آپ کی خدمت اور آپ کی دیکھ بھال کرنا،آپ کے دُکھ سکھ میں شریک ہونا اور آپ کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو جانب توجہ دینا میرا فرض ہے۔اخلاقی اور مذہبی فرض ایک سماجی پابندی ہے میرے لئے۔میں یہ فرض،یہ ذمہ داری بڑی صدقِ دلی سے نبھاتی آرہی ہوں اور کوشش کرتی آرہی ہوں کہ آپ کی زندگی کے سفر کا ہر ہر قدم محبتوں کی خوشبو سے لبریز ہو۔میں نے اس گھر اور گھر گرہستی کو خلوص دل سے سنبھال کر رکھا ہے،وہ اس لئے بھی کہ یہ آپ کا گھر ہے،میرا گھر ہے۔ہم دونوں کا بسیرا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ۔ ۔ ۔ !!

"بڑی بات کیا ۔ ۔ ۔؟"

"میں آپ ۔ ۔ آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔اس قدر محبت کہ اس کی گہرائی، اس کی شدت کا احساس شاید آپ کو نہیں ہے۔لیکن مجھے دُکھ بھی ہے"

"دُکھ کس بات کا ۔ ۔ ؟"

"ان آٹھ برسوں میں، میں آپ کے یہ اثاثے، یہ زمین وزراعت، یہ جائیداد یں سنبھالنے سنوارنے کے لئے وارث نہ دے سکی۔وہ مسکراہٹیں نہ دے سکی جو معصوم بچوں کے ہونٹوں پر کھلتی ہیں۔نہ تو آپ نے گڑے گڑیوں کے کھیل دیکھے اور نہ ہی مٹی کے گھروندے، پر اس میں میرا کیا قصور۔اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکانا بھی ایک عبادت ہے۔شاید میری عبادت قبول نہیں ہوئی۔اسی لئے تو میں نے کئی بار کہا تھا"

"کیا کہا تھا ۔ ۔ ۔ ؟"

"شاید آپ کو وارث مل جائے۔آنے والے دنوں کے لئے سہارا مل جائے ۔ ۔ !"

"کیسے ۔ ۔ !!"

"دوسری شادی کر کے۔لیکن آپ تو ہر بار انکار کرتے اور اب ۔ ۔"

"اب کیا ۔ ۔ ؟"

"آپ دوسری شادی کرنے کے لئے بضد ہیں"

"ہاں آرزو میری خواہش کی تکمیل کے لئے میرا ساتھ دینا چاہتی ہے"

"آرزو"

"اُس کا نام آرزو ہے۔اُس کی ایک شرط بھی ہے"

"وہ کیا ۔ ۔ ؟"

"وہ نہیں چاہتی کہ تم بھی اسی گھر میں رہو"

"میں ۔ ۔ میں کہاں جاؤں گی ۔ ۔ میرا کون ہے اب یہاں اس جہاں میں آپ کے بغیر ۔ ۔ آپ بے شک شادی کر لیجئے، دوسری شادی ۔ ۔ آرزو کو ہی اپنا لیجئے۔لیکن مجھے میرے ہی گھر سے بے گھر مت کیجئے۔میں اسی گھر میں پڑی رہوں گی ایک گوشے میں۔آپ کی خدمت کرتی رہوں گی، زندگی کی آخری سانس تک۔آرزو کو گھر گرہستی سنبھالنے میں مدد کروں گی"

"لیکن یہ آرزو کو منظور نہیں"

"اور آپ کو ۔ ۔ !"

"میں مجبور ہوں اور مجبور اُ مجھے ۔ ۔ ۔ !"

"آپ کو کیا ۔ ۔ ؟"

"کوئی راستہ اختیار کرنا ہوگا"

"کیسا راستہ اور کس لئے"

"تم کو اس گھر ۔ ۔ گھر گرہستی اور آرزو سے دور رکھنے کے لئے"

"میں نے آرزو کا ایسا کیا بگاڑا ہے۔ اگر آرزو میری جگہ ہوتی تو کیا وہ ایسا ہی کرتی"

"میں نہیں جانتا"

"آپ نے پوچھا نہیں آرزو سے ۔ ۔ ؟"

"نہیں"

"تو آپ جانتے ہی کیا ہیں؟"

"صرف یہ کہ آرزو اس گھر میں آئے گی اور تم کو اس گھر سے جانا ہوگا ۔ ۔ ہمیشہ کے لئے"

"گہری اُداسیوں کا لبادہ اوڑھے میں کہاں جاؤں گی ۔ ۔ اور پھر مجھے اپنے ہی گھر سے کسی کے کہنے یا چاہنے سے بے گھر کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس گھر کے در و دیواروں نے لمحہ لمحہ میری حفاظت کی ہے۔ مجھے تحفظ دیا ہے۔ یہ تحفظ مجھے کہاں اور کیسے ملے گا۔ یہاں میری آٹھ سالہ ازدواجی زندگی کے ان گنت راز، ان گنت یادیں، کھٹی میٹھی، آدھی ادھوری یادیں میری چاہت کی گواہ ہیں۔ یہ ساری یادیں آپ سے وابستہ ہیں، آپ کے گھر سے وابستہ ہیں۔ میری محبت ان یادوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے مجھے کیسے گھر سے بے گھر کیا جاسکتا ہے"

"طلاق دے کر"

"طلاق ۔ ۔ ؟"

"ہاں طلاق"

"اور اگر میں طلاق لینے سے انکار کردوں تو ۔ ۔ ؟"

"سہ طلاق ۔ ۔ آرزو کو پانے کے لئے میں اس حد تک بھی جاسکتا ہوں۔ کیونکہ میں وقت کے بہتے دریا میں ڈوب چکا ہوں۔ اپنے آپ، اپنے وجود اور اپنے آس پاس سے بے خبر ہو چکا ہوں"

"آپ اب بھی وقت کو تھام سکتے ہیں"

"کیسے ۔ ۔ ؟"

"کسی بے سہارا معصوم بچے کو گود لے کر ۔ ۔ ایسا کر کے ایک بے سہارا کو سہارا مل سکتا ہے اور آپ کی وراثت کو وارث ۔ ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اُس وارث کو میں سنبھال لوں گی، سنوار لوں گی، دیکھ بھال کروں گی، اپنے خون جگر سے پالوں گی، پڑھاؤں گی، لکھاؤں گی، ماں بن کر آپ کا بیٹا کہلانے کے قابل بناؤں گی"، "میں ایسا نہیں کرسکتا۔ ایسا کر کے میں آرزو کو اپنی آرزو میں کیسے بدل سکتا ہوں۔ ایسا ممکن نہیں

ہے میرے لئے اور پھر ۔۔۔۔!"

"پھر کیا ۔۔؟"

"طلاق دینے سے روک کون سکتا ہے ۔۔؟"

"میں"،"تم بھی نہیں ۔۔ تم سن رہی ہونا۔ میں سنجیدہ ہوں بہت سنجیدہ ہوں ۔۔ یہ کیا ۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میری بات سن کر تمہیں مایوس ہونا چاہیے تھا لیکن تم ۔۔؟"

"میں کیا ۔۔؟"

"تم ہنس رہی ہو"

"ہاں میں ہنس رہی ہوں۔ لیکن ابھی میری یہ ہنسی بے آواز ہے، بے عنوان ہے۔ دُعا کیجئے کہ یہ ہنسی بے آواز ہی رہے، بے عنوان ہی رہے، ورنہ ۔۔!"

"ورنہ کیا ۔۔؟"

"ناصر صاحب معصوم بننے کی کوشش مت کیجئے۔ آپ شاید نہیں جانتے، یا جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مت بھولئے کہ ایسا کرنے کے لئے آپ کو ۔۔!"

"مجھے کیا ۔۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"وقت نے زبردست کروٹ بدلی ہے۔ اب ایسا کرنے کے لئے آپ کو تین سال جیل میں گزارنے ہوں گے ۔۔ اکیلے ۔۔ تنہا ۔۔ کوئی آرزو نہ ہوگی وہاں اور پھر ان تین سالوں کے دوران بہت سارے دیکھے اَن دیکھے خواب آپ کے لئے صرف ایک آرزو بن کر رہ جائیں گے۔ بہت سارے خواب جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ جائیں گے۔ آرزو کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائیں گے ۔۔ یوں میری جانب کیا دیکھے جا رہے ہیں۔ میں سنجیدہ ہوں بہت سنجیدہ۔ اور شاید یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ آٹھ برس قبل میں آپ کی زندگی میں آرزو بن کر آچکی ہوں ۔۔ میں ۔۔ جا رہی ہوں"

"کہاں جا رہی ہو ۔۔؟"

"گھر سے باہر نہیں جا رہی ہوں۔ آپ کی نظروں سے بھی دور نہیں جا رہی ہوں اور کبھی بھی نہ جاؤں گی۔ ہمیشہ یہیں رہوں گی ۔۔ اپنے گھر میں ۔۔ آپ کے ساتھ ۔۔ ہاں ذرا چائے بنانے جا رہی ہوں، اپنے لئے اور آپ کے لئے"

"آرزو ۔۔"

"میرا نام آرزو نہیں، جنت ہے اور جنت اپنانے کی آرزو کسے نہیں ہوتی ۔۔!!"

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

محمد بشیر مالیرکوٹلوی
مالیرکوٹلہ، پنجاب

قانون کی موت

نام:محمد بشیر، قلمی نام:محمد بشیر مالیر کوٹلوی، تاریخ پیدائش:10/جون1950، مالیر کوٹلہ، ضلع سنگرور (پنجاب)، پیشہ: ریٹائرڈ اسٹیٹ آفیسر، پنجاب وقف بورڈ، محمد بشیر مالیر کوٹلوی بحیثیت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، محقق اور نقاد مشہور ہیں۔، تصانیف: قدم قدم روح، سلگتے لمحے، چنگاریاں، جگنو شہر، کرب آگہی، عکس در عکس، زندگی زندگی ان کے شائع شدہ افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کا ایک ناول ''جسی'' بھی اس سال شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ/افسانچہ تکنیکی تناظر میں ،ہم قلم اور گستاخی معاف ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتابیں ہیں۔ سہ ماہی ''اسباق'' پونہ اور ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی نے ان کے فکر وفن پر گوشے شائع کیے ہیں۔ وابستگی: بشیر مالیر کوٹلوی کئی اداروں سے جڑے ہوئے ہیں جس میں وہ افسانہ کلب مالیر کوٹلہ، ادبی سنگم مالیر وغیرہ کے صدر ہیں۔
اسفار بیرون ملک: لاہور، کراچی (پاکستان) فون نمبر:07984431937

تین دن پہلے بہرام پور میں واردات ہی ایسی ہوئی تھی کہ جو سنتا اس کا کلیجہ منہ کو آجاتا کوئی لوگ تو قصہ سن کر جھرجھری لیتے اور کانوں کو چھو کر کہہ اٹھتے ،کل یگ ،گھور کل یگ ______!! ماسٹر امر کمار کی پانچ سالہ صحت منداور خوبصورت بچی پنکی کا بے دردی سے گینگ ریپ ہوا۔ بعد میں اس کا گلا گھوٹ کر اسے قتل کردیا گیا۔خون میں لت پت بچی کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک کر مجرم بھاگ گئے۔انسانوں کی درندگی کے بعد جب کتوں نے اپنی درندگی کی نمائش کی تو کسی کی نظر پڑگئی۔اس نے شور مچایا تو لوگ اکٹھے ہوگئے۔ کسی نے بچی کو پہچان لیا کہ لاش ماسٹر امر کمار کی بیٹی پنکی کی ہے۔ ماسٹر امر کل سے پنکی کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے اور ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ پولیس بھی بچی کی تلاش میں تھی۔ان کو بچی سے زیادہ اپنی اپنی وردیوں کی فکر تھی جسے نوچنے کے لئے سیاست دان دیر نہیں لگاتے تھے۔انہوں نے عوام کو جواب دینا ہوتا ہے۔خبر پھیلی تو میڈیا کے لوگوں نے کیمروں سے لیس ہوکر جھاڑیوں کو گھیر لیا۔ ماسٹر امر اور پولیس والے نہیں چاہتے تھے کہ بچی کی تصویریں میڈیا پر دکھائی جائیں پر چینل والا یہ اہم خبر، سب سے پہلے اپنے چینل پر دکھانے کی دوڑ میں تھا۔ ایس ایس پی کو سوالوں کی بوچھاڑ نے گھیر رکھا تھا۔ ماسٹر امر کمار کی بچی کو دیکھ دیکھ کر بے حال ہو رہا تھا۔ بچی کی ماں اور بہنوں کی چیخیں سن سن کر ہر کسی کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ یہ دل دوز منظر دیکھ کر ہر کسی کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ علاقہ کے ایم پی دہلی میں مصروف تھے۔ فوراً بہرام پور نہیں آسکتے تھے۔حلقہ ایم ایل اے اپنی ٹیم کے ساتھ غمزدہ کنبے کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔ ایس ایس پی کو دہلی

ISSN No. : 2395-2016

سے فون پر ہدایتیں مل رہی تھیں کہ قاتلوں کو فوراً پکڑو۔ پارلیامنٹ کا سیشن چل رہا ہے۔ لا اینڈ آرڈ رکا ایشو لے کر اپوزیشن شور مچائے گی۔ میڈیا آج ہی اس واردات کو پوری دنیا میں دکھا دے گا اور بچی کے قتل پر سیاست شروع ہو جائے گی۔

دوسرے ہی دن بہرام پور جیسے غیر معروف قصبے کا نام پورے ملک میں مشہور ہو گیا۔ ٹی وی کا ہر چینل رام کمار کی بیٹی پنکی کے قتل اور بلات کار کو لے کر بات کر رہا تھا۔ بار بار پنکی کی تصویر اور سوگوار ماں باپ کی حالت دکھائی جا رہی تھی۔ صوبائی سطح کے لیڈر جو اپوزیشن میں بیٹھے تھے بار بار سی ایم سے استعفٰی کی مانگ کر رہے تھے۔ اور بیان دے رہے تھے کہ سی ایم ''بیٹی بچاؤ'' کے معاملہ میں بری طرح نا کام رہے ہیں۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ ایم اے فرسٹ ایر کے طالب علم رنبیر کی ماں، بڑے پیار سے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بیٹے کے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے وہ پر سکون ہو گیا تھا۔ رنبیر کے بابو جی اور بھائی سکھبیر نے بڑی مشکل سے اسے کھانا کھانے کے لئے رضا مند کر لیا تھا۔ ماں کی گود سے سر اٹھا کر بیڈ کی ایک طرف بیٹھ کر وہ آنکھیں پھاڑے، خوف زدہ نظروں سے کمرے کی دیواروں کو تکنے لگا۔ رنبیر کی چھوٹی بہن کھانے کی ٹرے دونوں ہاتھوں میں لئے کمرے میں داخل ہوئی۔

ٹرے کو گھورتے ہوئے وہ چلا اٹھا، اری یہ۔ یہ کیا لے آئی تو ____!

ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''رنبیر کھا لے بیٹا ____! کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا ____ دیکھ ___ دیکھ تیری پسند کا کھانا ہے۔ راج ماہ اور چاوہ ____! وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر بولا ''خون ____ خون ____ اس کے چیتھڑے ____ ماں وہ پنکی کا ____!! نہیں نہیں، مجھ سے نہیں کھایا جائے گا ____!

بہن نے اس کی طرف ٹرے بڑھائی تو اس نے ٹرے کو گھورتے ہوئے، زور سے الٹا ہاتھ مار دیا سارا کھانا فرش پر بکھر گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر چلایا۔

''تم میری بہن ہو یا دشمن ____ یہ کھلانے لاتی ہے مجھے ____؟ پنکی کا خون ماس ___!!

بہن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے وہ حواس باختہ ہو کر بکھرے ہوئے کھانے کو دیکھ رہی تھی، رنبیر بے حال ہو کر اپنا سر پیٹنے لگا، رونے لگا، تھوڑی دیر بعد وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا، ایک بار پھر وہ ماں کی گود میں سمٹنے کی نا کام کوشش کرنے لگا۔ ماں نے اپنی اوڑھنی سے اس کا سر چھپا لیا۔ بہن خاموشی سے فرش صاف کرنے لگی۔ بابو جی یہ سارا تماشہ دیکھ گہری سوچ میں غرق ہو کر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد رنبیر نے، اوڑھنی کا تھوڑا سا پلو اٹھا کر دیوار کو گھورا اور چلا اٹھا۔ اوڑھنی منہ پر لے کر وہ ماں سے چپکتے ہوئے بولا ''مجھے بچا لو ماں۔ میں مرنا نہیں چاہتا ____!!'' ماں اسے تسلی دیتے ہوئی بولی۔ ''رنبیر تو مر گئی ____ مرے ہوئے تھوڑے کسی کو مار سکتے ہیں، بھلا!''

رنبیر چلایا میں نے ہی تو مارا اس کو۔ ہاں میں نے نئے بلیڈ سے اس کا گلہ کاٹ دیا ____!!''

ماں، تشویش بھرے لہجے میں بولی ''چپ ہوجا____ تونے کچھ نہیں کیا____!
وہ بحث کے لہجے میں بولا'' اری نہیں ماں____ میں نے____ میں نے ہی____!!''
ٹہلتے ٹہلتے بابو جی ایک دم رک گئے کمرے کو اندر سے بند کر کے، غصہ سے بل کھاتے ہوئے انہوں نے رنبیر کی ماں کی گود سے کھینچ کر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ اور چلائے ''حرام زادے کتے____ یہ پاپ تم نے کیا ہی کیوں، اگر ہوگیا تو شور کیوں مچا رہا ہے!!!
حرامی____! کیوں بار بار پنکی کے نام کی رٹ لگا رہا ہے____!!
رنبیر اور زور سے رونے لگا مارو____ مارو مجھے____ مار ڈالو، ہم پاپی ہیں، بلات کاری اور خونی ہیں۔ میں نے کیا ہے خون پنکی کا____!!''
بابو جی ایک بار پھر اس کی طرف مٹھیاں بھینچ کر بڑھے، سکھبیر نے آگے بڑھ کر ان کا بازو پکڑ لیا اور بولا ''کیا کر رہے ہیں آپ____!؟ اس کو مارنے سے کچھ نہ ہوگا اس نے تو جو کرم کرنا تھا وہ کر چکا۔ شور مچانے سے محلے والے جان جائیں گے کہ رنبیر ہوسٹل نہیں گیا، گھر پر ہی ہے پولیس والے کتے کی طرح سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ کے دولڑکے انہوں نے کیا۔
بابو جی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور سکھبیر کی طرف دیکھ کر بولے ''ارے تو کیا کروں اس حرامی کا۔ اس کو کسی دوسری جگہ لے جا بھی تو نہیں سکتے۔ یہ پنکی پنکی کہتا ہوا پکڑا جائے گا اس کا تو جو ہونا ہے وہ ہوگا، علاقہ میں ہماری بدنامی کتنی ہوگی ارے____ ہم بھی بیٹیوں والے ہیں، تیری دو نہیں شادی کے لائق بیٹھی ہیں۔ کسی بھلے گھر کا رشتہ ملے گا ان کو____!؟
مار کھا کر رنبیر کچھ زیادہ ہی پریشان کرنے لگا تھا۔ سکھبیر دوسرے کمرے سے نشے کا انجکشن بھر کر لایا اور اس نے رنبیر کے بازو میں لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد رنبیر کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔ سکھبیر رنبیر کو کمرے میں چھوڑ کر گھر کے لوگ سونے کے لئے چلے گئے۔
صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہو کر بابو جی اخبار اٹھانے کی غرض سے پھاٹک کی طرف بڑھ گئے آسمان آبر آلود تھا۔ فرش دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی بوندا باندی ہوئی ہے۔ انہوں نے اخبار اٹھایا پہلے صفحہ پر عورتوں کی ریلی کی تصویریں اور بہرام پور کانڈ پر لمبی چوڑی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ لیڈروں کے بیان سے ظاہر تھا کہ انہوں نے بیوروکریسی کو سخت قدم اٹھانے کی ہدایات دی ہیں۔ پھاٹک کھلا دیکھ کر ان کے ذہن میں جیسے کوندہ لپکا، ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ اخبار تہہ کرتے ہوئے وہ رنبیر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ بغیر وہ چلائے ''سکھبیر او سکھبیر، اے رنبیر کہاں گیا____!!
سکھبیر نے آنکھیں ملتے ہوئے ایک جماہی لی اور بولا ''باتھ روم گیا ہوگا____!!''
بابو جی اس کا کندھا ہلا کر بولے ''باتھ روم سے تو میں ابھی بھی آیا ہوں۔ پھاٹک کھلا ہے لگتا ہے وہ پاگل پن

ISSN No. : 2395-2016

میں باہر نکل گیا۔ جلدی اٹھ____!!"

سکھبیر چپل گھسیٹتا ہوا باتھ روم کی طرف چل دیا۔ بابو جی نے اخبار چار پائی پہ رکھ کر اپنے کپڑے درست کیئے اور سکھبیر کی نئی بائیک نکال کر گلی میں کھڑے ہو کر سکھبیر کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سکھبیر بھی آ گیا اور فکر مندی سے بولا" چلیئے____! بابو جی____ دیکھتے ہیں وہ کہاں چلا گیا۔ ڈر یہ ہے کہ وہ پولیس والوں کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔ پولیس والے رات یونیورسٹی کے ہوسٹل بھی گئے تھے اسے دیکھنے! کسی لڑکے نے فون پر بتایا تھا رنبیر کو!

بابو جی____ بائیک کے پیچھے سوار ہوتے ہوئے بولے" مطلب یہ کہ پکڑے ہوئے لڑکوں نے رنبیر کا نام بتا دیا۔!!"

بارش تیز ہو چکی تھی۔ آگے چل کر،

بابو جی کو کسی نے بتایا کہ رنبیر کسی کو پکارتا ہوا دریا کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ سکھبیر نے بائیک دریا کی طرف موڑ لیا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بابو جی بڑبڑاتے"۔ ارے! رنبیر تو تیرنا بھی نہیں جانتا۔ سکھبیر جلدی چل____!" سکھبیر نے بائیک کی رفتار اور بڑھا دی۔

ان دنوں بارشوں کے قہر سے سارا دیش کانپ رہا تھا دریا کا پانی خطرہ کے پوائنٹ سے کافی اوپر آ چکا تھا۔ بارش کی پرواہ کئے بغیر، رنبیر دریا کی طرف پیٹھ کئے ہاتھ جوڑے۔

"نہیں____!! نہیں پنکی نہیں____! مجھے تیرنا نہیں آتا____ میں ڈوب جاؤں گا۔ مر جاؤں گا____! یہ____! یہ ترشول ہٹا لو، پنکی پنکی____!! وہ آہستہ آہستہ پیچھے دریا کی طرف ہٹ رہا تھا۔ اور روئے جا رہا تھا۔!

دور سے بابو جی چلائے۔ رنبیر پیچھے مت ہٹو۔ ہم آرہے ہیں۔ تمہیں تیرنا میں آتا، ڈوب جاؤ گے____!!"

رنبیر نے جیسے بابو جی کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ گڑگڑائے جا رہا تھا۔

"مت دو دکھا پنکی رحم کرو۔ معاف کر دو____! اس دن ہم سب نے نشہ کی او ور ڈرونہ سار کھی تھی۔ ہمیں ہوش نہیں تھا۔ ہم اندھے ہو گئے تھے____ معاف کر دو پلیز____!!"

دفعتاً رنبیر کو محسوس ہوا جیسے کسی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر، پورے زور سے اس کی چھاتی پر دے مارے۔ وہ دریا میں گرنے ہی والا تھا، کہ کسی کے مضبوط ہاتھ نے اس کی اس کا بازو ر پکڑ کر کھینچ لیا۔ رنبیر نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا۔ انسپکٹر پولیس اسے کہہ رہا تھا"۔ رنبیر اگر مرنا، ہی ہے، تو چل قانون کی موت مر____! چل تیرے دو ساتھی، حوالات میں تیرا انتظار کر رہے ہیں۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

سید احمد قادری، گیا

جڑوں سے جو اکھڑے تو......

ڈاکٹر سید احمد قادری، اپنے افسانوں، تنقید اور صحافت کے حوالے سے پوری اردو دنیا میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔آپ کی ولادت 11 ستمبر 1954ء کو ریاست بہار کے شہر اورنگ آباد میں ہوئی۔ بی ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مگدھ یونیورسیٹی، بودھ گیا سے بوٹنی (نباتات) میں ایم ایس سی اور ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری لینے کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، ساتھ ہی ساتھ ان کا افسانوی، صحافتی، تنقیدی اور تحقیقی سفر کبھی تیز اور کبھی مدھم رفتار سے جاری رہا ۔ڈاکٹر سید احمد قادری کے اب تک چار افسانوی مجموعے (1) ریزہ ریزہ خواب (1985)، (2) دھوپ کی چادر (1995)، (3) پانی پر نشان (2006) اور (4) 'ملبہ' (2015) کے ساتھ ساتھ سات تنقیدی کتابیں (1) فن اور فنکار (1986ء)، (2) افکار نو (1996ء)، (3) اردو صحافت بہار میں (2003,2016ء)، (4) شاعر اور شاعری (2007ء)، (5) افسانہ نگار اور افسانے (2008ء)، (6) اقدار و امکان (2014ء) اور (7) 'اردو صحافی بہار کے' (2015ء) پر منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہی ہیں۔ ان تمام کتابوں پر بہار اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی اور دیگر کئی اداروں نے قومی سطح پر شائع ہونے والی کتابوں میں انعامات سے نوازا ہے۔ ''اردو صحافت بہار میں'' ایسی تنقیدی و تحقیقی کتاب ہے، جسے ڈاکٹر سید احمد قادری نے کے.کے. برلا فاؤنڈیشن، نئی دہلی کے ذریعہ ملے فیلوشپ کے تحت لکھی ہے، جسے نہ صرف مغربی بنگال اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی نے اوّل انعام دیا بلکہ اسے ریاست بہار کی تمام یونیورسیٹیوں کے ایم اے (اردو) کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری قومی، بین الاقوامی سیمیناروں، ریڈیو، ٹیلی ویژنوں کے مباحثوں میں بھی شریک ہو کر اپنے منفرد اظہار و بیان سے اپنی ایک خاص پہچان بنائی ہے۔ انھیں مگدھ یونیورسیٹی کے سینیٹ کا ممبر بھی نامزد کیا جا چکا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بہار اردو اکادمی اور اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو، بہار کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی بہار میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں کافی نمایاں رول ادا کیا ہے۔ امریکہ کے دورہ میں بھی، ان کے اعزاز میں کئی ادبی نشستوں کا اہتمام کیا گیا

مرزا صفیر الدین ہجرت در ہجرت کے کرب کو جھیلتے ہوئے، اب سے دس سال قبل جب وہ یہاں آئے تھے، تو انہیں ایسا لگا تھا جیسے کڑی دھوپ کی تیز نوکیلی تمازت اور لو کے تھپیڑوں میں مسلسل چلتے ہوئے اچانک ایک ہرے بھرے باغ کی پر بہار فضا میں آ گئے۔ جہاں ہر طرف پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں طرح طرح کے رنگ برنگے خوشنما پھول اور ان پھولوں کی خوشبو سے پورا باغ معطر تھا۔ ان کے جسم کے رگ و پے میں اترتی ہوئی سرد ہوائیں تھیں۔ وہ بہت دنوں تک اس گھنیری ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے ہو کر سرد ہواؤں کو اپنے جسم کے پور پور میں اتارتے رہے۔ مسلسل خاردار اور اندھے راستوں پر چلتے چلتے ان کا جسم لہولہان ہو چکا تھا اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ لیکن چند دنوں میں ہی بیٹا، بہو اور ان کے

ISSN No. : 2395-2016

دونوں بچوں کی بے پناہ محبت اور پیار نے ان کی ساری تکان اور پریشانیوں کو دور کردیا تھا۔ دھیرے دھیرے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔

مرزا اصفیرالدین کو امریکہ میں ہر طرح کی آسائش اور آرام میسر تھا۔ بیٹا، بہو اور دونوں بچے ہر وقت ان کی دلجوئی کرتے رہتے۔ گرچہ صبح سویرے ہی بیٹا، بہو اپنے اپنے جاب پر نکل جاتے اور بچے اسکول کے لئے روانہ ہوجاتے۔ اس کے بعد اچھا خاصہ وسیع وعریض سجا سجایا گھر، فریز میں طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزیں، جو چاہو کھاؤ پیو، ٹی۔ وی دیکھو، نٹ پر دوستوں، عزیزوں سے باتیں کرو، فیس بک پر سینکڑوں دوستوں کی بھیڑ تھی، لیکن تنہائی کا عفریت پورے گھر پر قبضہ جمائے رہتا۔ شروع کے دنوں میں مرزا صاحب نے اس تنہائی کے عفریت سے بھی دوستی کرلی تھی اور وقت گذاری کے لئے ٹیلی ویژن پر خبریں، سیریئل، انٹرنٹ پر اپنی دلچسپی کے ویب سائٹس، فون پر دوستوں اور عزیزوں سے گھنٹوں گفتگو۔ لیکن دھیرے دھیرے ان سب سے بھی دل اچاٹ ہوگیا اور تنہائی کا عفریت انہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ اس سے بچنے کے لئے وہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں پناہ لینے کی کوشش کرتے، لیکن انھیں یہاں بھی پناہ نہیں ملتی۔ تھک ہار کر وہ نیند کی پناہ میں جانا چاہتے، لیکن نیند بھی کوسوں دور کھڑی ان کے حال پر مسکراتی رہتی۔ کبھی ہلکی سی نیند آتی بھی تو بچپن کی یادیں، جوانی کی پریشانیاں بند آنکھوں میں سپنا بن کر اترنے لگتیں اور کبھی انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے سرہانے کبھی ان کے ابا، اماں، بھائی جان، باجی سب کے سب کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں، اٹھو جاگو صفیر.......... کتنا سووگے.....اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ جاتے، چاروں جانب بے چینی کے عالم میں نظریں دوڑاتے.....لیکن یہاں تو کوئی نہیں.......وہ ہیں اور تنہائی ہے۔ ہاں ان لوگوں کی یادیں ضرور ان کے دل ودماغ کو تڑپانے اور آنکھوں کو سمندر بنانے لگتیں........

اب یہ زندگی انہیں بے کیف لگنے لگی تھی اور یہ محسوس کررہے تھے کہ وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں گے.....کوئی انہیں بلا رہا ہے، آجاؤ، صفیر.......زندگی میں تم نے بہت دکھ جھیلا ہے، لمحوں کی خطائے کئی دہائیوں کی سزا دی ہے تمہیں.....ہمیں.....ہم سب کو......آؤ........اب تم بھی آرام کرو! زمانے کی گردشوں کی دھول میں بہت چل چکے......اب آرام کرو........

ایک ویک اینڈ میں، جب سبھی ساتھ مل کر کھانا کھا کر بیٹھے، خوش گپیوں میں مشغول تھے، اس دوران ان کا بیٹا مرزا اسلم نے محسوس کیا کہ، بات کرتے کرتے ابا کہیں گم ہوجا رہے تھے، اداس، اداس سی ان کی آنکھیں خلاء میں کچھ ڈھونڈھ رہی ہیں۔ مرزا اسلم نے فکرمند ہوتے ہوئے پوچھا.....

''کیا بات ہے ابّا، آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟''

مرزا صفیرالدین، بیٹے کے اچانک اس سوال پر چونک پڑے اور کہا.......

''پریشان...... ہاں، ہاں.... بیٹا، میں پریشان تو ہوں۔ دراصل ان دنوں مجھے اپنا ملک بہت یاد آرہا ہے اور میری دلی خواہش ہو رہی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے میں اپنے ملک جاؤں اور..........''

مرزا صفیرالدین کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ بیٹا مرزا اسلم نے چونکتے اور پھر مسکراتے ہوئے پوچھا.......

''کون سا ملک ابّا.....''؟

اس سوال پر مرزا صفیرالدین بھی چونک پڑے اور خود ہی بڑبڑانے لگے......

''ملک کون سا ملک...؟ میرا کون سا ملک...؟، جسے میں اپنا کہوں......وہ، یہ یا وہ......''

اور پھر اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں، بیٹا، میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں......میں اس ملک کی بات کر رہا ہوں، جہاں ہم اپنی جڑوں کو چھوڑ آئے، شاندار مستقبل سجانے کے لئے، لیکن شاندار مستقبل تو چھوڑو، وہاں پناہ تک دینے کو کوئی تیار نہیں ہوا کہ ہم لوگوں کی وہاں آمد سے، ان لوگوں کا روشن مستقبل، اندھیرے میں ڈوب جانے کا خدشہ تھا اور ایک بار ہم اپنی جڑوں سے جو اکھڑے، تو پھر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملی ......دراصل ادھر کئی دنوں سے مسلسل ابّا میرے خوابوں میں آرہے ہیں، ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ........مجھے ماضی کے دھندلکے میں لے جاتا ہے........میں ان کی گود میں طرح طرح کی شرارتیں کرتا......کبھی وہ میرے گالوں کو چومتے ،تو جواب میں، میں بھی ان کے گالوں اور پیشانی کو چومتا......امّاں کی بھی بہت یاد آرہی ہے۔میں اپنے ابّا کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں اور قبر کے قریب بیٹھ کر ان سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں.....، میرے ابا تو مجھے دس سال کی عمر میں ہی روتا بلکتا چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے تھے اور ان کے گذر جانے کے دو سال بعد ہی اماں اور ماموں وغیرہ نے آخری بار ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنے کی تاکید کی تھی۔ اس وقت، ان کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی ....اور میں جس دن فاتحہ پڑھ کر گھر آیا تھا، اس کے دوسرے ہی دن تو وہاں سے ہم لوگ ایک نئے اور اندھے سفر پر اپنا سب کچھ چھوڑ کر نئی اور شاندار دنیا بسانے کے لئے اس ٹرین سے روانہ ہوئے تھے، جس ٹرین میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح سوار تھے۔ ہر کے چہرے سے پریشانیاں جھلک رہی تھیں، لیکن آنکھوں میں سنہری خواب بسے تھے

ISSN No. : 2395-2016

......لگا تار کئی دنوں تک رُک رُک کر مسافت طئے کرنے کے بعد جب ہم بظاہر منزل پر پہنچے......تو منزل کا کہیں پتہ نہیں تھا......آس پاس ہر چہار جانب اداسیاں اور مایوسیاں چھائی ہوئی تھیں۔سارے سنہری خواب کو بے درد وقت اور حالات اور ایک غلط فیصلے نے چکنا چور کر دئے تھے۔بے پناہی جیسے ہمارا مقدر بن گیا تھا......برسہا برس تک ہم منزل کے متلاشی رہے......میں نے بچپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا، اور اس وقت تک ہماری اپنی کوئی پہچان نہیں تھی......اجنبیوں کی طرح ادھر سے ادھر بھٹکتے رہے ،منزل کی تلاش میں......بالکل بنجارہ بن گئے تھے ہم لوگ، کبھی یہاں خیمہ، کبھی وہاں خیمہ......جسم زخموں سے چور، اور روح لہولہان......ایسے میں اپنی جڑیں بہت یاد آتی تھیں......وہ کشادہ سا گھر......گھر کے اندر بڑا سا آنگن......گھر کے باہر وسیع و عریض دالان......اور اس دالان کے آگے دانہ چگتی ہوئی مرغیاں، چن چن، چن چن کرتی ہوئی چینا مرغیاں......گھر کے سامنے کا تالاب، تالاب میں طرح طرح کی اچھلتی تیرتی مچھلیاں، اٹھکھیلیاں کرتے ہنس بطخ اور چھوٹی بطخیں......مچھلی کے شکار کے لئے تالاب کے کنارے اترتے ہوئے بگلوں کے غول، تالاب کے اردگرد جھومتے گاتے طرح طرح کے پرندے ......اور تالاب کے اردگرد لہلہاتے کھیت......کھیتوں سے باسمتی چاول کی پھوٹتی بالیوں سے معطر کرنے والی خوشبو......اور پھر چند قدم کے فاصلے پر میرا مکتب......جہاں مولوی خیر الدین صاحب کے ہاتھ سے کھجور کی چھڑی شائد ہی الگ ہوتی اور ہر ایک غلطی پر ایک چھڑی، سڑاپ سے پیٹھ پر لگتی۔اس وقت کی، اس چھڑی کی وہ مار اور بعد میں ماسٹر بدری نرائن جی کے خلوص و محبت کے ساتھ دی گئی تعلیم نے زندگی کے بوجھ کو ڈھونے میں بہت مدد کی...ان دونوں کی بھی بہت یاد آتی ہے......ماسٹر بدری نرائن جی کا بیٹا کشور میرا بہت اچھا دوست تھا......جب کبھی میں اس کے گھر جاتا تو اس کی ماں بڑے پیار سے مجھے کبھی ٹھیکوا، کبھی بتاشہ اور کبھی اصل گھی کا میٹھی کا لڈو کھانے کو دیتی تھیں۔دیوالی کے روز ان کے گھر پر جس طرح روایتی انداز میں چراغاں کیا جاتا تھا، اس سے نہ صرف ان کا گھر بلکہ آس پاس کے گھر بھی روشن ہو جاتے، جس کی خوبصورتی دیکھنے لائق ہوتی اور ہم سبھی مل کر پھُل جھڑیاں، گھرنی، انار وغیرہ کی روشنی سے لطف اٹھاتے ۔کھانے کو دیوالی کی مٹھائیاں بھی ملتیں، خاص طور پر جھروا کا لڈو اور لکھ ٹھو کی لذت کو میں آج بھی نہیں بھولا ہوں.........عید بقرعید، شب برات جیسے تہوار پر کشور، اس کی سب بہنیں صبح سویرے سے ہی میرے گھر آ جاتیں اور پورا گھر اس دن ایک الگ نظارہ پیش کرتا، وہ سب جب گھر جانے لگتے تو انھیں پربیاں بھی اماں دیتیں، اور وہ سب خوش خوش سبھوں کو سلام کرتے، ان کے پاؤں چھوتے واپس جاتے ......لیکن سب کچھ ختم ہو گیا، سب بچھڑ گئے، سب کچھ اجڑ گیا....ایک بار جو ہم اپنی جڑوں سے اکھڑے

تو کہیں امان نصیب نہیں ہوئی مسلسل سفر......لمبا سفر....ہجرت......در ہجرت......ابا کی قبر ہندوستان میں تو اماں بنگلہ دیش میں آرام فرما ہیں ،باجی، پاکستان میں اور بھائی جان جرمنی میں............ اور............اور............"

یہ کہتے کہتے مرزا اصفیر الدین سسکنے لگے،ان کی آنکھوں سے یادیں آنسو بن کر نکلنے لگے........

اس طرح انھیں روتے ہوئے دیکھ کر ان کے بیٹا، بہو اور دونوں بچے سب حیران و پریشان ہو گئے تھے .....ان کی رقت آمیز باتیں سنتے ہوئے، ان کے بیٹا اور بہو کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ان کا بڑا پوتا امجد بھی بہت تعجب سے اپنے دادا کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج دڈو اس طرح بچوں کی طرح رو کیوں رہے ہیں؟ وہ صوفہ سے اٹھا اور اپنے دڈو کے قریب آ کر اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو خاموشی سے پوچھنے لگا اور فرط جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے دڈو نے اپنے پوتا کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولے........

"بیٹا تم اپنی جڑوں کو کبھی مت چھوڑنا، خواہ کیسا ہی طوفان آئے، آندھی آئے، اپنی جڑوں پر ہمیشہ قائم رہنا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیر

سفید نور کا راز

نام: ڈاکٹر ریاض احمد بٹ، قلمی نام: ڈاکٹر ریاض توحیدی، پیشہ: لیکچرار (محکمہ تعلیم جموں وکشمیر)، پیدائش: یکم دسمبر 1973ء

تعلیم: گریجویشن 1999، گورنمنٹ ڈگری کالج ہندوارہ، ایم اے (اردو)، 2002، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

ایم فل: 2004، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، پی، ایچ، ڈی 2007، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

اعزازات: گولڈ میڈل 2009، (اقبالیات)

تصانیف: (۱) جہان اقبال (تحقیق، تنقید) 2010 (۲) کالے پیڑوں کا جنگل (افسانے) 2011، (۳) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبال شناس (تحقیق و تنقید) 2013، (۴) کالے دیوؤں کا سایہ (افسانے) 2014، (4) معاصر اردو افسانہ: تفہیم و تجزیہ (تنقید) 2018

پتہ: وڈی پورہ ہندوارہ، کشمیر 193221 (انڈیا)

موبائیل: 7006544358

ای میل: drreyaztawheedi777@yahoo.com

اُس کی بصارت مانوس روشنی کو صرف محسوس کرسکتی تھی۔ وہ اس روشنی کے اصل راز کو پانا چاہتا تھا‘ جس کے بارے میں کئی لوگ بے چین ہوتے آئے تھے کہ یہ کہاں سے پھوٹ پڑی ہے اور کہاں پر سیاہ پڑ جائیگی۔ اس نے فلسفہ اور سائنس میں یہ راز کھوجنے کی کوشش کی‘ لیکن وہاں پر صرف استدلال اور تجربے کا ہی چکرویو نظر آیا۔ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ اصلی راز ہے کیا...؟ یہ روشنی یا میرا وجود... میرا وجود یا میری روح...؟ کیونکہ ہر ذی روح کا احساس روشنی کو تو محسوس کرسکتا ہے‘ تاہم‘ اس راز کو محسوس کرنے کا اپنا ہی ایک خودکار نظام ہے جو حیات کے نقار خانے میں ہی سنائی دیتا ہے‘ لیکن صرف محسوس کیا جاسکتا ہے‘ چھوا نہیں جاسکتا۔ روشنی کے اس احساس کا بھی اپنا ایک انوکھا سفر رہا ہے۔ کبھی یہ نقار خانے کے پرندے کے لئے چند لمحات کا ہی ثابت ہوتا ہے‘ کبھی طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک محیط ہوتا ہے اور کبھی کسی بدنصیب پرندے کی آنکھوں کے لئے پوشیدہ ہی رہتا ہے‘ کیونکہ وہ محسوس کرنے کی حس سے عاری ہوتا ہے۔ اُس کی بصارت کا طویل سفر اب بصیرت کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ایک منزل ایسی بھی آئی جب بصارت کے آئینے میں بصیرت کے احساس کا عکس ابھرنے لگا۔ سیال

سوچ، ٹھوس احساس میں کروٹ لینے لگی۔ مشاہدات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے کا مجاہدہ شروع ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر شیئے کی پہچان متضاد سے ہی ہو سکتی ہے۔ سوچ نے اندھیرے میں جست لگائی تا کہ روشنی کی سیال کیفیت ٹھوس پیکر میں سامنے آئے۔ آئینے نے اس کے عکس کو مشاہدات کے عالم میں پہنچا دیا۔ وہ جب اندھیرے میں بھٹکنے لگا تو فکر کی شمع نے نور کی کرنیں بکھیر دیں۔ اس نے ہر طرف نظریں دوڑائیں.

ہر مقام پر تدبر کے پہاڑ نظر آئے۔ وہ بہت دیر تک تدبر کے پہاڑوں کو حیرانی سے تکتا رہا۔ مشاہدات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے قدم آگ والے گروہ کی جانب بڑھ گئے۔ آگ کے پہاڑ شعلے برسا رہے تھے. شعلوں کے اردگرد کئی عمر رسیدہ لوگ آنکھیں بند کر کے گیان کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے کافی دیر تک ادراک کی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ ایک میٹھی آواز سے دماغ جاگ اٹھا:

"منش کیا ڈھونڈ رہا ہے؟" ایک سفید بالوں والے گیانی کی آواز آئی.

"ایک راز کی تلاش۔" اس نے گیانی کے پُرسکون چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کونسا راز ابھی تک پوشیدہ ہے؟" گیانی کی آنکھیں بھی اس کے چہرے کو سوالیہ انداز سے تکنے لگیں.

"وہ راز جو خود تو روشن ہے لیکن اپنے روشن ہونے کا راز چھپائے بیٹھا ہے۔"

"اس کو پانے کے لئے من کی تپسیا کی ضرورت ہے۔"

"تپسیا کے لئے کون سی مشقت ضروری ہے؟"

"نفس کشی کی ریاضت."

"اس کا طریقہ کیا ہے؟"

"فریب کی پہچان."

"فریب کی پہچان کیا ہے؟"

"مایا جال سے مکتی۔"

"مکتی کا نشان کیا ہے؟"

"انا کی موت۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"احساس کی موت سے۔"

''احساس کی موت کے بعد راز کہاں کھلے گا؟''

''یہ تیرا دھوکہ ہے۔''

''نہیں یہی حقیقت ہے...!''

یہی حقیقت کہتے کہتے گیانی نے دوبارہ آنکھیں بند کردیں اور اپنے گیان میں کھو گیا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں گم سم بیٹھا رہا۔ اس کی سوچ پر من کی تپسیا' نفس کشی' فریب' مایا جال' مکتی' 'انا کا خاتمہ' اور 'احساس کی موت' جیسے وجودی گیان کی پہلیاں چھائی رہیں۔ وہ حقیقت کا احساس کر کے سوچنے لگا کہ وہ تو راز کی کھوج میں کسی اور راز کے جنگل میں پھنسے جا رہا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر دوسرے گروہ پر پڑی۔ فکر کا گھوڑا اس جانب بڑھنے لگا اور آنکھیں کاغذ قلم سنبھالے چہروں پر جم گیں۔ لکھنے والا ہاتھ لگاتار لکھ رہا تھا اور لکھنے والے کی زبان پر کیوں...؟' کب' کیسے....؟' ہاں اور نہیں کے منفی مثبت لفظوں کی گردان جاری تھی۔ وہ یہ دیکھ کر سامنے بیٹھے متفکر چہرے والے آدمی سے پوچھ بیٹھا:

''یہ کونسا عالم ہے؟''

مفکر کی سماعت سے جب یہ دلچسپ آواز ٹکرائی تو اس کی آنکھوں میں چمک سی عود آئی اور وہ منطقی انداز سے گویا ہوا۔

''یہ تفکرات کا عالم ہے۔''

''تفکرات کا عالم....؟'' وہ حیران ہو کر بول پڑا! ''یہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔''

''یہ عقل کے گھوڑے دوڑانے سے وجود میں آتا ہے۔'' بوڑھے فلسفی نے سر ہلاتے ہوئے کہا

''کیا یہ ہر راز کی کھوج لگا سکتا ہے؟''

''اس کا کام ہی کھوج لگانا ہے۔'' فلسفی قلم کو دوات میں ڈبوتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہیں کس راز کی تلاش ہے۔؟''

''مجھے سفید راز کی تلاش ہے؟''

''سفید راز کی تلاش؟'' فلسفی حیرانی سے پوچھ بیٹھا۔

''ہاں' مجھے روشنی کے راز کی تلاش ہے۔''

''اچھا' روشنی کے راز کی تلاش...!'' فلسفی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بول پڑا۔ ''یہ اصل کی نقل ہے۔''

''اصل کی نقل؟'' اُس کے منہ سے نکل پڑا! ''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''یہی سے ایک فلسفی اور عام آدمی کی عقل میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔''فلسفی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا۔''اصل نور ہے اور یہ روشنی اس کی نقل ہے۔''

''لیکن اس کا ظہور کیا ہے اور خاتمہ بھی ہے کہ نہیں؟

''یہ گردش کا سفر ہے جو مسلسل جاری رہتا ہے۔''

''پھر تو یہ اصل ہے نقل کہاں؟''

''بس اتنا ہی سمجھو جتنا عقل سمجھاتی ہے۔''

یہ فلسفیانہ مکالمہ ہونے کے بعد وہ تذبذب کے عالم سے یہ کہتے ہوئے نکل پڑا کہ یہ عالم بھی عقل کا ہی اسیر ہے۔اس لئے یہاں پر بھی شک اور یقین کی رسہ کشی ہی جاری ہے۔اس نے دوبارہ اپنی نظروں کو چہار جانب گھمایا۔کئی اور گروہ بھی عازم سفر نظر آئے لیکن اس کی نظریں سب سے آخری جماعت پر ٹھہر گیں. احساس کا پرندہ امید وبیم کی اڑان بھرتے ہوئے وہاں کی پُرسکون فضا میں پرواز کرنے لگا۔کچھ لوگ عبادت کرنے میں مشغول تھے اور باقی لوگ ایک نورانی چہرے والے بزرگ کے شگفتہ لفظوں کی تاثیر سے اپنے احساسات کو مہکا رہے تھے۔روحانی پیام عالم اکبر اور عالم اصغر کے خالق کی خوشبو سے فضا کو خوشگوار کر رہا تھا:

''اُس مالک دو جہاں کا نور ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ہر شئے میں اسی نور کا ظہور ہے۔اس دیدہ عالم کی روشنی نا دیدہ عالم میں تبدیل ہو جائے گی پھر نا تمام والا نور پھیل جائیگا۔یہاں کا زمانہ بھی نور ہے اسلئے زمانے سے محبت کرو کیونکہ زمانے کا خالق لازوال نور ہے۔''

روحانی پیغام نے مادی اوہام پر غلبہ پالیا۔بیقرار وجود میں قرار کی میٹھاس سما گئی۔شک ویقین کی رسہ کشی ختم ہوئی اور وہ آنکھیں بند کر کے اطمینان کی گہرائیوں میں کھو گیا' کیونکہ دل نے سفید نور کے ظہور کا راز پالیا تھا۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

سبین علی، دبئی

سمندر کے نام ایک غنائیہ

میرے اردگرد بے شمار لوگ ہیولوں کی مانند رواں ہیں۔ مگر ان کے سر نظروں سے اوجھل ہیں اور راہگزر پر ہر طرف اونچی ایڑی کے جوتوں پر ریشمی لبادے لہراتے نظر آتے ہیں۔ کسی جوتے کی ایڑی اتنی بلند ہے گویا قطب مینار ہو، کسی کی پیسا کے ٹاور جیسی جھکی کسی بھی پل گرنے کو تیار مگر انہیں پہننے والے پھر بھی ننگے پیروں کچے راستے پر چلنے کو تیار نہیں۔ کئی ایڑیاں ایفیل ٹاور کے روپہلے ماڈل جیسی مرصع ہیں اور کئی ایڑیاں سنگِ سرخ سے تراشیدہ مناروں جیسی بلند پر شکوہ اور مغرور نظر آتی ہیں۔ مصنوعی عطر سے معطر لبادوں میں حکمرانی کی رعونت ہے ادب وفن کی نمود ہے عقل وذہانت کی دمک ہے۔

میں حیران ہو کر اُن بلند چہروں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں مگر ننگے پاؤں ان رفعتوں تک جھانکنے سے قاصر فقط مرعوبیت سے اوپر تکتی ہوں۔ اسی دوران کسی نوکدار ایڑی کی چبھن پاؤں کی بالائی سطح پر محسوس ہوتی ہے۔

سی-----

منہ سے اک سسکاری نکلتی ہے۔

تم دیکھ کر نہیں چل سکتیں!

یہ راہگزر تمہارے لیے نہیں ہٹو-----

ننگے پاؤں چلوگی تو کانٹے ہی چبھیں گے۔

آپ نے درست کہا ہوگا مگر میرے پاؤں میں تو آپ کی ایڑی کی نوک چبھی ہے۔

پیچھے ہٹو

طریق---طریق-----

راستہ چھوڑ دو-----

Stand aside

No tresspassing

لاتعداد برساتوں سے سینچا رستہ قدموں تلے کروٹ لیتا ہے اور پاؤں کے تلوؤں میں دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔

خدایا! یہ کیا اضطراب ہے؟

دل کبھی انگلیوں کی پوروں تو کبھی قدموں میں کیوں دھڑکنے لگتا ہے۔ پوریں کپکپاتی نیلے برقی صفحے پر پھسلتی ہیں۔ جھیلوں میں پرندوں کی ڈار کی مانند حروف اترنے لگتے ہیں۔

رستہ پھر کروٹ بدلتا ہے ارد گرد مناظر تبدیل ہوتے ہیں۔ دل پاؤں میں اتر آتا ہے میں گھٹنوں کے بل کچے رستے پر جھک جاتی ہوں۔

نوکدار ایڑی سے فگار راہگزر کے چھلنی سینے سے زمین کی دھڑکن سنائی دینے لگتی ہے اور پاؤں کے تلوؤں سے نیم خنک مٹی ہم کلام ہوتی ہے۔

ایک چھوٹے سے کھڈے میں بارش کا پانی بھرا پڑا ہے جو چھوٹے سے تالاب کا منظر پیش کرتا نیلے آسماں کا عکس دکھا رہا ہے۔ چند ننھے مینڈک پھدکتے ہوئے پانی سے باہر نکلتے ہیں، چند ثانیوں بعد پانی میں ارتعاش تھم جاتا ہے اور اس کے عکس میں درختوں کے لمبے سائے لہراتے ہیں۔ شام کے وقت اندھیرا زرد کرنوں کا پیچھا کرتے زینہ زینہ زمین پر اترنے لگتا ہے۔ ستاروں کے وہ سارے طاق جہاں اونچی ایڑی والے لوگ پہنچنے کی تگ و دو میں تھے اپنے عکس کے ساتھ زمین پر اتر آتے ہیں۔ سمندر میں رواں بادبانی کشتیوں کی مانند پیلا پتا سطح آب پر تیرتا ہے۔ روشن دائروں کے مرکز میں ساکن قطبی تارہ جھک کر بیک وقت بحر الکاہل میں ڈولتی کشتی اور بارش کے پانی میں تیرتے پتے کو سمت کا اشارہ کرتا ہے۔

دور پرے راہگزر کے کناروں پر اونچی ایڑیوں کا ہجوم بھاگتا گردنیں پھلانگتا اپنے مقرر کردہ راستے پر محو سفر ہے۔ اتنے میں بے خانماں لوگوں، خانہ بدوش سیار چوں فگار انگلیوں والے انسانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ پرلی جانب ایک متروک راہگزر پر رواں دکھائی دیتا ہے۔

فن کیا ہے؟ تخلیقیت کہاں سے جنم لیتی ہے؟ یہ لوگ کس سمت میں رواں ہیں کیا مجھے ان کے پیچھے چلنا ہے یا ادھر ٹھہر کر نم مٹی سے مصاحبت اختیار کروں؟

میں تالاب کی طرف دیکھتی خود کلامی کرتی ہوں۔ چھوٹے سے تالاب کے پانی میں چاند کا عکس مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے اور کہنے لگتا ہے!

کیا، کہاں اور کدھر کی تلاش سے قبل تخلیق کے ابدی سمندر کی کچھ کہانیاں سنو گی!

ہاں کیوں نہیں۔

تو سنو!

پرانے دنوں کی بات ہے انسانی آبادیوں سے بہت دور ایک ویران ساحل پر بادشاہِ وقت نے پرانے قلعے کو عقوبت خانے کی شکل دے رکھی تھی۔ وہاں رات کو سمندر میں جوار بھاٹے اٹھتے اور مدوجزر سے موجیں اتنی بلند ہو جاتیں کہ دور دراز سے آکر کوئی کشتی لنگر انداز ہونے کی ہمت نہ کرتی۔ ساحلی پہاڑی کے پتھر مدتوں سے اُن مشاق ہاتھوں کے منتظر تھے جو انہیں تراش کر دیدبان کی تعمیر میں صرف کر دیں تاکہ اجنبی زمینوں کی جانب سے آتی ہواؤں کی مانند وہاں بھولی بھٹکی کشتیاں بھی آکر اپنے لنگر ڈال سکیں اور انسانی آوازوں کا ارتعاش بھی سمندر کی لہروں کے شور میں ساحلوں پر سنائی دینے لگے۔

مگر ہوا یہ کہ وہاں کے پتھروں کو بلند و بالا فصیلوں اور غلام گردشوں کی تعمیر میں استعمال کر لیا گیا۔ دور دیس سے اُس گھاٹ پر کشتیاں بھی آئیں مگر ان میں مسافروں کی بجائے قیدی لدے ہوئے تھے جنہیں پرانے قلعے کی آہنی زنجیروں میں مقید کر دیا گیا۔ ان قیدیوں کے کان سنگی دیواروں کے پار سے آتی سمندر کی مہک سونگھ سکتے تھے، پتھروں سے الجھتی موجوں کا شور سن سکتے تھے مگر سمندر کو دیکھ نہ پاتے۔ ایسے میں کئی برس بیت گئے روشنی تازہ ہوا اور فطرت کے ہر نظارے سے محروم قیدیوں کا احوال کسی کو معلوم نہ تھا۔ ایک رات سمندر میں مہیب طوفان اٹھا۔ سرکش موجیں قلعے کی فصیلوں سے سر پٹکنے لگیں۔ سپاہیوں نے آہنی جنگلوں پر پڑی ترپالیں ہٹا دیں کسی فرار کا اندیشہ نہ تھا۔ اس طوفان میں جو بھاگنے کی کوشش کرتا موجوں کا شکار ہو جاتا یا سنگلاخ چٹانوں پر طوفانی ہواؤں کے زور سے پٹخیاں کھاتا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ حفاظتی جنگلوں اور روشن دانوں سے ترپالیں اٹھانے کے بعد سمندر کی طوفانی موجوں اور قیدیوں کے بیچ کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ چار دن بعد پانی اترا اور قلعے کے معمولات لوٹ آئے۔ مگر سمندر سے اتصال کے بعد قیدیوں کے اندر بہت کچھ بدل چکا تھا۔ ان قیدیوں نے کچھ ہی دنوں بعد اپنی پھٹی قمیضوں، ترپال کے چیتھڑوں کاغذ اور گتے کے ٹکڑوں پر فن پارے تخلیق کرنا شروع کر دیے۔ مصوری کے نمونوں اور مجسموں کی شکل میں ان کے تخیل

ISSN No. : 2395-2016

کے دریچے وا ہونے لگے۔ گہرے نیلے پانیوں میں ڈوبے جزیروں کے عکس، آزادی کے سفر کا استعارہ بنی بادبانی کشتیوں کے نمونے، آہنی سلاخوں کے عقب سے پھوٹتے ہوئے سبزہ وگل، بانس کی شاخوں سے بنی لاتعداد دوربینیں جو چاند کو حسرت سے تکتی تھیں۔ اذیت اور تکلیف میں ڈوبی لہروں کے رنگ، کارنس پر دھری جامد گھڑی اور خوبصورت ساحلوں پر چہل قدمی کرتے جوڑے ہر تصویر گویا ایک روزن تھا جس کے واسطے سے فن اور فنکار کی روح میں جھانکا جا سکتا تھا۔

فن جو درد کی کوکھ سے پھوٹا، محرومی کرب اور شدت احساس کی مٹی سے نمو پایا۔ آفاقی سمندر نے اس کے در پر دستک دی فطرت خود اس کی اتالیق بنتی اور وہ فن پارے وجود میں آئے جو اونچی ایڑی والے تربیت یافتہ فنکار بھی تخلیق نہ کر سکے۔

ننھے سے تالاب میں بہتا پیلا پتا کنارے آن لگا۔ بگولے نے نرمی سے اسے پانی سے باہر نکالا اور ہوا کے رخ پر اچھال دیا۔ وہ اڑا، اٹکا پھر اڑا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

چاند اپنا سفر جاری رکھے افق کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ میں محویت کے عالم میں سر اٹھا کر بدلیوں کے پیچ تکتی ہوں۔ رات کا ایک پہر بیت چکا ہے، ہوا میں خنکی بڑھنے لگی ہے۔ عکس میں چمکتا چاند پھر گویا ہوتا ہے۔

ایک دور دراز ساحل پر کشتیوں میں گانے والے مچھیروں کی بستیاں تھی۔ ان ساحلوں اور مچھیروں کی بستیوں سے بھی بہت دور وادیوں میں چرواہے اپنے جانور چراتے تھے۔ ایک بوڑھا معذور چرواہا اپنے نو عمر بیٹے کے ساتھ سبزے سے گھری کٹیا میں رہتا تھا۔ وہاں دن کو بادِ شمال کے ساتھ تتلیاں رقص کرتیں، بیل گائیں اور گھوڑے جامنی پھولوں سے بھری گھاس چرتے اور رات کو کہکشاؤں کے سنگ جگنو چمکتے۔ وہاں بحرِ عمیق سے اٹدتے بادل لہروں کی صورت میں تیرتے ہوئے آتے اور فلک بوس پہاڑوں سے ٹکرا کر روز بارش برساتے۔ جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگتا تو لڑکا اپنے جانوروں کو ہنکاتے ہوا باڑے میں لے آتا۔ دودھ دوہتا آگ دہکاتا اور اپنی بانسری لے کر بیٹھ جاتا۔ بوڑھا باپ اپنی مڑی تڑی انگلیوں سے کاغذ پر دوہرے اور گیت لکھتا۔ اس کے دوہرے، گیت اور نظمیں خانہ بدوش ہواؤں کی مانند سفر کرتیں اُن چراہ گاہوں سے نچلی وادیوں، قریوں اور مچھیروں کی بستیوں تک جا پہنچیں۔ مچھیرے جب گہرے پانیوں میں مہینہ مہینہ بھر شکار پر رہتے تو ہچکولے کھاتی کشتیوں میں تھکن اتارنے کو اُس بوڑھے کے گیت گاتے۔ اور میں فلک کا مسافر ہر رات اُس چرواہے کو بھی دیکھتا اور بڑے شہروں میں فن پاروں کی نمائشوں اور عالی

شان تقریبات کا احوال بھی جانتا۔

ایک دن جب اس بوڑھے چرواہے کو شہر سے آئے قدر دان وہیل چیئر پر بٹھا کر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لیجا رہے تھے تو اُسی رات قیدیوں کے بنے فن پارے بادشاہ کے ہرکاروں کے ہاتھ لگے جنہیں دنیا کے عظیم ثقافتی مرکز میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ عرصہ وہ فن پارے فقط خاص عمائدین اور اساتذہ فن کے سامنے پیش کیے جاتے رہے۔ پھر ایک دن اُن لوگوں نے طے کیا کہ ان فن پاروں کو عوامی نمائش کے لیے پیش کیا جائے گا۔

جب یہ مجسمے اور مصوری کے نمونے دنیا کی نظر میں آئے تو خوفناک مجرم قرار گئے قیدیوں کی روح کی معصومیت اور خوبصورتی دنیا کی نظروں میں آنے لگی۔ درد اور محرومی سے سینچا گیا ہر فن پارہ تخلیقی اپچ میں بڑے شاہکاروں کو مات دیتا دکھائی دینے لگا تو اونچی ایڑی والوں نے غیض وغضب سے اپنی انگلیاں چبانا شروع کر دیں۔ اُن کے احتجاج کی وجہ سے نمائش موقوف کر دی گئی مگر اُس وقت تک ان کی شہرت دنیا میں پھیل چکی تھی۔

ان فن پاروں کا کیا ہوگا؟ میں تجسس سے استفسار کرتی ہوں۔

ابھی ایک مدت تک انہیں چھپا کر رکھا جائے گا۔ جب وقت اپنی چال بدلے گا تو یہی فن پارے کسی عالی شان عجائب گھر کی زینت بنیں گے اور کوئی قیمتی لبادے والا اکشن ہاؤس میں ان فن پاروں کی بولی میں اپنی شناخت پوشیدہ رکھ کر حصہ لے گا۔ وہ قلعہ اور ساحل سیاحوں کے لیے کھولا جائے گا۔ اور اس چراہ گاہ میں جہاں بوڑھا چرواہا گیت لکھتا تھا۔ جہاں جگنو چمکتے اور تتلیاں رقص کرتی تھیں وہاں سیر گاہیں بنیں گی۔

اتنے میں دیکھتی ہوں کہ اونچی ایڑیوں کا ہجوم پھر سے اسی راہگزر پر ایک دوسرے کی گردنیں پھلانگتا روندتا چلا آ رہا ہے۔ میں اُٹھ کر اس راستے کو بغور دیکھتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مدار نما دائروی راستہ ہے۔ پھر آنکھیں پھاڑے اس چھوٹے سے قافلے کو تلاش کرنا چاہتی ہوں جو متروک راہگزر پر رواں تھا مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور راستے پر فقط پیروں کے نشان باقی ہیں۔

مجھے کس راہگزر پر جانا تھا؟

چاند مسکراتا ہے

جس راہ پر تم چاہو

ISSN No. : 2395-2016

ڈاکٹر شہناز فاطمی
۴۰۱ر شری گنیش اپارٹمنٹ، ایسٹ بورنگ روڈ، پٹنہ

المیہ

دروازہ کو زور سے دھکا لگنے کی آواز پر شاہدہ اپنے کمرے سے نکل پڑی۔ دیکھا تو

وہی روز کی

''چی یوں............''

نجمہ کا اکلوتا بیٹا ماں سے پیسوں کے لئے لڑکر، اس کے ہاتھ سے کچھ روپئے جھٹکتے ہوئے دروازہ کو زور سے دھکا لگاتے یہ کہتے ہوئے نکل رہا تھا۔

''باپ کے پیسوں پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا''۔

نجمہ نے شاہدہ کو دیکھا اور دوڑ کر اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ شاہدہ کیا کرتی۔ یہ تو اس گھر کا جیسے روز کا معمول ہو گیا تھا۔

شاکر نجمہ کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہی نہیں وہ بڑی ہی منت اور مرادوں والا بھی تھا۔ اسی لئے دونوں میاں بیوی نے اس کی پرورش بھی بڑے جتن سے کی تھی۔ اس کی ذرا سی چھینک پر ہی دونوں بے چین ہو اٹھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی دیکھ بھال میں وہ آہستہ آہستہ بربادی کی طرف قدم بڑھانے لگا تھا۔ اور ان دونوں کو اس کی محبت میں اس کی گستاخیاں کبھی نظر نہیں آئیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ جب اس نے اپنی خالہ (شاہدہ) سے بدزبانی کی اور خالہ نے اس کو ڈانٹا تھا تب نجمہ نے اپنی بہن سے ہی بات بند کر دی تھی۔ اس کے بعد سے ہی شاہدہ نے شاکر کو کچھ کہنا ایکدم چھوڑ دیا تھا۔

مولوی رحیم خاں کو اولاد کے نام پر دو بیٹیاں ہی تھیں اور جائیداد کے نام پر بس ایک مکان جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی شادی اپنی بہن اور بھائی کے بیٹوں سے اس شرط کے ساتھ کر دی تھی کہ شادی کے بعد دونوں ہی ان کے ساتھ رہیں گے۔ اس میں ان کی مصلحت تھی کہ اس طرح ان کا بڑھاپا آسانی سے کٹ جائے گا۔ ان کی نہ صرف لڑکیاں بلکہ داماد بھی بہت جلد کے تھے اور انہوں نے جو خواب دیکھے تھے کہ بڑھاپا آسانی سے کٹ جائے گا وہ بہت ہی خیر خوبی سے پورا ہوا۔

شاہدہ بڑی بیٹی تھی اور اس کی خود کی بھی دو بیٹیاں ہی تھیں جن کی شادی اس نے چھوٹی عمر میں ہی کر دی تھی۔

وہ دونوں دوشہروں میں اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتی تھیں۔ شاہدہ کی چھوٹی بہن نجمہ کو شادی کے 7 برسوں کے بعد ایک بیٹا ہوا تھا جس پر پورا کنبہ ہی دل و جان سے فدا تھا۔ شاہدہ کے شوہر بھی اپنی اکلوتی سالی کے بیٹے کو بہت مانتے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی جس کی آمدنی سے دو انسانوں کا گذرا اچھی طرح ہو جاتا تھا۔ نجمہ کے شوہر وہیں کے ایک سرکاری مڈل اسکول میں اردو پڑھانے کا کام کرتے تھے۔ اور ان کی آمدنی بھی تین لوگوں کے لیئے کافی تھی۔ سبھی کی زندگی بظاہر بڑی ہی پرسکون تھی اور ان چاروں کی خوشیاں شاہد کے اردگرد ہی گھوما کرتی تھیں۔

مگر یہ بھی سہی ہے کہ میٹھا اسی وقت تک اچھا ہے جب تک وہ بیماری میں نہ بدل جائے۔ اس بات کا احساس ان میں سے کسی کو بھی اس وقت نہیں ہوا جب پہلی بار اسکول سے شاکر کی شکایت آئی۔ تب بھی نہیں ہوا جب وہ دوبار اپنی کلاس میں فیل ہوا۔ اس بات کا احساس شاکر کے ابو کو اس وقت ہوا جب اس کے ابو ایک دن اسکول میں بخار آجانے کی وجہ سے گھر لوٹ رہے تھے اور انہوں نے شاکر کو محلّہ کے ایک برے لڑکے کے ساتھ دیکھا وہ دھک سے رہ گیئے۔

''ارے'' اس وقت تو اسے اسکول میں رہنا چاہئے تھا۔ یہ یہاں ظفر کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ انہوں نے سوچا اور گھر کی طرف بڑی ہی تیزی سے قدم بڑھا دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شاکر انہیں دیکھے۔ وہ جلد سے جلد گھر جا کر حالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ گھر آنے پر نجمہ کی جگہ شاہدہ نے مورچہ سنبھالا۔ اس نے شاکر کی آوارگی اور اسکول تک کرنے کی ساری داستان ان سے بیان کر دی۔ نجمہ اپنے خاوند کے غصہ کی وجہ سے دروازہ پر ہی کھڑی تھی۔ یہ سب باتیں سننے کے بعد نجمہ کے خاوند سے کوئی جواب دیتے نہیں بن پڑا اور وہ پاس ہی رکھی چارپائی پر لیٹ گیئے۔ اور کچھ ایسا لیٹے کہ پھر اٹھ ہی نہیں سکے۔

ان کی موت کے بعد دونوں بہنوں نے شاکر کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ شاکر بڑی ہی خاموشی سے سر جھکا کر ان کی باتیں سنتا رہتا۔ کہتا کچھ بھی نہیں۔ بس یہی سوچتا کہ باپ کا پنشن ان دونوں کے لیئے کافی ہے۔ زندگی کسی طرح لڑکھڑا کر آگے بڑھنے لگی۔ کیوں کہ وقت رک جائے یا روک دیا جائے۔ ایسا کچھ بھی ابھی تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ شاکر نے اب اسکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی گھر میں کھاتا کبھی ماں سے لڑ، جھگڑا کر روپیہ لے کر باہر ہی کھاتا۔ اس کا ماننا تھا کہ باپ کے پنشن پر اس کا بھی حق ہے۔ وہ ماں کو کہتا اور باہر چلا جاتا پھر رات گیئے تک باہر ہی رہتا۔ نجمہ اپنا سر پیٹ کر رہ جاتی۔ وہ کرتی بھی تو کیا۔

''میرے بعد اس کا کیا ہوگا؟

''کیا ہونا ہے، میں پہلے بھی کہتی تھی مگر تم ہمیشہ بیٹے کی صورت پر ہی فدا رہی تھیں۔

''اب بھی کوئی راستہ بتاؤنا۔ ورنہ میرے بعد اس کا کیا ہوگا۔ یہ پنشن میری ہی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد کیا بھیک مانگے گا'' وہ رو پڑی۔

''بات سنے گا تب ہی نا کچھ کہہ سکوں گی'' شاہدہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ کچھ دن اور اسی طرح سے گزر گیئے۔

ISSN No. : 2395-2016

اب آہستہ آہستہ محلہ کے لوگ بھی شاکر کی شکایتیں لے کر آنے لگے تھے۔ اور آج تو اس نے ماں کو بھی روپیوں کے لئے ایسا دھکا لگایا کہ وہ گر پڑی اور جو چوٹ لگی وہ اس کے جسم پر نہیں بلکہ سیدھے اس کے دل پر لگی تھی جس نے اسے پھر بستر سے اٹھنے نہیں دیا۔

اس کی موت کے بعد شاکر گھر سے باہر گیا اور کچھ لوگوں سے ماں کی لاش کی آخری رسومات کے لئے چندہ اکٹھا کر لایا۔ مگر جب تک وہ چندہ لے کر لوٹا ماں کی لاش دفنائی جا چکی تھی۔ تب وہ مٹھی میں دیے ان روپیوں کو لے کر نکڑ والی دارو کی دکان میں گھس گیا۔ دو چار دنوں تک مانگے گئے انہیں پیسوں سے اس نے عیش کیا۔ اس بیچ خالہ اور خالو نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ گھر کے برتن اور ہاتھ آئے پیسے بھی ختم ہو گئے۔ تب وہ پاس کے ایک محلہ کے گھر کے گیٹ پر کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' وہاں کی مالکن نے پوچھا۔

''میم صاحبہ میری ماں مر گئی ہے۔ اور میرے پاس ابھی اس کے کفن دفن کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر آپ میری کچھ مدد کر دیں تو میں جلد ہی لوٹا دوں گا۔ اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں پوچھیں اس کی شکل صورت ایسی تھی کہ اس عورت کا دل پسیج گیا۔ اور وہ اندر گئی اور وہاں سے سو سو کا دو نوٹ لے کر آئی۔

''اتنے سے ہو جائے گا؟

''جی میم صاحبہ میں جلد ہی لوٹا دوں گا''

''نہیں کوئی بات نہیں'' عورت نے کہا اور اسے دلاسہ دیا۔

دو سو روپیہ کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔ جلد ہی وہ ختم ہو گیا۔ اور شاکر پھر ایک گیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح اس نے کئی مہینے نکال دیے۔ اور سوچا

''اماں آپ لوگ کتنے مُرکھ تھے جو اتنی تکلیف اٹھاتے تھے۔ مجھے دیکھو میں بھی زندگی کاٹ رہا ہوں نا۔ وہ خوب سنا اور دوسرے دن کے لئے جس مکان کو دیکھ رکھا تھا وہاں پہنچ گیا۔ پیسہ ختم ہو گیا تھا اور دارو کوئی ادھار دینے والا نہیں تھا۔ آج وہ جس گیٹ پر تھا وہاں اس کی مالکن کے ساتھ اس کی ایک دوست بھی تھی اور یہ وہی عورت تھی جس سے شاکر نے پہلے دن روپئے مانگے تھے۔

''ارے اسے تو میں پہچانتی ہوں مجھ سے بھی اس نے روپئے لئے تھے''

تب اس مکان کی مالکن نے مالکن کو بلا کر گیٹ بند کرنے کو کہا اور لڑکے کو ان کے پاس لانے کو کہا۔ شاکر کو خواب میں بھی یہ گمان نہیں تھا کہ وہاں کیا ہونے والا ہے۔ وہ اندر گیا اور جب ان لوگوں نے سوالوں کی جھڑی لگا دی تب اس نے کہا۔

''میم صاحبہ، میری ماں نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ جب بھوک ستانے لگے تو اپنی ماں کو کفنا دینا''۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

حسن رہبر

لو جہاد

☆ نام: محمد ابرار الحسن، قلمی نام: حسن رہبر، ولادت: ۱۴؍ مارچ ۱۹۴۲ء، پتہ: اشرف بلڈنگ، حسین آباد، بھاگلپور۔ ۸۱۲۰۰۵ (بہار)، تصنیفات و تالیفات: (۱) ایک پل کا فاصلہ (افسانوی مجموعہ۔ ۱۹۸۹ء (۲) چسکا (افسانوی مجموعہ ۲۰۱۲ء) (۳) ہر بوند سمندر (افسانوی مجموعہ۔ ۲۰۱۵ء) (۴) آگے راستہ بند ہے (افسانوی مجموعہ۔ ۲۰۱۶ء) (۵) بند مٹھی کا سچ (غزلوں کا مجموعہ۔ زیر ترتیب)

پچھلے کچھ دنوں سے شہر کے بعض علاقوں میں خوبصورت نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ایک ٹولی سازشوں کے نت نئے جال بچھانے میں سرگرم عمل تھی۔

مگر میرا اس سے کیا واسطہ۔؟ مجھے تو ساریکا کی ذات پر بھروسہ تھا کہ کبھی وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جس سے میری ساکھ کو نقصان پہنچے۔

ساریکا کے ساتھ میری دوستی برسوں پرانی تھی۔ یہ تو موبائل فون کی محض ایک بھول تھی جو ہماری دوستی کا سبب بن گئی اور ہم پیار کی انجان راہوں پر چل پڑے۔

پھر باتوں کا سلسلہ چلا تو گفتگو طویل ہوتی چلی گئی۔ انٹرنٹ پر تصویروں کے تبادلے بھی ہوئے اور فیس بک نے بھی زندگی کے اتنے پٹ کھول دئے کہ ہم ایک دوسرے کے اور بھی قریب آگئے۔

میرا انجینئرنگ کا آخری سال تھا اور کمپس سلکشن میں میری نوکری پکی ہو چکی تھی۔ ساریکا بھی اونچے گھرانے کی ایک بے حد پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی تھی۔

پیار کرنے والے کبھی ذات پات کی بندشوں کو نہیں مانتے اور ساریکا کا پیار تو ان حد بندیوں کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کو بے قرار ہو گئی اور ایک دن اس نے چپکے سے مجھے قریب کے ایک پارک میں بلا لیا۔ ہم بے حد خوشگوار ماحول میں ایک دوسرے سے ملے اور پارک کے کینٹن میں بیٹھ کر جی بھر کی باتیں کیں۔ پسند کے ناشتے کئے اور پھر ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھا کر مستقبل کے خواب بننے لگے۔

پھر تو ملنے ملانے کا کوئی بھی موقع ہم نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

ISSN No. : 2395-2016

لیکن اس روز جب ہم اگلی شام ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہونے لگے تو اس نے بے اختیار میری چھاتی پر اپنا سر رکھ کر کہا۔

’’میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتی ارسلان۔ بولو تم کیا کہتے ہو۔؟‘‘

’’تم نے کبھی سوچا ہے ساریکا کہ ہماری منزل کے راستے بہت کٹھن ہیں! میں نے اسے سمجھایا۔

’’تم زمانے کی پرواہ مت کرو۔ میں سب سنبھال لونگی۔!‘‘

اس کی ضد کے آگے میں ہار گیا اور اس کی بات مان لی اور دوسرے ہی دن نہایت خاموشی کے ساتھ ہم عدالت جا پہنچے اور کورٹ میرج کر لی۔

لیکن جیسے ہی ہم عدالت سے باہر آئے۔ ایک ہی رنگ کی ماتھے پر پٹیاں باندھے نوجوانوں کی ایک بھیڑ نے ہمیں گھیر لیا اور مجھ سے کچھ پوچھے بغیر مجھ پر تھپڑ گھونسے اور ڈنڈے برسانے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ساریکا کی چیخ پکار بھی مجھے اس عذاب سے نہیں بچا سکی اور جب میں ادھ موا ہو کر گر پڑا تو مجھے مردہ سمجھ کر سبھوں نے راہِ فرار اختیار کر لی۔

پھر پولس آئی۔ مجھے اسپتال پہنچایا۔ میری حالت نازک تھی اور معاملہ لو جہاد کا تھا۔ پولس کے کئی جوان میرے ہوش میں آنے کے انتظار میں پاس ہی کھڑے میری نگرانی کرتے رہے۔

معاملہ دو فرقوں کا تھا۔ بات پھیلتے دیر نہیں لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔

پولس چست اور مستعد تھی۔ انتظامیہ کے سخت رویے نے کسی کو سماج میں بدامنی پھیلانے کا موقع نہیں دیا اور حالات جلد ہی معمول پر آ گئے۔

میں ایمرجنسی وارڈ کے ایک بڈ پر پڑا آخری سانسیں لے رہا ہوں اور مجھے لگ رہا ہے جیسے سر سے کفن باندھے میں اپنی موت کا بدلہ لینے گھر سے نکل پڑا ہوں۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

اویناش امن

عقرب

نام :اویناش امن، تعلیم :ایم اے (عربی)، ایم اے (اردو)، پی ایچ ڈی (عربی) تصانیف :
'ابرِرواں' (شعری مجموعہ)، 'ٹیوشن کے جھمیلے (انشائیہ)، 'خوشبو سرحدوں کے پار' (ناول کا ترجمہ)،
'مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات از پروفیسر وہاب اشرفی کا ہندی ترجمہ' پتہ : شیو چندر پتھ-۲، کالی
مندر روڈ، ہنومان نگر، پٹنہ-۲۰ فون : 7870678786, 9934090588
ایوارڈ : بہار اردو اکیڈمی سے 'مجموعی خدمات ایوارڈ'، کتابوں پہ انعام علاوہ دیگر انعام واعزازات

وہ جب پیدا ہوا تو بالکل اپنے بھائی بہنوں جیسا ہی نظر آتا تھا۔ انہیں کی طرح سرخی مائل بادامی رنگ، آٹھ پیر جن میں سے دو شکنجوں کی شکل میں آگے کی جانب مڑے ہوئے، چوڑی تہہ دار، آگے جا کر خطرے اعلان کرتی ہوئی ہک کی طرح مڑی ہوئی، اوپر کی طرف اٹھی دُم میں ضم ہوتی پیٹھ۔ اس کی پیدائش پر بھی اس کے دوسرے بھائی بہنوں کی طرح ہی عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، اجس میں اپنی نسل کا ایک عمدہ چوہا ڈھونڈ کر لایا گیا تھا اور اس کا گوشت پورے جھنڈ نے اچھال اچھال کر کھایا تھا۔ یہ سب ہوتا بھی کیوں نہیں، آخر تھا بھی تو وہ جھنڈ کے سردار کا بیٹا۔ پیدائش کے وقت سے ہی وہ اپنے بھائی بہنوں سے زیادہ تندرست وتوانا نظر آتا تھا، جس کی وجہ سے جھنڈ میں چہ میگوئیاں ہوتیں۔

''دیکھو تو سردار کا بیٹا کتنا شاندار ہے۔ کس تیزی سے اس پتھر سے اس پتھر اور اس درخت سے اس درخت پر اچھال مارتا ہے۔ اسے ہی جھنڈ کا اگلا سردار بنانا چاہئے۔''

وہ روز بروز نکھرتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی برق رفتاری، اچھل کود، جسامت دیکھ کر اب سردار کو بھی لگنے لگا تھا کہ اس میں اگلا سردار بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں لیکن......اس کا سب سے بڑا امتحان ابھی باقی تھا۔

ایک دن سردار نے اعلان کیا۔ آج رات ہم اسے شکار پر لے جائیں گے۔

سردار کے بیٹے کو شکار کرنے کی کیا ضرورت؟

جھنڈ میں کانا پھوسی شروع ہوگئی جو سردار کی تجربہ کار سماعت سے بچ نہ سکی۔

''ضرورت ہے! اگر آگے چل کر جھنڈ کی قیادت کرنی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی کفالت کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ دشمنوں سے جھنڈ کو بچانے کے داؤ پیچ سیکھنے ہوں گے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے شکار کی تربیت دی جائے۔'' سب نے سردار کی بات سے پر اتفاق کیا۔

ISSN No. : 2395-2016

پھر جب رات نے اپنی سیاہ چادر جنگل کے پیڑوں پر ٹانگ دی اور پتوں کے درمیان سرسراہٹ بڑھنے لگی تو بچھوؤں کا یہ جھنڈ سردار کی قیادت میں شکار کے لیے نکلا۔ سبھی جنگل کے وسط میں ایک سپاٹ جگہ پر جمع ہوگئے اور سردار ایک پتھر پر چڑھ کر کھڑا ہوگیا اور ہدایت دی۔

''سبھی ارد گرد مخفی طور پر رہیں گے اور پہلا وار میرا بیٹا کرے گا۔''

سبھی اس تاریک شب میں جھینگروں اور اُلوؤں کی رہ رہ کر آتی آوازوں کے درمیان دم سادھ کر شکار کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گھبرایا سا چوہا باہر نکلا جو معلوم نہیں ان تاریکیوں میں کس شئے کا متلاشی تھا۔ اسے دیکھتے ہی سردار چلایا۔ ''بیٹے، جھپٹو اس پر۔''

پھر برق رفتاری سے وہ اس پر کود پڑا اور اپنی شکنجے جیسی ٹانگیں اس کی گردن کے گرد پھنسا دی۔

''شاباش! اب اپنی دم کا ڈنک اس کے جسم میں پیوست کردو فوراً۔''

اس نے اپنی خطرے کا اعلان کرتے ہوئی دم کو چوہے کے جسم میں گھسیڑ دیا لیکن چوہے پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ اس نے پھر اپنی دم اٹھائی اور دوبارہ وار کیا مگر بے سود! پھر اس نے تابڑ توڑ کئی وار کئے ۔حتیٰ کہ چوہا اس کی پکڑ سے آزاد ہوکر بھاگ نکلا اور تاریکیوں میں کہیں گم ہوگیا۔

یہ کیا ہوا؟ اس کا جوان ڈنک بے اثر؟

سردار فوراً پتھر سے نیچے کودا۔ پتوں کے درمیان چھن چھن کر آتی ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے اس کی دم اٹھا کر دیکھا۔

''نہیں......اس کے تو ڈنک ہی نہیں ہے۔''

بچھوؤں کے جھنڈ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ساری خوشیاں ایک پل میں کافور ہوگئیں۔ سردار نے سر جھکا لیا اور پلٹ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پورا جھنڈ اپنے ٹھکانے پر واپس لوٹ گیا جو کہ ایک پرانے درخت کی کھوڈر میں تھا۔ کسی نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کرنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ بھی آرہا ہے یا نہیں۔

اس رات بچھوؤں کے جھنڈ نے کوئی شکار نہیں کیا۔ بغیر ڈنک کے بچھو! بچے تو بچے بڑے بزرگوں نے بھی ایسا نہ تو سنا تھا اور نہ دیکھا تھا۔ سبھی منتظر تھے کہ معلوم نہیں سردار اب کیا کرے گا؟ سردار نے تھکے تھکے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''آپ سمجھ ہی رہے ہوں گے کہ یہ سب میرے لیے آسان نہیں لیکن مجھے اپنی اولاد سے زیادہ فکر اس عظیم بچھو روایت کی ہے جسے آج میرے بیٹے نے داغدار کردیا، اور اس سے بھی زیادہ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ جب دنیا کو یہ پتہ چلے گا کہ بغیر ڈنک کے بھی بچھو ہوتا ہے تو ہمارا جو خوف اور دہشت صدیوں سے جانداروں پر قائم ہے وہ ایک ہی پل میں ختم ہوجائے گا۔ اس لیے میرا فیصلہ ہے کہ اسے ختم کردیا جائے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

یہ کہہ کر سردار پیچھے مڑ گیا اور سبھی اس پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ تو بچپن سے ہی برق رفتاری سے اس پتھر سے اس پتھر اور اس درخت سے اس درخت پر اچھال مارتا تھا۔ وہ فوراً کھوڈر سے نکل بھاگا اور سارے بچھوا سے پکڑنے کے لیے دوڑے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ جنگل کی تاریکیوں کے درمیان بھاگتے ہوئے ایک گہرے سوراخ میں جا گرا۔ جس کی سطح کا دور دور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اس اندھے کنوئیں میں گرتا گیا گرتا گیا......

وہ جب پیدا ہوا تھا تو اپنے بھائی بہنوں جیسا ہی دکھتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں دو تبدیلیاں بہت تیزی سے نمایاں ہوئیں۔ اول تو اس کا پیٹ غیر معمولی طور پر بڑا ہو گیا اور دوسرا یہ کہ وہ منہ بند کرنے سے قاصر ہو گیا۔ حالت یہ تھی کہ اب وہ کسی صورت نہ تو شکم سیر ہوتا تھا اور نہ ہی اس کا منہ کسی بھی حال میں بند ہو پاتا تھا۔ آج وہ دفتر میں اپنے ماتحتوں پر برس رہا تھا۔

کیا کرتے ایک کام تم لوگوں سے نہیں ہوتا، کہہ کر اس نے اپنا ڈبہ کھولا اور اس میں سے ایک پان نکال کر منہ میں دبا لیا۔ جیسا وہ اپنے کھلے منہ کی سبکی مٹانے کے لیے اکثر کرتا تھا۔

''کیا کریں سر؟ پانچ سال پرانا کیس ہے۔ اب اتنی جلدی تھوڑے ہی ملنے والی ہے، اس کی فائل اس جنجال میں!''

''کھی کھی کھی......'' اس نے اپنی بتیسی نپوڑی جس کا بیشتر حصہ پان کی وجہ سے کہیں لال کہیں کالا پڑ گیا تھا۔

ٹھیک کہتے ہو منڈل مگر بڈھا سمجھے تب تو۔ خود تو کان میں تیل ڈال کر سو گیا اور یہاں ہم کرتے رہیں اس کی فائل کی رکھوالی۔ کتنی پریشانی ہوتی ہے کاغذات سنبھالنے میں۔ کہتا تھا کورٹ سے لڑ کر لے لوں گا۔ پھر اب کیا ہوا؟

سر آپ نے کہا ہی تھا کچھ لے دے کر......

چھوڑو منڈل فائل ڈھونڈو۔ اس نے پینترا بدلا اور کرسی پر ٹیڑھا ہو گیا۔ فائل ڈھونڈنے کے کام میں منڈل کے علاوہ اور بھی دو اسٹاف لگے ہوئے تھے اور اس عمل میں اس کے اچھے خاصے چیمبر کو کوڑے دان میں تبدیل کر دیا تھا۔ فائلوں کی اڑتی گرد نے وہاں سانس لینا محال کر رکھا تھا۔ اے سی بند کر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے اس کی موٹی جسامت پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی شرٹ کے بٹن کھول لیے اور اسے اپنی گردن پر اٹکا دیا۔ اسے پانچ سال پرانا منظرنامہ یاد آنے لگا کہ کس طرح وہ بوڑھا اس کے پاس معاوضے کی رقم کے لیے التجا کر رہا تھا جس کا جوان اور اکلوتا کمانے والا بیٹا دنگوں کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ سرکار نے تمام مہلوکین کے لیے ۱۰-۱۰ لاکھ روپے معاوضے کا اعلان کیا تھا۔ ۱۰ لاکھ روپے کی رقم اس بوڑھے نے دیکھنا تو دور اس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ سچ ہے کہ پیسہ اولاد کا غم زائل نہیں کر سکتا لیکن ایک ایسے شخص کے لیے جس کی کمر ضعیفی نے توڑ دی ہو، جس کے سر پر چار جوان

ISSN No. : 2395-2016

بیٹیوں کا بوجھ ہو اور بیوی کی بیماری نے جس کا گھر بار تک فروخت کروا دیا ہو، اس کے لیے اس رقم کی اہمیت کچھ کم بھی نہ تھی۔

پورے ضلعے کے معاوضے کی فائلوں کے انجام تک پہنچنے کے لیے اس کی سفارش شرط تھی، جس کی قیمت اس نے طے کر رکھی تھی، کل رقم کا بیس فیصد۔ اسے پورا کرنا اس بوڑھے کے لیے ناممکن تھا۔ لہٰذا اس کی عرضی فائلوں کے ڈھیر میں دبتی چلی گئی۔

وہ انہیں خیالوں میں کھویا تھا کہ جٹا شنکر نے سامنے چائے لا کر رکھ دی۔

"کیا سوچ رہے ہیں سر جی؟ ہم کہتے ہیں بڈھے کو اور سدھائیے۔ یہی سب لوگ باہر جا کر کہتا ہے ہم لوگ کچھ کام دھام کرتے نہیں۔ تھوڑا پتہ تو چلے کام کیا ہوتا ہے؟"

اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور گرم ہونے کے باوجود ایک ہی سانس میں پورا خالی کر دیا۔ ہٹو تم سب سے کچھ نہیں ہونے والا۔ کہہ کر وہ خود اٹھا اور فائلوں کے ڈھیر میں سے ایک بنڈل اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ بنڈل پٹخنا تھا کہ اس میں سے ایک زبردست قسم کا ایک بچھو اچھل کر باہر نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی تمام لوگ ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے، سوائے اس کے۔ اس کا پیٹ اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اس سے بھاگنا تو دور ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ وہیں پڑے پڑے چلایا۔ ارے کوئی ہے؟ کہاں مر گئے سب کے سب؟ کوئی ڈنڈا وغیرہ نہیں رکھتا......

ادھر اس نئے ماحول میں بچھو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اسے خود اپنی جان کی فکر ہو رہی تھی۔ اسے سامنے ایک سوراخ نظر آیا۔ پھر کیا تھا؟ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس سوراخ میں کود گیا۔ اس سوراخ نے اسے ایک نہایت ہی عمیق اور تاریک کنوئیں میں پہنچا دیا جہاں سے نکلنے کے لیے اب وہ مارے خوف کے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنے دن اور کتنی راتوں کے بعد آخر کار اس نے ایک دن صبح کی روشنی دیکھی۔ اب اس کے سامنے ایک بار پھر سے وہی پتھر اور درخت تھے۔ جن پر وہ اپنے دور طفلی سے ہی تیزی سے اچھال مارتا تھا۔ لمبے وقفے سے مسلسل اس بابو کے پیٹ میں پڑے رہنے کی وجہ سے اسے اب کافی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے شکار کے لیے نظریں دوڑائیں کہ اس کے سامنے وہی اس رات والا چوہا نظر آ گیا۔ اس کی گردن کا زخم اب تک رس رہا تھا جو اسے اس کی شکنجہ نما ٹانگوں کے وار نے دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس پر تیزی سے اپنی حالت سے بے خبر ٹوٹ پڑا اور اپنی دم اس کے جسم میں پیوست کر دی لیکن......

اس دفعہ اس کی دم زہر سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اس کے ایک وار کی تاب چوہا نہ لا سکا اور فوراً ڈھیر ہو گیا۔ شکم سیر ہونے کے بعد وہ اپنے جھنڈ کے پاس پہنچا جہاں اس کا باپ اس کے زندہ بچ نکلنے پر ابھی تک سب کو ڈانٹ پلا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہاں استعجابیہ سکوت طاری ہو گیا لیکن وہ سب سے بے پروا شاہانہ چال چلتا ہوا ایک پتھر پر جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے سردار کی نشست بہت پست نظر آ رہی تھی۔

❖❖❖❖❖

ISSN No. : 2395-2016

نعیم بیگ لاہور پاکستان

تین مائکروفکشن /افسانچے

جذر

نام: نعیم بیگ (ادبی و قلمی) افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، کالمسٹ (اردو اور انگریزی زبان میں) سکونت: لاہور پاکستان تعلیم: پولیٹکل سائنس اور انگریزی ادب میں گریجوئشن۔ قانون میں پوسٹ گریجوئشن۔ بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ، ڈپلوما ایسوسیٹ انسٹیچوٹ آف بینکنگ ان پاکستان۔ ریٹائرڈ ڈپٹی جنرل منیجر بینک، پروجیکٹ منیجر و فائننشل مینجمنٹ کنسلٹنٹ تصانیف۔ ٹرپنگ سول (انگریزی ناول۔ سوشل) شائع 2010 ۔یو۔ ڈیم۔ سالا (اردو افسانوی مجموعہ) شائع 2013۔ کوگن پلان (ناول۔ انگریزی۔ وار آن ٹیرر) شائع 2014۔ پیچھا کرتی آوازیں (اردو افسانوی مجموعہ) شائع 2016۔ ڈیئوس، علی اور دِیا (اردو ناول۔ انتھروپولوجی، مزاحمتی) شائع 2017۔ اردو فلم سکرپٹ "وصل" ریلیز 2016 زیر تصنیف ا۔ اردو ناول انتھروپولوجی، تاریخی ۲۔ انگریزی کتاب تقسیم ہند (شرمناک شتابی انخلا) ریسرچ ورک درجنوں اردو انگریزی افسانے و تنقیدی مضامین، کتاب تبصرے، کالمز مطبوعہ روزنامہ ڈان، ایکسپرس ٹربیون، واشنگٹن پوسٹ، ڈیلی ٹائمز، روزنامہ جنگ لاہور کراچی کوئٹہ ملتان، دنیا لاہور، ایکسپرس کراچی، نیشن لاہور، روزنامہ اذکار اسلام آباد، سہ ماہی ثالث بہار، سہ ماہی فنون لاہور، سہ ماہی کاغذی پیرہن لاہور، سہ ماہی استفسار انڈیا، سہ ماہی در بھنگہ ٹائمز انڈیا، ماہانہ جرس کراچی۔ انٹرنیٹ/ بلاگز لاؤڈ رِوسٹرم آن لائن، ایک روزن آن لائن، ہم سب آن لائن، لالٹین آن لائن، نعیم بیگ بلاگ آن لائن، سکریپڈ آن لائن، دیدبان آن لائن۔ اکیڈیمیہ آن لائن، گڈریڈز آن لائن۔

4723618 33392+Phone No. Email skanz.ex@gmail.com

ہو سکتا ہے کہ سائینس فکشن پڑھنے سے ایسا ہوا ہو، یا میرے جسم کے اندر ٹسٹوسٹیرون (Testosterone) کے مسلسل حملوں نے ایسا ذہنی ہیجان برپا کر رکھا ہو۔ بہر حال میں بے قرار تھا اور اتر جانا چاہتا تھا۔ جب مجھے کچھ سجھائی نہ دیا، تو میں نے لیپ ٹاپ پر چیٹ ونڈو کو پوری سکرین پر پھیلا دیا۔ میری آنکھوں میں جذبات کی شدت سے ستارے جھلملانے لگے، ایسے میں سنہرے بالوں والا حسین چہرہ سکرین پر نمودار ہوا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم میں اتر جانا چاہتا ہوں۔" میں منمنایا۔

"تم اس قابل نہیں۔" سکرین سفید ہوگئی۔

دوسرے ہی لمحے ایک اور حسین و جمیل چہرہ نمودار ہوا۔ "اوہ۔۔۔ یہ تم ہو، آؤ۔۔۔ تم ہی میرے خوابوں کی

ISSN No. : 2395-2016

رانی ہو۔'' میں شدتِ جذبات سے سرشار تھا، فوراً ٹرانس میں آ گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' وہی سوال تھا۔

''تمہارے اندر اتر جانا چاہتا ہوں۔'' میرا ایک ہی مطالبہ تھا۔

''تم پاگل ہو۔'' یہ کہہ کر چہرہ غائب ہو گیا۔

مجھے وحشت ہونے گئی۔ میرے پورے جسم پر ٹسٹوسٹیرون کے کوڑوں کی برسات ہونے لگی۔ ذہن تحلیل اور جسم اکڑنے لگا۔ جذبات کی شدت نے بالآخر کام دِکھا دیا، میں نے ایک جست بھری اور سکرین میں اتر گیا۔ یکلخت میں نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا ، ایسے لگا کہ میں کسی شکستہ قبر سے اٹھ کر کسی تازہ جسم میں حلول کر گیا ہوں۔ میرے آس پاس سینکڑوں اجنبی حسین، لیکن بے چین چہرے گھوم رہے تھے۔ سب کے شگفتہ گلابی ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا۔ وہ سب ایک ساتھ مجھ میں اتر جانا چاہتے تھے۔

نہاں خانہ

میرے دل کے بھید میرے بچوں کی طرح میرے جگر پارے ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر میں انھیں بچوں کی طرح تیار کرتی ہوں، نئے لباس پہناتی ہوں اور ٹفن میں پیک لنچ اور مسکراتے ہوئے جذباتی بوسوں کے ساتھ انھیں رخصت کرتے ہوئے بستر پر سوئے پڑے شوہر کی طرف اُچٹتی نظر ڈالتی ہوئی اپنے دفتر نکل جاتی ہوں۔ میرے بچے سارا دن مجھ سے دور رہتے ہوئے اپنے جنموں کے سربستہ راز کھولنے میں مصروف رہتے ہیں۔ انھیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ میرے اندر سے خلق ہوئے وہ ایسے جگر گوشے ہیں، جنھیں میں کسی وقت بھی زندہ دفن کر سکتی ہوں، لیکن کرتی نہیں۔

شام کو سونے سے پہلے جب وہ واپس آتے ہیں، تو ہم سب کے سروں پر غصے کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ ہم انتہائی بداخلاق ہو چکے ہوتے ہیں۔ درشت الفاظ، دروازوں کو زور سے بند کرنا اور چلتے پھرتے بڑبڑانا، کوئی ہم سے سیکھے۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ ہم پرسکون ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ میرے بچے میرے حواس پر چھانا شروع کرتے ہیں، تو میں ان کے بے رحمانہ طرزِ تخاطب کو بھول جاتی ہوں، ہم سب ایک نئے عہد کا اقرار کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

تاہم ایک بچہ بہت ضدی ہے۔ وہ مسلسل احتجاج کرتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ رات کے پرسکون لمحوں میں میرے ساتھ شوہر کی وحشیانہ ہم بستری قبول نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کبھی ہم سوتے جاگتے سہانے سپنے بھی ایک ساتھ دیکھیں، ہم جسموں کے سفر میں روحوں کو میزبانی کا شرف بخشیں۔ اُس رات جب میرا شوہر میرے نزدیک آیا، تو میرے اُسی بچے نے سرخ مشروب سے لبالب ایک گلاس مجھے پینے کے لئے تھما دیا۔ میں نے گلاس پکڑا، شوہر کی طرف دیکھا جو مشینی انداز میں اپنے جسم کو برہنہ کئے آئینے کے سامنے نازیبا حرکات کر رہا تھا۔ میں نے سوئے ہوئے دیگر بچوں کی طرف دیکھا، کراہت آمیز نظر شوہر پر ڈالی اور ناچاہتے ہوئے بھی مشروب کو ایک ہی گھونٹ میں نیچے اتارلیا۔

سب بچے خوشی خوشی میرے اندر واپس اترنے لگے۔ قطار کے آخر میں ضدی بچہ تھا، وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔

کوڑا کرکٹ

شام کے پھیلتے دھند لکے میں کافی ہاؤس ادھیڑ عمر مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک جانب موسیقی کا بے ہنگم شور تھا، تو دوسری جانب سب لوگ اونچی آواز میں اپنے اپنے موٹے نیم برہنہ پیٹ ڈھول کی طرح بجاتے ہوئے، قہقہوں اور مشروبات، چائے کافی کے درمیان سیاست، فلسفے اور ادب پر گفتگو کر رہے تھے۔ نت نئے خیالات تھے کہ اُمنڈے چلے آرہے تھے، لیکن بڑھتی ہوئی اختلاف رائے اور مزاحمت نے فضا کو قدرے مکدّر کر دیا تھا۔ ہر شخص ذہنی و جسمانی توازن کھو رہا تھا۔ ایسی فضا میں ایک نوعمر لڑکی کھلے سینے سے جھانکتے پستانوں اور رانوں سے چپکی جینز کی نیکر میں ملبوس، ہونٹوں سے سیٹی جیسی دھن بجاتی کولہے مٹکاتی اندر داخل ہوئی، تو پورے کیفے میں یکلخت خاموشی چھا گئی۔ فکر و دانش اور قہقہے منتشر ہو کر فضا میں بکھر گئے۔ ایسے میں کافی ہاؤس کا نوجوان نگران ہاتھ میں ایک کچراادان اور جھاڑن لیے ایک کونے سے نمودار ہوا۔ اس نے سرعت اور خاموشی سے فضا میں بکھرے تمام فلسفیانہ خیالات، دیواروں سے چپکی تمام سرگوشیاں اور زمین پر بکھرے تمام مزاحمتی قہقہے کچراادان میں جمع کر کے اسے سر بہ مہر کر دیا۔ اس نے تیزی سے پشت کی جیب سے ایک کاغذ نکالا، جس پر لکھا تھا 'انتہائی نجی اور خفیہ'، ڈبے پر چسپاں کر کے اسے خفیہ شلف کے ایک خانے میں محفوظ کر دیا اور لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے کافی ہاؤس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

انور آفاقی، دربھنگہ

نورشاہ سے ''گفتگو''

مشہور و معروف فکشن نگار نور شاہ نے ۱۹۳۶ء میں ڈل گیٹ محلے سری نگر میں آنکھیں کھولی اور ان کی پہلی چیخ گونجی اور ایسی گونجی کہ اس کی آواز نہ صرف کشمیر بلکہ پوری اردو دنیا میں پہنچ گئی۔ انھوں نے اپنے پانچ سو سے زیادہ افسانوں، ساٹھ ڈراموں اور کئی ناولوں کے ذریعہ اردو قارئین کے دلوں پہ حکومت قائم کر لی۔ ایک زمانہ تھا جب ''بیسویں صدی'' دلّی میں ان کی کہانیاں تواتر سے شائع ہورہی تھیں اور وہ نوجوانوں کے محبوب ترین افسانہ نگار بن گئے تھے۔

ان کے اب تک دس افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے تراجم ہندی، گجراتی، پنجابی، ڈوگری اور کشمیری زبانوں میں ہو چکے ہیں اور ان پر اب تک سات لوگوں نے ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کر لی ہیں۔ انہوں نے چھ ٹی وی سیریل لکھے جن میں ''درد کا رشتہ'' اور ''گل اور بلبل'' بہت مقبول ہوئے۔ ایک کتاب ''جموں اور کشمیر کے افسانہ نگار'' تحریر کی۔ جو بڑی اہم کتاب ہے۔ جس سے ریسرچ اسکالرز مستفیض ہورہے ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتابیں۔ ''کہاں گئے یہ لوگ'' اور کشمیر کی کہانی ہمیشہ قارئین کو متوجہ کرتی رہی ہیں۔ ناولٹ۔ ''آدھی رات کا سورج'' اور ''لمحے اور زنجیریں'' بھی بے حد مقبول ہیں۔

ابتدائی افسانوں میں رومانس غالب تھا۔ مگر بعد میں ان کے افسانوں میں زندگی کے مسائل، مجبوریوں اور ناکامیوں کے قصے، کرب اور بے بسی کی تلخیاں شامل ہوگئیں۔ افسانہ نے حقیقت نگاری کا روپ دھار لیا، مگر اسلوب شاعرانہ، انداز بیان متاثر کن کہ لگتا ہے جیسے بے شمار پھولوں کے رنگ یکجا ہو گئے ہوں۔

ان کے افسانوں میں جہاں ڈل جھیل میں تیرتے ہوئے شکارے اور چپوؤں کا شور ہے تو وہیں حالات کی ستم ظریفی کا سکوت بھی۔ باغوں کے رنگ برنگ پھولوں کی خوشبوؤں کا جھونکا ہے تو کہیں چنار سے خزاں رسیدہ پتوں کے جھڑنے کی بازگشت اور سسکیاں بھی سنائی دیتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نورشاہ کہانی بننے کے تمام لوازمات اور گر سے واقف ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

ان کے بارے میں مشاہیر علم کی رائے اتنی سچی اور اچھی ہے کہ سن کر ان پہ رشک آتا ہے۔ کبھی کرشن چندر نے کہا تھا کہ میں کشمیر نہیں گیا۔ مگر میں نے کشمیر کو نورشاہ، حامدی کاشمیری اور ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔'' مظہر امام کی موجودگی میں ایک ادبی جلسے میں عصمت چغتائی نے کہا تھا ''میں نورشاہ کے افسانے پڑھتی ہوں۔'' میں سمجھتا ہوں کہ نورشاہ کے لئے ان دو عظیم فنکاروں کی زبان سے پسندیدگی کا اظہار کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں۔

اسکول اور کالج کے زمانے میں، میں نے بھی نور شاہ کے کئی افسانے پڑھے تھے جو بیسویں صدی میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا نام اور چہرہ ذہن کے گوشے میں محفوظ تھا، نقش تھا۔ جب ہم نگینہ انٹرنیشنل کے ۲۳ نومبر ۲۰۱۷ء کے سیمینار میں جناب وحشی سعید کی دعوت پر شرکت کے لئے ۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء کو سری نگر پہونچے اور نور شاہ کو وحشی سعید کے "شہنشاہ پیلیس"، ہوٹل کے دفتر میں دیکھا تو مجھے ان کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اور میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ ہی مشہور و معروف افسانہ نگار نور شاہ ہیں نہ؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ جی میں ہی نور شاہ ہوں۔ اسی وقت ان سے گفتگو اور کچھ سوالات کرنے کا خیال ذہن میں آیا۔ آج ان ہی سوالات اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہوں۔

سوال: انور آفاقی جواب: نور شاہ

سوال: سب سے پہلے میں در بھنگہ کے ادبی حلقے اور احباب کی جانب سے آپ کو سلام پیش کرتا ہوں؟

جواب: شکریہ! میری جانب سے بھی خلوص بھرا سلام قبول کیجئے۔

سوال: کچھ اپنے بارے میں بتایئے:

جواب: اپنے بارے میں کیا بتاؤں، یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک افسانہ ہوں، ایک کہانی ہوں، میں جہاں پیدا ہوا وہ افسانوں اور کہانیوں کی بستی ہے۔ شہر سری نگر کا خوبصورت ترین اور مقبول ترین علاقہ دل گیٹ کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ علاقہ کوہ سلیمان کے دامن اور ڈل جھیل کے کنارے آباد ہے۔ سیاحتی اعتبار سے یہ علاقہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کی خوبصورتی اور آب و تاب حساس لوگوں کو شاعر، ادیب، فنکار اور مصور بنا دیتی ہے۔ رنگ برنگے شکارے، خوبصورت ہاؤس بوٹ، سرسبز شاداب باغات، برف پوش پہاڑ، گولف کورس..... اس بستی کی اپنی ایک تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی کہانی ہے میں اس کہانی کا ایک کردار ہوں۔

سوال: آپ نے افسانہ نگاری کب شروع کی اور پہلا افسانہ کہاں شائع ہوا؟

جواب: یوں تو نہ جانے کب سے افسانوں کا کیڑا میرے ذہن میں پنپ رہا تھا لیکن میری افسانہ نگاری کی شروعات ۱۹۵۹ کے آس پاس ہوئی۔ میرا پہلا افسانہ ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوا۔

سوال: آپ نے ابتداء میں عشقیہ یا رومانٹک افسانے تحریر کئے مگر بعد میں آپ نے زندگی کی تلخیوں کو تاریخی حقائق اور سیاسی بے چینی کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: جی ہاں میری ادبی زندگی کا آغاز رومانی انداز سے ہوا۔ اس کی پہلی وجہ شاید یہ ہے کہ میری پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو رومان سے بھرپور تھا، اس کی شاید ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زندگی کے اکثر دھارے رومان سے پھوٹتے ہیں، کافی عرصہ تک میں رومانی کہانیاں لکھتا رہا اور ان کہانیوں نے مجھے نام دیا، شہرت دی، اس کے بعد میری کہانیوں میں سیکس نے اپنی جگہ بنالی، سیکس کو رومان سے الگ رکھنا شاید درست بھی نہیں ہے۔ میں نے بہت سی کہانیاں اسی پس منظر میں لکھیں جو ملک کے معروف اور معیاری جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ جب میں لکھنا شروع کیا تو ترقی پسند تحریک اپنی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ اس تحریک کا بھی کچھ اثر میری سوچوں پر بھی پڑا

ISSN No. : 2395-2016

لیکن میں شور وغل سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ خاموشی مجھے پسند ہے پھر جدیدیت کا دور سامنے آیا۔ جدیدیت کی جادوگری نے میرے ذہن پر بھی دستک دی۔ میں نے مابعد جدیدیت کے پس منظر میں بھی کئی افسانے لکھے۔ میرے قریب قریب دس افسانے ''شب خون'' میں شائع ہوئے۔ میں نے کچھ علامتی کہانیاں بھی قلم بند کیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ ہر دور میں جدید ہوتا ہے۔ یہاں میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ ہماری ریاست گذشتہ کئی برسوں سے پرآشوب اور نامساعد حالات سے گزر رہی ہے، ایک قلم کار یا افسانہ نگار کی حیثیت سے میری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ میں ان حالات و واقعات، اس درد و کرب، بے چارگی، بے بسی اور ظلم و ستم کی عکاسی اپنے ڈھنگ سے کروں اور میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی بھرپور کوششیں کر رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں تحریر کردہ میری کہانیوں میں ایک نئی کہاں نظر آتی ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں، میں آپ کی آج کی کہانیوں کی بات کر رہا ہوں؟

جواب: ان دنوں میرے اکثر افسانوں کا اہم موضوع کشمیر ہے۔ ان کہانیوں کے تعلق سے چند تاثرات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

''نورشاہ کے افسانے کسی آغاز، اختتام اینٹی کلائمکس، خیال آرائی یا وضاحت کی محتاج نہیں ہوتے۔ یہ افسانوی تکنیک میں ایک خوش آئیند تبدیلی ہے۔'' (پروفیسر حامدی کاشمیری)

''نورشاہ کا احساس جمال کشمیر کے رنگ و نور کی دین ہیں جس کا مشاہدہ کرنا اور پھر حسن میں ڈوبتے جانا تخلیقی ذہنوں کا وہ کارنامہ ہے جو برسوں لذت عطا کرتا ہے۔ کشمیر میں نمکین چائے کا لطف وہی لے سکتے ہیں جو اس چائے کی رنگت اور لذت سے آشنا رہے ہوں۔'' (پروفیسر شکیل الرحمٰن)

''ان افسانوں میں نہ گلپوش وادیاں ہیں، نہ سبزہ اور نیلی جھیلیں ہیں، نہ خواب بھرے مرغزار، نہ سرخی مائل چنار، نہ لانبے لانبے سپیدے، نہ لمحوں کو معطر بنانے والی فضائیں۔ اب ان افسانوں میں وجود کی دلدل ہے، بوڑھے عقاب ہیں۔ سڑکوں پر بہتی ہوئی خون کی لکیریں ہیں، درد و کرب سے بوجھل فضائیں ہیں، مجروح ابابیلیں ہیں اور ہڈیوں کے سوداگر ہیں.....!'' (ویدراہی، فلم ڈائریکٹر)

''نورشاہ نے اپنی کشمیر کی کہانیوں کے ذریعہ ادب میں سچ اور صرف سچ کے ایماندارانہ بیان کا ایک نیا رجحان پیدا کیا ہے۔ نورشاہ کے یہ افسانے دہشت، خوف و منافرت کے جذبات متحرک نہیں کرتے بلکہ امن وآشتی محبت واخوت اور فرقہ وارانہ آہنگی کی قیام پر زور دیتے ہیں۔'' (پروفیسر قدوس جاوید)

''خود اعتمادی کا دامن تھامے نورشاہ سطحیت، جذبات یا نعرہ بازی سے کبھی متاثر نہ ہوئے۔ مواد اور ہیت میں رشتہ ہر حال میں قائم رکھنے اور فن و موضوع کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ان کو واقعی ید طولیٰ حاصل ہے۔'' (ڈاکٹر اشرف آثاری)

سوال: یہ شاہدہ شیرین کا کیا قصہ ہے۔ ذرا تفصیل سے بتایئے؟

جواب: بہت پرانی کہانی ہے۔ بار بار دہرانے سے اب کیا حاصل۔ تھوڑے سے مطالعے اور اچھے خاصے مشاہدے کی بنا پر جب میں نے محسوس کیا کہ میں کہانیاں خود ہی لکھ سکتا ہوں تو ایک کہانی اردو دنیا کے ایک معروف مدیر کو

ISSN No. : 2395-2016

ارسال کی۔ جو جواب ملا وہ حیران کن نہ تھا۔ میری کہانی رسالے کے معیار کو چھونے میں ناکام رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد میں نے کہانی کا عنوان بدل دیا۔ کہانی کے شروعات کے جملے بدل دیئے اور یہی کہانی دوبارہ مدیر محترم کو ارسال کی۔ لیکن ایک نئے نام کے ساتھ، ایک فرضی زنانہ نام کے ساتھ اور یہ کہانی شاہدہ شیرین کے نام سے شائع ہوئیں۔ یہ سلسلہ کچھ دیر چلتا رہا، اور پھر شاہدہ شیرین نے دوبارہ نورشاہ کا روپ اپنا کر اپنے نام سے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔

سوال: آپ خود کس طرح کے افسانے پسند کرتے ہیں؟

جواب: میں ہر اچھی اور معیاری کہانی پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔

سوال: آپ اپنی پسند کے تین اردو افسانہ نگاروں کے نام بتایئے؟

جواب: میری پسند کے بہت سارے افسانہ نگار ہیں، ماضی میں بھی رہے اور آج بھی ہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گے شاید کہ کبھی اے۔ حمید بھی میرا پسندیدہ افسانہ نگار تھا۔ ابن صفی کو پڑھ پڑھ کر میں نے افسانوی دنیا میں قدم رکھا۔ آپ کے سوال کا جواب ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور پشکر ناتھ۔ میں اپنے ہم عصر افسانہ نگار مرحوم عمر مجید سے بھی کافی متاثر ہوں۔ آپ نے صرف تین نام بتانے کو کہا ہے ورنہ میری اس فہرست میں اور بھی نام شامل ہو سکتے ہیں۔ میں اگر صرف کشمیر کی بات کروں تو اختر محی الدین، امین کامل، اوتار کرشن رہبر، علی محمد لون،، ہری کرشن کول، ہردے کول بھارتی (کشمیری زبان کے کہانی کار) میرے پسندیدہ افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ اور ٹھاکر پونچھی، موہن یاور نے بھی ریاست جموں کشمیر کے تعلق سے اردو افسانے کی زلفیں سنوارنے میں ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ وحشی سعید خوب سے خوب تر لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آثاری دوسری مصروفیات کی وجہ سے افسانوی ادب کی جانب بھرپور توجہ نہیں دے پا رہے ہیں لیکن جب بھی ان کی کوئی افسانوی تخلیق منظر عام پر آتی ہے تو بڑی توجہ سے پڑھی جاتی ہے۔ دیپک بدکی اور دیپک کنول کی افسانوی تخلیقات بھی بہت پسند کی جاتی ہیں۔ یہاں نئے پرانے قلم کاروں کی کمی نہیں۔ نام اس لئے نہیں لے رہا ہوں کہ کوئی رہ نہ جائے۔ میں نام لئے بغیر کہنا چاہوں گا دور جدید کے یہ افسانہ نگار بہت ہی عمدہ تخلیقی کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ ہماری نئی نسل کے افسانہ نگار پڑھے لکھے ہیں اور ہم سے زیادہ ذہین اور سنجیدہ ہیں۔ آنے والے دنوں میں کشمیر کے افسانوی نقشے پر ان کے نام نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔

سوال: معروف برادران (افسانہ نگار، ناول نگار) غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی کو ضرور پڑھا ہوگا۔ ان دونوں میں سے کس نے آپ کو زیادہ متاثر کیا۔

جواب: جی ہاں دونوں کو پڑھا ہے۔ دونوں نے افسانوی ادب کی خوب آبیاری کی ہے۔ دونوں میرے محترم ہیں۔

سوال: معروف شاعر، افسانہ نگار اور تنقید نگار پروفیسر حامدی کاشمیری کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: حامدی صاحب تو ملکی سطح کے باوقار قلم کار ہیں۔ ان کی شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ ہیں اور ہر شخصیت علم کی روشنی سے منور ہے۔ وہ نہ صرف لفظ و معنی اور زبان و بیان کی نزاکتوں سے واقف ہیں بلکہ انہیں فن و فکر پر مکمل اعتبار حاصل ہے۔

سوال: اپنے دوست مجاہد اردو زبان، معروف افسانہ نگار اور ایک نیک انسان وحشی سعید کے تعلق و قربت کے

ISSN No. : 2395-2016

بارے میں بھی بتائیں۔

جواب: سعید صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سادگی، شرافت، نفاست اور شائستگی کے پیکر ہیں۔ افسانوی ادب میں ان کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ وہ اکثر علامتی افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات وسیع تر ہوتے ہیں اور نگینہ انٹرنیشنل کی وساطت سے اردو زبان وادب کی خدمت ان کا فرض اول بنتا جارہا ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والے دوست ہیں۔

سوال: کسی زبان کی ترویج وترقی کے لئے تنظیمی اقدامات بے حد ضروری سمجھے جاتے ہیں، کشمیر میں اردو زبان کے تعلق سے جو کچھ بھی ہورہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں۔؟

جواب: اردو ریاست جموں کشمیر کی سرکاری اور آئینی زبان ہے۔ سرکاری سطح پر ابھی اس زبان کے فروغ کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اردو پڑھنے اور پڑھانے کے لئے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں معقول انتظامات کئے گئے ہیں لیکن اردو اکادمی قائم کرنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ریاستی کلچر اکادمی ریاست میں بولے جانے والی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی تشہیر واشاعت کے لئے بھی کام کررہی ہے۔ عوامی سطح پر بھی انفرادی اور اجمالی طور پر اردو زبان وادب کی آبیاری کے لئے ٹھوس اقدامات اٹھائے جارہے ہیں۔ کئی تنظیمیں اردو کی بقا اور بہبودی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ریاست میں جموں کشمیر اردو کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس کے لئے رقومات کے فراہمی کو یقینی بنایا جارہا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا ہے تو اردو اور اردو والوں کے لئے یہ سال نو ۲۰۱۸ء کا ایک انمول تحفہ ہوگا۔

سوال: آدھی رات کا سورج اور لمحے اور زنجیریں لکھنے کے بعد آپ کو یقین تھا کہ یہ ناولٹ آپ کی پہچان بن جائیں گے؟

جواب: میں نے اس تعلق سے کبھی نہیں سوچا۔ میں نے اور بھی ناول لکھے ہیں۔ ''آؤ سو جائیں'' ماہنامہ ''شاعر'' کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا تھا جو بے حد مقبول ہوا۔

سوال: افسانے آپ آج بھی لکھ رہے، بغیر رکے بغیر تھکے، اتنی توانائی کا راز کیا ہے؟

جواب: اللہ کا کرم ہے۔ میرے پڑھنے والوں کی دعاؤں اور نیک خواہشات میں میری قلمی توانائی کا راز پوشیدہ ہے۔

سوال: افسانہ ایک ہی نشست میں مکمل کرتے ہیں یا پہلے خاکہ تیار کرتے ہیں اور پھر اس میں رنگ بھرتے ہیں؟

جواب: ضروری نہیں کہ افسانہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو۔ البتہ افسانچے اکثر ایک ہی نشست میں مکمل ہوتے ہیں۔ خاکہ ہمیشہ ذہن میں پنپتا رہتا ہے اور پھر کاغذ پر بکھر جاتا ہے۔

سوال: شاہ صاحب ایک آخری سوال..... اگر آپ افسانہ نگار نہ ہوتے تو پھر کیا ہوتے؟

جواب: اللہ بہتر جانتا ہے۔

سوال: آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ اتنی قیمتی یادیں اور اپنے مشاہدات شیئر کئے۔

جواب: یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ جناب انور آفاقی صاحب۔

☆☆☆

مجیر احمد آزاد

(فکاہیہ)

اردو ور کشاو اہنی

مجھے اردو اخبار پڑھنے کی عادت ہے جسے فی زمانہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔اس لئے میں پرانے خیالات کا نمائندہ مانا جاتا ہوں۔اور تو اور بیگم بھی مجھے اردو اخبار پڑھتے ہوئے دیکھ کر اس طرح طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتی ہیں کہ میں اکثر جھینپ جاتا ہوں۔شام ڈھلنے تک بوسیدہ ہوتا ہوا اخبار جب میرے ہاتھوں میں دیکھتی ہیں تو ان کے ہونٹ سے نکلے الفاظ میرے دل کو چھلنی کر جاتے ہیں کہ ''پورا اخبار حفظ ہو گیا ہو تو ذرا ہندی میں لکھے ہوئے بنئے کی کاپی کا حساب جوڑ دیجئے۔''میں حسب معمول اردو اخبار کے مطالعے اور بیگم کے مطابق 'حفظ کرنے میں' مصروف تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی بیگم کی آواز سنائی پڑی۔

''ڈرائینگ روم میں اردو اخبار یاد کر رہے ہیں، آجائیے۔''

مجھے مرزا بلند مرتبہ کے قہقہے کی نزدیک آتی آواز سنائی پڑی۔وہ کمرے میں لنگڑاتے ہوئے داخل ہوئے تو میں حیران ہوا۔ابھی دو چار دن قبل ملاقات ہوئی تھی تو ٹھیک ٹھاک تھے اور مزے لے لے کر کسی سیمینار کا ذکر کر رہے تھے۔میں نے خیریت پوچھی تو وہ صوفے پر پسرتے ہوئے بولے۔''بھائی صاحب اب شرافت کا زمانہ نہیں رہا۔میری یہ درگت کل کے سیمینار میں ہوئی ہے۔''انہوں نے میرا حیرت سے کھلا ہوا منھ دیکھا تو روداد سنانے لگے۔''کیا بتاؤں بھائی! آپ تو مقامی سیمینار میں جاتے نہیں، دنیا بھر میں ہوا ہوائی پھرتے ہیں۔اردو اخبار پڑھ کر خود کو اردو کا محافظ مانتے ہیں۔آپ کو اردو کی زمینی سچائی اور حالات کی خبر ہی نہیں کہ اب ہماری اردو پیاری اردو ''اردو ور کشاو ہنی'' کے رحم و کرم پر آگئی ہے۔وہنی چاہے تو اردو کی ترقی کا ڈھنڈورا پٹوا دے اور کبھی ناراض ہو جائے تو اردو کی موت کا ماتم سیمیناروں میں کرنے لگے۔''انہوں نے ایک گلاس پانی ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بتانا شروع کیا۔

'کیا بتاؤں بھائی، آپ تو جانتے ہیں اپنے شہر میں اردو ادب کا ارتقاء کے عنوان سے سیمینار تھا۔جوانوں کی ٹیم کو لیکر ڈاکٹر شجاعت البیلا نے سرکاری ادارے کے مالی تعاون سے اس کا اہتمام کیا تھا۔وینیو ایک انگلش میڈیم اسکول تھا۔میں وہاں جانے سے خود کو نہیں روک سکا۔بھلا ہو اردو اخبار میں شائع اس خبر کی جس میں لکھا تھا کہ اسے ہی دعوت نامہ سمجھا جائے۔اس طرح مجھے بھی اخباری دعوت تھی۔

ISSN No. : 2395-2016

خود پہ خوشبو کا چھڑکاؤ کر کے میں وہاں پہونچا۔دل خوش ہو گیا جناب جب اس کانونٹ کی لڑکیوں نے انگریزی میں استقبالیہ نظم سے سماباندھا۔بھائی میری انگریزی کی واقفیت آپ سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن لڑکیوں کی آواز اور ایکٹنگ نے من موہ لیا۔

میں نے ٹوکا'' جناب بلدمرتبہ صاحب آپ ہمیں وہ واقعہ سنانے والے تھے جس کی وجہ سے آپ علیل نظر آرہے ہیں، آپ تو بس لن ترانی کیے جارہے ہیں۔'' انہوں نے کھچڑی ہورہی داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور خفیف سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے گویا ہوئے۔

'میں اس واقعہ کی تمہید بیان کررہا تھا مگر آپ سیدھے سیدھے میرے زخموں کی وجہ جاننے کی عجلت میں ہیں۔بھائی صاحب پہلے تو کلیدی خطبہ ہوا اس میں اپنے شہر کی ادبی تاریخ تو دور معتبر اہل قلم کا ذکر تک نہ ہوا۔میں پہلو بدلتا رہا کہ خطیب کو اردو کے اساتذہ سے کوئی پرانا بیر تھا۔وہ ہماری پیاری اردو کی بگڑتی صورت حال کا ذمہ دار اساتذہ کو گردانتے رہے اور اپنی ساری توانائی اپنی تعریف اور اساتذہ پر لعن طعن پر ختم کرلی تب جاکر یہ عقدہ کھلا کہ ان کے بچپن میں استاد نے اردو تلفظ سکھاتے ہوئے ان کی خوب دھنائی کی تھی باوجود اس کے اب تک حضرت کا ش ق درست نہیں ہوسکا تھا۔مجمع میں زیادہ تر لوگ اس راز سے واقف تھے اس لئے خطبہ کی جانب حاضرین کی توجہ نہیں تھی۔اب باری مقالہ نگاروں کی تھی۔ایک مقالہ نگار نے میری ادبی خدمات پر بعنوان ''مرزا بلند مرتبہ کے اعلیٰ مرتبت شعری خدمات'' مضمون پڑھنا شروع کیا۔میری تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا، میری باچھیں کھل اٹھیں، مجھے پہلی بار ادبی دنیا میں بلند مرتبہ ہونے کا احساس ہوا۔مقالہ نگار ڈاکٹر صاحب نے میری شاعری کے وہ وہ خصوصیات بیان کیے کہ میں حیران رہ گیا۔انہوں نے میری شاعری کی وہ خوبیاں گنوائیں کہ میں عش عش کرنے لگا۔میں پھولے نہیں سمار ہا تھا کہ میری یادداشت نے مجھے ایک چپت رسید کی۔میں حقیقت کی دنیا میں واپس آیا تو سمجھ میں آیا کہ ارے یہ سب نکات تو شعر شور انگیز، آہنگ غالب اور محاسن کلام غالب میں میری نگاہوں سے گزرے ہیں۔بس ڈاکٹر موصوف نے شمش الرحمٰن فاروقی ، یوسف حسن خان اور مولانا عبد الرحمٰن بجنوری کی معرکتہ الآرا کتابوں سے ہو بہو نقل کر لئے ہیں اور صرف میر و غالب کی جگہ مجھ یعنی مرتبہ کا نام فٹ کر دیا ہے۔میرا جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر موصوف کا منھ چومنے کے بہانے اس کا منھ نوچ لوں۔خیر سے وہ نازک وقت بیتا میں شرمندہ سا بس اس کا منہ تکتا رہا اور انہیں ڈاکٹری کی سند دینے والوں کی علمیت پر افسوس کرتا رہا۔اس کے بعد ایک صاحب کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی جو بقول ناظم ''اردو کا نوجوان ناقد اور کئی کتابوں کا مصنف'' تھا نے اپنی تقریر میں بزرگوں کو نئی نسل کی اصلاح جیسے مقدس کام کی جانب توجہ دلائی۔انہوں نے اردو زبان سکھانے کے لئے بزرگوں کو للکارتے ہوئے کہا۔

''زیادہ تر بزرگ ادبا نوجوانوں کا رہنمائی نہیں کرتے ہیں، ان کی ہاتھ پکڑ کر راستہ پر نہیں لاتے ہیں اور زبان وادب کی گراوٹ کا رونا روتے ہیں، کیا اسی طرح اردو کا سانداز مستکبل بنے گی۔ آپ بوڑھے پرانے لوگوں سے گجارس ہے کہ آج نہیں ابھی سے ہی ہم سب کی اصلاح کیجئے۔''

کیا بتاؤں بھائی میرے اندر کا بزرگ جوش مارنے لگا میں خود کو روک نہیں پایا۔ مجھے خبر نہیں کون سی وجہ ہوئی کہ میں نے کھڑے ہوکر مقرر سے کہا کہ ''عزیزم! آپ اپنی زبان کی اصلاح کیجئے۔ جیسے نوجوانوں کا رہنمائی نہیں بلکہ کی رہنمائی، ان کی ہاتھ کی جگہ ان کے ہاتھ اور اسی طرح سانداز مستقبل نہیں شاندار مستقبل اور گزارش بولئے.........'' اس نے مجھے خسمگی نگاہوں سے دیکھا تو میں نے ایک دو اور غلطیاں نکال دیں۔ پھر کیا تھا وہ یہ کہتے ہوئے کہ 'ان جیسے پیر کھینچنے والے بڈھوں کے کارن اردو پچھڑ گیا ہے' تیزی سے میری جانب لپکا۔ میں جب تک کچھ سمجھتا اس نے مجھے گالیاں دینی شروع کردیں۔ ''ہرام کھور، باسٹرڈ، قمینا.......میری بے عزتی کرتا ہے بوڑھا خ وخوسٹھ........'' مجھ سے رہا نہیں گیا بول پڑا ''.........اگر گالیاں اردو میں دینی ہیں تو اردو سلیقے سے بولنا سیکھ لو عزیزم!........'' اس پر رکشا واہنی سے جڑے ریڈی میڈ قسم کے ادیبوں نے مجھے دبوچ لیا اور دھلائی کردی۔ بھلا ہو صدر مجلس مولانا رنجور قیامت کا کہ وہ لپکے اور مجھے یہ کہہ کر بچایا کہ ''ارے اللہ کے بندو، اس طرح کا سلوک تو گیور کشک بھی نہیں کرتے ہیں۔ ان کے دم سے ہی اپنے شہر کے کئی شعراء کی دنیا آباد ہے۔'' میں وہاں سے بے آبرو ہوکر واپس ہوا بعد میں پتہ چلا کہ واہنی والوں نے تجویز پاس کی کہ ''استاد ٹائپ اور سچ بولنے والے کسی بھی اردو داں کو اگلے پروگرام میں شامل نہیں ہونے دیا جائیگا، اس کے لئے واہنی مہم چلائے گی تاکہ نوجوانوں کو کوئی رکاوٹ نہ آئے اور ہم سب کھل کر اردو اردو کا کھیل کھیلتے رہیں گے۔''

میں نے ان کو چڑھایا، آپ کے ساتھ یہ دوسرا واقعہ ہے۔ آپ سدھر کیوں نہیں جاتے؟ گزشتہ شعری نشست میں بھی نوجوان شعراء نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے واہنی کے نرغے سے آپ کو نکالا تھا۔''

انہوں نے بڑی تلخی سے جواب دیا۔ ''آپ مجھے سدھر جانے کے لئے کہتے ہیں مگر ان خود ساختہ عظیم ادباء کی غیر ادبی حرکتوں کا کیا؟۔ مجھے لگا میں نے بیکار ہی ان کے زخم کو تازہ کردیا ہے۔ یہ بات تو سہی ہے کہ انہوں نے لہک لہک کر گلا پھاڑ انداز میں شعر پڑھنے والے شاعر کو ٹوکا تھا کہ ''اپنا شعر پڑھئے، ابھی یہاں احمد فراز اور ندا فاضلی کی شاعری کے مداح موجود ہیں۔'' وہاں بھی خوب ہنگامہ برپا ہوا تھا اور مرتبہ صاحب کے خلاف کئے متشاعر صف آرا ہوگئے تھے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے گھیرا۔

ISSN No. : 2395-2016

''اچھا آپ اپنے بارے کیوں بھول رہے ہیں۔مہینوں تک آپ کے خلاف اخبار میں جھوٹی اور بے بنیاد باتیں شائع کی جاتی رہیں۔ٹھیک ہے میری حجامت ہوگئی مگر آپ کا جنازہ بھی دھوم سے ہی نکالا گیا تھا اخبار میں۔آخر آپ نے صحافت کے سیمینار میں صحافیوں کو آئینہ ہی دکھایا تھا نا!ان کی تن آسانی اور بے وقعت لوگوں کی پذیرائی کو آڑے ہاتھوں لیا تھا نا!۔وہاں آپ کے خلاف بھی منتظمین کانا پھوسی کرتے رہے تھے اور بعد میں مطلب بے مطلب اخبار میں آپ پر کیچڑ اچھالا جاتا رہا۔آپ بھی تو اردو رکشا واہنی کے نشانے پر رہے ہیں۔میں ان کی کھری کھری باتوں کا کیا جواب دیتا۔

یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں گئو رکشکوں سے ہر وہ شخص پریشان ہے جنہیں گوشت کھانے کا شوق ہے اور وہ جھولا لے کر گھر سے نکلتے ہیں اور حسیبل قصائی سے کبھی پٹھیا، کبھی ران، کبھی سینہ خرید کر شہ راہ سے گزرتے ہوئے گھر آتے ہیں۔اگر راستے میں گئو رکشا واہنی کے جوان مل گئے اور انہیں ہاتھوں میں کھجلی ہو گئی تو خیر نہیں۔اسی طرح ہر شہر میں اردو رکشا واہنی کے من تنگ لوگ موجود ہیں۔وہ چوراہوں پر نہیں ہوتے بلکہ ادبی تقریبوں میں اپنی موجودگی سے سماں بدلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ان کی غلطیوں پر زبان کھلی آپ نشانے پر آ گئے۔بعید از قیاس نہیں کہ ہال کے باہر آپ کی گاڑی کی ہوا نکل جائے۔یہ بھی خیال رہے کہ رکشا واہنی کے سر پر جس طرح سیاسی رہنماؤں کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح ان کے سروں پر بھی ایوارڈ یافتہ با گھر بلا ٹائپ ادبا کا ہاتھ اور دفع کرنے یا جنگ کرنے کے لئے ہلا بول قلم مزدور ہوتے ہیں۔اس لئے آج کا جینوئن ادیب و فنکار نشستوں اور سیمیناروں میں جانے سے گریز کرتا ہے یا جاتا ہے تو چوکنا رہنا فطری ہے۔

میں مرتبہ صاحب کے لئے نیک خواہشات رکھتا ہوں کہ اتنی سرزنش کے باوجود اصلاح زبان و ادب سے کبھی نہیں چوکتے ہیں۔انہیں سقراتِ ادب کہنے والے کم نہیں ہیں لیکن عاشق اردو ہیں چاک دامن اور چاک گریباں کے باوجود میدان میں ڈٹے ہیں۔ایک میں ہوں جب بھی ادبی محفلوں میں جاتا ہوں گدھے کو گھوڑا کہتا ہوں۔ان کی چال کو عربی گھوڑے کی رفتار سے مماثل بتاتا ہوں، ان کے بکواس کاموں کو تاریخ ساز اور ان کے سرقہ شدہ اثاثے کو معتبر گردانتا ہوں، ان کو خوش دیکھ کر اپنی اس انا کی تسکین ہوتی ہے کہ ان کی آنکھوں پر خود فریبی کی پٹی مضبوط کرنے میں معاون ہوں۔میں مرتبہ صاحب کی طرح ہمت ور نہیں ہوں۔اردو زبان و ادب میں گئو رکشا واہنی کے طرز کے نئے نئے ادارے ہل چل مچا رہے ہیں اور یہ سب ہم سب کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ہم بھی تماش بیں ہیں اور قتل بھی ہمارا ہی ہو رہا ہے۔بعید نہیں کسی دن بلند مرتبہ اردو رکشا واہنی کی موب لانچنگ کا شکار ہو جائیں اور ہم انہیں اپنے ان ناتواں ہاتھوں سے شہید اردو لکھ کر قلم توڑ دیں......

☆☆

منصور خوشتر

....بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

(مکالمہ)

سلف پبلسٹی اور خودنمائی کے دور میں کیا جینوئن فنکار حاشئے پر چلے جائیں گے؟

ایسا پہلی نظر میں نہیں لگتا لیکن ایسا ہورہا ہے۔اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ جینوئن فنکار کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کرسکتا؟ کیوں کہ نظر انداز کیے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہوچکا ہے۔ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو مختلف فرضی ناموں سے اپنا قصیدہ لکھ رہے ہیں۔آنے والے وقت میں یہ شہرت، اگر ادبی ایوارڈ کے لئے معیار ثابت ہونے لگے، تو آپ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔کسی کی کتاب اٹلی سے چھپ رہی ہے، کسی کو فرانس سے بلاوا آرہا ہے۔مگر اس نمائشی میلے میں ہمارا جینوئن ادیب کہیں کھو گیا ہے۔وہ محض ادبی رسائل تک محدود ہے۔بعض ادیب ایسے بھی ہیں، جو سوشل ویب سائٹ سے رابطہ رکھنا ہی نہیں چاہتے۔اردو کے معروف ناول نگار مشرف عالم ذوقی نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا تھا کہ ہم ایک بڑے بازار میں الجھ کر بونے ہوگئے ہیں۔یہ بات صداقت پر مبنی لگتی ہے۔غیر ممالک میں اردو کے نام پر جانے والے اور ہندوستانی اردو ادب کی نمائندگی کرنے والے یہی چند لوگ ہیں۔دو کتابیں لکھ کر فارقی صاحب اور نارنگ صاحب کو خوش کرنے میں بھی، ان میں سے کوئی پیچھے نہیں۔خوشامد پرستی، چاپلوسی، خودنمائی اور سلف پبلسٹی کے لئے جس قدر ہتھکنڈے استعمال کیے جاسکتے ہیں، کئے جارہے ہیں۔اتنی محنت اور مطالعہ کے لئے وقت اگر ایسے لوگوں نے ادب کے نام کیا ہوتا تو شاید خود کو طرم خان ثابت کرنے کی نوبت نہ آتی۔

کیا یہ صرف اردو میں ہورہا ہے۔۔؟ یہ بھی ایک سوال ہے۔۔؟

کیا ایسے فنکار ہماری قدیم اور بلند ادبی روایت کا حصہ بن سکیں گے؟

اور سب سے بڑا سوال۔۔۔سلف پبلسٹی اور خودنمائی کے دور میں کیا جینوئن فنکار حاشئے پر چلے جائیں گے؟

کیا اپنے عہد کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ادب کو زندہ رکھا جاسکتا ہے؟

کیا سوچتے ہیں آپ۔۔۔۔؟

ہمیں آپ کی رائے کا انتظار ہے۔۔۔۔

ISSN No. : 2395-2016

(سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز نے اپنی فیس بک ٹائم لائن پر مذکورہ عنوان سے ایک مکالمے کا کی دعوت دی تھی۔ جس میں شعرو ادب سے تعلق رکھنے والی سرکردہ شخصیات نے کھل کر حصہ لیا اور اپنے بے لاگ تبصروں سے نوازا۔دربھنگہ ٹائمز کے قارئین کے لیے پیش خدمت ہے اس عنوان کے تحت ہوئی بات چیت کے کچھ اہم حصے :

یہ سوال تو تم نے دل ڈھڑکانے والا کر دیا ہے۔ بہت ہی سنجیدہ اور آج کا سلگتا سوال۔ جواب کا مجھے بھی انتظار ہے۔

☆مشتاق احمد نوری

اگر اس پر ایمان داری اور بے خوفی سے باتیں کی جائیں تو بھونچال آجائے گا۔

☆حسین الحق

اس تحریر میں بہت ساری باتیں گھل مل گئی ہیں۔سوشل میڈیا کے ادیب، بیرونی ملک جانے والے ادیب، حلقہ بگوشی کرنے والے ادیب، اور جینوئین ادیب کی شناخت، سیلف پرموشن کے گنہ کار۔

آپ کی بحث کے یہ اہم نکات ہیں۔ گفتگو اسی وقت ممکن ہے جب ہم یہ ثابت کر دیں کہ ادب کی ترسیل کے موجود ذرائع میں الکٹرانک میڈیم کم تر اور پرنٹ میڈیم افضل ہے۔اس تقابل کے لیے سوشل میڈیا اور رسائل کے ادیبوں کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہے۔میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ سوشل میڈیا کا سہارا پرموشن کے لیے رسائل بھی لے رہے ہیں، کتابوں کی بھی پبلسٹی ہو رہی ہے اور نام نہاد رسائل میں لکھنے والے بھی یہاں جلوہ افروز ہیں، شائع کم و بیش سب ہی ہوتے ہیں۔اب رہی بات غیر ملکی اسفار اور ادب کی نمائندگی کی تو بعض لوگ اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر جاتے ہیں۔ کسی ادارے کے بینر تلے تصویر بناتے ہیں اور فیس بک پر پوسٹ کر دیتے ہیں۔اس سے ان کو بیرون ملک ادب کی قیادت نہیں مل جاتی۔اسی طرح جینوئین فنکار کی نشاندہی ضروری ہے جو نظر انداز ہو رہے ہیں۔ساتھ ہی ان کے اعلیٰ ادبی نمونوں کو پیش کرنے کی ضرورت ہے۔میرے خیال میں ادب یا تو اچھا ہے یا برا، اس کی ترسیل کا ذریعہ کیا ہے یہ اہم نہیں ہے۔سارا مسئلہ شناخت کا ہے۔مشرف عالم ذوقی ہوں کہ رحمٰن عباس کہ شموئل احمد یا مشتاق احمد نوری، سلام بن رزاق، منصور خوشتر، اسلم جمشید پوری، سب فیس بک پر موجود ہیں۔فہرست طویل ہے اور فیس بک پر موجودگی بذات خود سیلف پرموشن ہے۔

☆ابرار مجیب

منصور خوشتر کے سوالات کا جواب تو چند جملوں میں ہی بھائی ابرار مجیب نے دے دیا۔بے معنی اور غیر معیاری کتابوں کی جس طرح دھوم دھڑاکے سے رسم اجرا کے جلسہ کا انعقاد ہوتا ہے، وہ کیا ہے خود نمائی اور خودستائی ہی تو ہے۔ویسے میں بڑے بھائی حسین الحق صاحب کی اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ اگر اس پر ایمان داری

اور بے خوفی سے باتیں کی جائیں تو بھونچال آجائے گا۔لگتا ہے منصور خوشتر بھونچال لے ہی آئیں گے۔اس سلسلے میں مظہر امام صاحب کا ایک شعر بے اختیار یاد آرہا ہے

تیشہ اٹھالیا ہے تو اب جو بھی زد میں آئے
اس راستے میں تیری عمارت بھی آئے گی (معاف کریں، پورا شعر بروقت یاد نہیں)

☆سید احمد قادری

سوالات اس لیے قائم کیے جاتے ہیں کہ اس پہ گفتگو کی جائے اور الحمدللہ بات ہو بھی رہی ہیں ابرار مجیب صاحب نے بڑی اہم باتیں لکھی ہیں یہ الگ بات کہ۔۔۔اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔کوئی بھی عمل جب مقصدیت سے ہٹ کر خودنمائی کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کی بنیاد کمزور ہو جاتی ہے۔اشتہار کسے پسند نہیں لیکن معیار قائم رکھنے کی بہرصورت ہر جگہ ضرورت ہے۔امید ہے کہ مزید قیمتی باتیں اس موضوع پہ ابھر کر سامنے آئیں گی۔

☆جمیل اختر شفیق

منصور!تمہارے سوال میں درد ہے اور میرا ذاتی خیال ہے (حسین بھائی کی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے) کہ ہمیں اس درد کا ساجھیدار ہونا چاہیے۔ابرار کی اس بات سے اختلاف ہے کہ فیس بک کا مطلب ہی سیلف پراجکشن ہے۔کیسے؟کیا رسائل میں کہانی بھیجنا بھی سیلف پراجکشن ہے؟ہم میں سے کچھ لوگ اپنا ادب شیئر کرتے ہیں۔کچھ نئے مباحث کو جگہ دیتے ہیں۔ابرار نے افسانوی میلے کی بنیاد رکھی۔ہمارے خیال سے یہ بھی سیلف پراجکشن نہیں کہا جائے گا۔لیکن ایسے نام بھی ہیں جو اپنی تشہیر اور اشتہار بازی میں ہر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔اگر زمانہ اسی کا ہے تو ایسے لوگ ہی سیمناروں کی شان بڑھائیں گے۔اس کھلی بحث کا ایک حصہ شاید پروفیسر حضرات کی طرف اشارہ ہے۔اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔لیکن میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ جینوئن ادیب کا حق چھیننا آسان نہیں۔وقتی ہنگامے اس کا کچھ بگاڑ نہیں پائیں گے۔جو جینوئن ہے، اس کو خاموشی کے پردے میں رہنا ہی پسند ہے۔یہ اخلاقی پستی اور گراوٹ ہے کہ ہم اپنے منہ میاں مٹھو بنیں۔آج پزیرائی نہیں ہوئی تو کل ہوگی۔اگر آپ اچھا لکھتے ہیں تو آپ کو کسی بیساکھی کی ضرورت کبھی نہیں ہوگی۔

مشرف عالم ذوقی

بہت سی باتیں ہے کرنے کو، مانا آپ سوشل میڈیا پر لکھنے والوں کو معطون کریں۔یہ آپ کا جمہوری حق ہے لیکن یہ بھی بتادیں کہ ایک تخلیق کرنے والے سے پبلشر کتاب چھاپنے کے پیسے کیوں مانگتے ہیں؟ایک تخلیق کار کو رائلٹی تو خیر ہندوستان اور پاکستان میں ملتی ہی نہیں اوپر سے اس غریب سے پیسے بھی طلب کئے جاتے ہیں۔بے شک یہ دور ہی برقی ترسیل کا ہے، لوگ جو چاہیں چھاپیں اور نشر کریں انہیں آزادی ہے لیکن دوام صرف جینوئین فنکار کو ہی ملنا ہے۔

صفدر نوید زیدی

ISSN No. : 2395-2016

سیلف پروجیکشن یا پروموشن کچھ معیوب بات نہیں۔لیکن اپنے کام کے معیار سے لکھنے والے کو واقف ہونا چاہئے۔ قاری اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ اشتہاری جھانسے میں آجائے۔اچھے ادب کو پرموٹ اور مشتہر کرنا کیا برا ہے۔

☆ابرار مجیب

منصور خوشتر صاحب آپ کا سوال بہت اہم ہے۔جو جنوئن فنکار ہوتا ہے وہ انعام اعزاز کے لالچ سے بہت پرے ہوتا ہے۔اس کا ایوارڈ اس کے وہ قاری ہیں جو اسے پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔یہ تو ہماری روایت رہی ہے۔ غالب صاحب کے جانے کے بعد اور مولانا الطاف حسین حالی کے مرثیے کے بعد لوگوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے کیا کھویا ہے۔کمزور ادیب وہ سب حرکتیں کرتے ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ایسی صورت میں وہ حاشیہ پر جانے ہی والا ہے۔انعام اور اعزازات دینے والی کمیٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ صحیح فیصلہ کرے۔لیکن بھائی کیا یہ ممکن ہے۔سستی شہرت اور سیلف پروپیگنڈا بیساکھیاں ہیں۔وقتی طور پر تو اس سے فائدہ تو ہو سکتا ہے لیکن وقت تو ایک دن اپنا فیصلہ سنا دے گا۔

☆نورالحسنین

آپ نے وہی سوال ہمارے سامنے رکھ دئے ہیں جو برسوں سے میرے سینے میں سلگ رہے ہیں۔انشاءاللہ جلد ہی آپ کو اپنی روداد لکھ کر بھیجوں گا۔مگر ڈر اس حمام میں اپنے بھی کئی ادیب وشاعر ننگے نظر آئیں گے۔

☆شیدا بگھونوی

آپ کی پوسٹ پر پہلا سوال یہ ہے کہ کیا سیلف پبلسٹی اور خودنمائی کے دور میں جینوئین فنکار حاشیہ پر چلے جائیں گے ؟اس پہلے سوال میں ہی دو سوال پنہاں ہیں۔ایک تو سیلف پبلسٹی۔دوسرا خودنمائی۔آج کا دور ٹیکنالوجی کا دور ہے، ہائپر دور ہے بلکہ یوں کہیے ہائپر بھی ہے اور ہائبرڈ بھی۔اس میں ہر چیز کی رفتار تیز تر اور اشتراکی ہے۔بھلے وہ فزیکل ہو یا ان وزیبل۔خودنمائی جیسی صورت تو ادیبوں اور شاعروں میں شروع دن سے ہی رہی ہے، سو اس پر گفتگو ہمیں سوال کے دوسرے اہم حصے سے ہٹا دے گی۔یہ اہم حصہ سیلف پبلسٹی ہے۔آپ ایک طائرانہ نظر پوری دنیا میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک (جس میں ہم آپ شامل ہیں) پر ڈالیں۔کیا اب کوئی ایسا نظام روبہ عمل ہے جس میں پروپیگنڈا یا پبلسٹی کے بغیر کوئی شے انسانوں کی توجہ حاصل کر پائے؟

سو برس پہلے بھی مشاعرے اس امید پر کامیاب ہوتے تھے کہ فلاں فلاں معروف شاعر چونکہ موجود ہوں گے لہٰذا انھیں سننے جانا چاہیے۔رہا شہرت کے ساتھ فن کار کا معیاری کام اور اس کا قارئین تک پہنچنا۔یہ خالصتاً ایک کاروباری حیثیت اختیار کر چکا ہے۔کل بھی اور آج بھی اخبار میں جہاں ہفتہ واری ادبی صفحہ ہوتا ہے، وہیں تقریباً روزانہ فلم انڈسٹری کی ایک چلبلی سے شوخ خبر ضرور موجود ہوتی ہے۔ورنہ کاروباری نقطۂ نظر سے نقصان ہو سکتا ہے۔کتاب کی رونمائی، ادبی کانفرنس، بیرون ملک اسفار، انعامات (بھلے حکومتی سطح پر ہوں یا نجی فرموں کی سپانسر شپ ہو) بالآخر ایک کاروبار کی حیثیت سے مسلمہ حقیقت بن چکا ہے۔اس میں سیلف پبلسٹی کے طور پر مصنف یا اس

کے دوست (دوطرفہ ٹریفک) اعانت فرماتے ہیں۔کتاب کی سیلف پبلشنگ بھی ایک مکمل کاروبار ہے۔

اس ساری جدوجہد کا مقصد زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچنا ہے۔اب قاری کے پاس پہنچ کر اس ادیب وشاعر کا کیا حال ہوتا ہے وہ الگ کہانی ہے؟ ایک عام شخص سنجیدہ ادب نہیں پڑھتا۔وہ پاپولر ادب پڑھتا ہے اس کے پاس وقت نہیں کہ وہ اپنا ایک گھنٹہ مزید ضائع کرے۔(یہ قاری کا خیال ہے)، وہ کہانی یا فکشن صرف ذہنی تھکاوٹ دور کرنے اور ریلکس ہونے کے لئے پڑھتا ہے۔جس میں مواد اگر اس کی اپنی زندگی سے قریب ہے، تو اسے پسند کرے گا ورنہ رد کردے گا۔

رہا سنجیدہ ادب تو اس کے قاری بالکل الگ ہیں۔اکیڈمکس، طالب علم جو ہر چیز فکشن، نان فکشن پڑھتے ہیں (پاپولر ادب سے درسی کتب تک) اور پھر ادب سے متعلق ایک مخصوص حلقہ جنھیں ہم نقاد کہتے ہیں۔یہ ایک مخصوص تعداد ہے جو اپنے اپنے نظریاتی حلقے سے جڑی ہوئی ہے۔بہت کم ادیب وشعرا و نقاد اب کسی نظریاتی وجوہات پر ایک ساتھ ہیں۔اکثر و بیشتر مابعد جدیدیت کے سایے تلے آزاد ہیں۔ان کا ہر دم بدلتا سیاسی، معاشی وسماجی نظریہ آج کے ہائبرڈ دور کی بہترین مثال ہے۔

یہ وہ منظر نامہ ہے جو صرف کتاب سے جڑا ہوا ہے۔اب ایک نظر ورچوئیل یا سائبر دنیا، جس میں سوشل میڈیا سرفہرست ہے، پر ڈالے لیتے ہیں۔یہاں ایک بڑی تعداد (میں زور دے کر ''بڑی تعداد'' عرض کر رہا ہوں) جو ابھی طفلِ مکتب ہیں۔نوجوان ہیں، وہ ابھی تہذیبی واخلاقی اقدار اور سماجی روابط کو سمجھنے کے پوری طرح اہل نہیں۔ دوسری بات عمومی طور پر تعلیمی کمی کی وجہ سے ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کا شعور تو آ گیا ہے، لیکن زندگی برتنے اور ادب کو سمجھنے کا شعور ابھی دور ہے۔سو یہاں قارئین کی تعداد اور اس کا ادبی شعور کیس ٹو کیس بنیاد پر ہے۔ان حالات کے پیشِ نظر یہ کہنا کہ جنوئین ادیب وشاعر حاشیہ میں چلا جائے گا۔میں اس سے متفق نہیں ہوں۔معیاری کام کی ترسیل ان حوائجات کی مرہون منت نہیں۔ہاں اس کام کے قد و کاٹھ کا اندازہ کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔جو ہمیشہ سے ایک مسلمہ حقیقت رہی ہے۔۔۔آج لوگ منٹو، عصمت، قراۃ العین، ''آگ کے دریا''، ''اداس نسلیں'' اور کلاسیک ادب کی بات کرتے ہیں۔

اب رہے دو متفرق سوالات ہیں جو اس پوسٹ کا بہت اہم حصہ ہیں۔

کیا ایسے فنکار ہماری قدیم اور بلند ادبی روایات کو قائم رکھ سکیں گے؟ اور کیا اپنے عہد کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ادب زندہ رہے گا؟

سوال یہ ہے کہ قدیم کن معنوں میں استعمال ہو رہا ہے؟ اور اگر لغوی معنوں میں ہے، تو اسے قدیم ہی رہنا چاہیے۔ اس پر جدید کی نئی تہ خود اپنا راستہ بنائے گی۔اس ادب کو پہلے ہی ہم کلاسیک قرار دے چکے ہیں، سو یہ کلاسیک ہی رہے گا۔دوسری بات کہ بلند ادبی روایات۔جب ہم ادب میں نئے مغربی نظریات کے در آنے کو برا نہیں مانتے کیونکہ ہمارے ہاں سب کچھ ہو چکا ہے اگر کچھ نہ ہوا ہے، تو ایک بھی ایسا ادبی یا تنقیدی نظریہ ہم اردو ادب میں لانے

ISSN No. : 2395-2016

میں قاصر رہے ہیں، جسے عالمی مقبولیت ملی ہو۔ چلیے عالمی مقبولیت چھوڑیئے۔ اردو ادب میں ہی مقبولیت ملی ہو؟ کچھ ایسا اب تک نہیں ہوا ہے۔

آپ کے ہاں فاروقی صاحب، نارنگ صاحب، ہمارے ہاں وزیر آغا، عسکری و دیگر عصری نقاد کیا ایک بھی فلاسیفیکل ادبی نظریہ پیش کر سکے ہیں؟ نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ بنیادی عالمی نظریات کو یا تو نقل کیا ہے یا اس پر گفتگو کی ہے؟ تاہم نظریات کو جنم دینا ایک الگ بات ہے۔ میں اس لئے نوجوانوں کو اپنی نئی دنیا بسانے کے لئے کہتا ہوں۔

اب رہا دوسرا سوال؟ اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب معروضی عہد کا عرصہ طوالت بھی مختصر ہے۔ کوئی چیز ایک طویل مدت تک اپنے وجود کو قائم رکھنے کی طاقت و شکتی نہیں رکھتی۔ تاہم ادب وہی زندہ رہے گا، جس میں ماضی سے کشید کیا ہوا تجربہ عصری عہد کا آئینہ دار ہو اور مستقبل کے بارے میں ایک خفیف یا غیر محسوس طریقے سے عکسی تصور بھی رکھتا ہو، اور جمالیاتی سطح پر انسانی خوشبو رکھتا ہو۔ کیونکہ نئی نسل نیا قاری اپنے حال میں مست ہے اور یہ حال بہت پیچیدہ ہے، جس زمانے اور ماحول سے ہمارا معاشرہ گذر رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ انتشار و اختلال ہے۔ ایسے ادوار نے جب بھی ادب پیدا کیا تو یادگار ادب پیدا کیا۔ (یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسے سمجھنے میں وقت لگے گا) وہ فن کوئی فن نہیں، وہ ادب کوئی ادب نہیں، جو اپنے دور کے پورے عکس کا حامل نہ ہو۔ اور اگر ادب کو زندہ رہنا ہے تو اس میں مستقبل کے اشارے ضروری ہیں۔

آج میں مارکسی نظریات کے قریب تر ہونے کے باوجود یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ شاید مارکس کا نظریہ بھی کام آچکا ہے، بلکہ اپنا کام ختم کر چکا ہے اور یہی ''نابالغ بڈھے'' (یہ اصطلاح مجنوں کی ہے) جدیدیت کا سہارا لے رہے ہیں، کیونکہ نہیں اپنی بقا کے لئے انھیں کوئی نہ کوئی نیا سہارا چاہیے۔

میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہمارے لئے (ہم حاشیہ پر ہوں یا محض نکتہ کی مانند ہوں) یہ دیکھنا از حد ضروری ہے کہ کیا ادب میں میں عصری عہد کا عکس ملتا ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ عکس تخلیقی اور پروجیکٹو بھی ہے، اور مستقبل کی طرف اشارے رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ہم ایسی تخلیق کرنے کی اہلیت و سکت نہیں رکھتے تو ہمیں ایسی بصیرت کوری وزٹ کرنا ہوگا بجائے کہ ہم رائج اقدار کو کوسیں اور سارا بوجھ قاری پر ڈال دیں۔۔

☆نعیم بیگ ، لاهور پاکستان

ایسا جینوئن فنکار، جو سلف پبلسٹی یا خود نمائی سے خود کو دور رکھنے پر مطمئن ہو، آج کے زمانے میں چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ ایک آدھ استثنیٰ کو چھوڑ کر، جنھیں ''جنوئن'' کہا جا سکتا ہے ایسے اکثر و بیشتر فنکار خود نمائی پر خود کو مجبور کر چکے ہیں بلکہ بعض تو خوشامد پرستی، چاپلوسی، حق تلفی، ناانصافی، بدنظمی اور ادبی بد دیانتی کے ہم نوالہ و ہم پیالہ بن چکے ہیں۔ حالاں کہ خود نمائی اور سیلف پروجکشن آج کے ادیب کی مجبوری بھی ہے۔ ورنہ صرف زبان و ادب کی ترقی اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار، یعنی اپنے ذاتی مفاد کے بغیر آج ایسا کوئی نہیں ہے جو دوسروں کو سمجھنے،

ISSN No. : 2395-2016

سمجھانے اور پروجکٹ کرنے کی کاوشیں کرتا پھرے۔ اب کسی سموئل بیکٹ کے لیے کوئی مارٹن اسلن کہاں سامنے آتا ہے۔ نتیجتاً، سبھی اپنے اپنے پروجکشن پر مجبور بھی ہو چکے ہیں اور اسی کے تبادلے اور متبادل میں لگے ہوئے ہیں۔ خواہ پرنٹ میڈیا میں، خواہ الکٹرانک میڈیا میں۔ گرچہ پرنٹ میڈیا کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے کہ برقی میڈیا ہی اب آسان ترین اور حاوی میڈیا ہے۔ یاد رکھیں، ہم جب تک اپنے علاوہ دوسرے جینوئن فنکاروں کو خلوص، محبت اور عقیدت کے ساتھ نمایاں نہیں کریں گے، جینوئن فنکاروں کے ساتھ ساتھ خود ادب کا، ادب کے معیار کا، Merit اور عروج کا نقصان ہوتا ہی رہے گا۔

ایک آدھ کسی گوشہ گیر فقیر منش کو چھوڑ کر، اب کسی کو عملاً اسکی پروا نہیں ہے کہ وہ کم سے کم مگر اچھے سے اچھا، بڑے سے بڑا اور نئے سے نیا لکھنے والے کا کھل کر ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ آج کسی کو اسکا افسوس نہیں ہے کہ اسکے محلے، اسکے شہر، اسکے صوبے، اسکے ملک کے کسی پروگرام میں کوئی نابغہ ادب کیوں اور کیسے چھوٹ جاتا ہے اور اسے ساتھ لیے بغیر ہم کیسے اپنا جشن منا لیتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ایک شخص کی حیثیت سے ایک فنکار کا نقصان ایک شخص کا نقصان ہو سکتا ہے مگر ایک نابغہ ادب کا نقصان خود ادب کے نقصان کے نقطہ نظر سے پوری دنیا کا نقصان ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ادبی مارکٹنگ کے اس عہد میں یعنی آج، ہمارے آپ کے کام کا یہی ایک پیمانہ بچ رہا ہے اور وہ یہ کہ ادب پاروں کے معیار اور Merit ہی کی بنیاد پر تعین قدر کیا جائے! مگر افسوس، اسکا حوصلہ، اسکی اہلیت، اور اسکے لیے بھی فرصت ہمارے پاس بہت کم ہے۔

دوسری بات! کسی بھی عہد کا جو بڑا فنکار ہوتا ہے وہ اپنے فن پاروں میں نہ تو اپنے عہد کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ اپنی فنکاری کو، بلکہ بعض تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس سے آگے بڑھ کر عمارت کی بنیاد تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ خود یہ خاکسار اپنے فنپاروں میں حالیہ افکار و مسائل کی جڑوں پر لگاتار فوکس کرتا رہا ہے۔

☆**مبین صدیقی**

ISSN No. : 2395-2016

راجہ یوسف

افسانوی نظمیں

۱. سمجھوتہ

سمجھوتے
پر
دستخط کرنے ہیں
تو
آؤ
پہلے سمجھوتہ کرلیں

۲. سیراب

اس نے
میرے بدن کو
چوما ہے
جیسے
چومتی ہیں
کرنیں
جل ترنگ کرتے
پانی کو

۳. عصر حاضر

بزرگوں نے کہا تھا
راستے دو ہی ہیں
ایک اچھا
ایک برا
میں نے
اچھا راستہ چن لیا
اور
قتل ہوگیا

۴. لذتیں

بارشوں سے
جب
بدن جلے
تو
جان لو
تم پر
شباب
آیا ہے

۵. کل یگ

چپ رہو
کہ
اب
پتھر بولتے ہیں

----

٦. پہلا پیار

آ کہ
ملن ہے
آج
بارشوں، دھوپوں کا
چُپ کے
چھپ کے
ہم بھی دامن
تر کرلیں

۷. شباب

پانیوں میں
اُتر کر
تمہیں
احساس ہوا ہے کبھی
کہ
بدن، ہی نہیں
پیرہن بھی جلتے ہیں

----

۸. ناخدا

سفر سفر ہیں پتھر
دھوپوں سے شق ہیں چہرے
الٹی سیدھی لکیروں کا جال
جال میں الجھا
آج کا مسیحا

☆☆☆

خواب کے سائے

مرغوب آثر فاطمی
موبائل:9431448749

خواب تھا یا صداقتوں کا ظہور
حدِ فاصل تھی منہدم گویا
تھا وہ تالاب یا سمندر تھا
جس میں تھے اُجلے 'ہنس' لاتعداد
'ہنس' تھے یا کہ منتظر روحیں
ناز سے سطحِ آب پر گزراں
گردنیں خیزاں جانبِ افلاک
اور نظروں میں جستجو کا جنوں
تہہ کے موتی کی آرزو کی خلش
آسمان وزمین رخشندہ
شوخ ہواؤں کے جھونکے آ آ کر
پیدا کرتے تھے ارتعاش اکثر

اس سفیدی کے درمیان تنہا
اسودی نقطہ — محورِ روشن
سرپرستی کا افتخار لئے
بقعہ نور کی علامت وہ
تھا وہی مرکزِ یقین وجود
گرچہ روپوش تھیں ابابیلیں
سایہ افگن کبوتروں کے غول
بابِ تاریخ کے امیں گویا

منبعِ نور سے شعاع لے کر
'ہنس' اُڑ کر اسی سمندر سے
ندیوں کی طرف چلے خنداں
ارض کے گوشے گوشے میں جا کر
نورِ وحدانیت لٹانے لگے
قابلِ رشک تھا جنوں اُن کا
پیاس کی شدتیں تھیں بے معنی
پتھروں سے بھی پیٹ بھرتے رہے

حق کو لینے تھے جن سے کام بڑے
عظمتوں سے انہیں نواز دیا
ذہن میں انقلاب برپا ہوئے
روح حکمت سے اُن کا قرب ہوا
مائلِ بندگی، کفن بردوش
جیسے ہی مادّیت ہوئی حاوی
بولیاں اُن کی کوئی سنتا نہ تھا
اُن کی چیخوں سے آسماں نہ ہلا
ہاں! مرے خواب اُڑ گئے تا دَم

میرے مالک ہے التجائے کرم
واسطہ تجھکو تیرے نبیوںؑ کا
تیرے اپنے خلیل ابراہیمؑ
آل میں جن کے ہیں شہہ کونینؐ
اُن کے صدقے میں اے مرے مولیٰ
تو جو چاہے تو 'ہنس' دُھل دُھل کر
قعرِ ذلت سے پھر نکل آئیں
گردنیں پھر بلند ہوں اُن کی
اور آثر بھی حرم سے لوٹے تو
اپنی آنکھوں میں روشنی لے کر
اپنی سانسوں میں تازگی لے کر
گوہرِ علم و آگہی لے کر
مشعلِ امن و آشتی لے کر
آگہی اپنا رنگ دِکھلائے
پھیلتے جائیں خواب کے سائے

☆☆

ISSN No. : 2395-2016

احمد امتیاز
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

میں نے سوچا ہے۔۔۔

میں نے سوچا تھا
مایوسیوں کی یہ سیاہ پوش گھٹا
صبح کے جلوۂ انوار سے
چھٹ جائے گی
میں نے سوچا تھا
یہ جو دور تک پھیلی ہوئی تاریکی ہے
وقت کے ساتھ
یوں ہی نور میں ڈھل جائے گی
اور جب
دل میں سلگ جائیں گے الفت کے چراغ
شک وشبہات کے جذبات پگھل جائیں گے
میں نے سوچا تھا
یہ جو آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں عداوت کے
نقوش
رفتہ رفتہ ہی سہی
محبت میں بدل جائیں گے

ظلم اور جبر کی مٹ جائیں گی ساری شکنیں
الجھنیں زیست کی خود ہی سے سنور جائیں گی
لیکن اے دوست! یہ میری فکرِ عبث
کس طرح مجھ کو ستاتی ہے ہنوز
ہر طرف
خوف ہے، نفرت ہے، کراہیں ہیں
ٹوٹے دل ہیں تو کہیں الجھن ہے
زندگی آج بھی خود آپ سے شرماتی ہے
آنکھ سے آنکھ ملانے سے گھبراتی ہے
اس لئے اے دوست
میں نے سوچا ہے
یہ جو شعلے مرے سینے میں بھڑک اٹھتے ہیں
ان دہکتے ہوئے شعلوں کو بجھانا ہے مجھے
یہ جو دیوار ہے کینے کی عداوت کی
اور نفرت کی
اس کی ہر اینٹ کو قدموں میں گرانا ہے مجھے

☆☆☆



محمد شاداب عباسی

محمد شاداب عباسی لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک ایم فل ریسرچ سکالر ہیں جنکی بنیادی تعلیم حیاتیات میں ہے اور وہ اردو کی تدوین و ترویج کا شوق اسکے علاوہ رکھتے ہیں۔ ایشیا میں اردو زبان کی سب سے بڑی ویب سائٹ اردو پوائنیٹ پر شاعری اور صحت سے متعلق پروگرامز کے اینکر پرسن ہیں اور مختلف تنظیموں سے وابستہ مشاعروں کی نظامت بھی کرتے ہیں۔ آپ جامعہ گجرات میں اپنی ریسرچ اور تعلیمی سرگرمیوں کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ پتہ: مکان نمبر Email. 7694584@gmail.com Phone 00923037694584 سن فلاور سوسائیٹی جوہر ٹاؤن لاہور پاکستان

ہوس کا معیار

محبت نہیں ہے ہوس بھی نہیں ہے
نہ جانے یہ کیسا عجب سا ہے منظر
عجب کیفیت ہے۔
ہوس کیوں نہیں ہے۔۔۔؟
میں پہلے پہل تیری زلفوں کی لٹ سے پرے دیکھتا تھا
ترے ایک تل کی سبھی رونقوں کو
کہ جن پر تھا ماہتاب عاشق
مگر اے حسیں تیری بولی منافق
یہ مسکان جھوٹی فریبی ہیں باتیں
تو اب جا کے عقدہ کھلا ہے مجھے
اس بدن کی طلب کو مٹانے کو درکار ہے جو بدن وہ منافق نہیں ہے سو تیرا نہیں ہے
نہیں تجھ میں ہے ہی نہیں جاناں وہ ایکس فیکٹر کے جس پر ہوس منحصر ہے
ہوس کیوں نہیں ہے۔۔۔ہاں اب جا کے عقدہ کھلا ہے۔۔۔

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

عاتکہ ماہین
ریسرچ اسکالر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
atikaamahin@gmail.com

نظم

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟
اس نے جب نیم وا دریچے سے
جھانکنے کی ذرا سی کوشش کی
سنگ ریزے برس پڑے آکر
سرخ پانی میں ڈوبتا چہرہ
زرد سورج غروب ہو جیسے
اس پہ دوچند یہ دھوئیں کا ستم
جس کے لپٹوں میں گھر کے کوئی وجود
راہ ہستی سے نیستی کی طرف
ہو گیا گامزن خموشی سے
مسئلہ حل نہ ہو سکا پھر بھی
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھا تھا؟

ڈاکٹر سفینہ
ذاکر حسین دہلی کالج
دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۱

شہزادی

پریوں کے دیس میں
ہر سمت روشنی ہے
پھولوں کے اک شہر میں
چاندی کی وادیاں ہیں
زرّیں سی اک نہر میں
خوشیوں کی بس لہر ہے
خشبو کا ہاتھ تھامے
پیاری سی ایک لڑکی
مسکان اس کی ایسی
کھلتی کلی کی جیسی
آنکھوں میں خواب لیکے
نئی راہ ڈھونڈتی تھی
وہ سات رنگ کے سپنے
ہر شب کو بُنتی تھی
دھنک کی چنریا
اوڑھے وہ گھومتی تھی
تتلی کے جیسے اُڑ کر
پھولوں کو چومتی تھی
ہر سمت دوڑ کر وہ
خوشیوں کو باٹتی تھی
لوگوں کی زندگی کو
رنگوں میں ڈھالتی تھی
آنسو بنا کہ گوہر
لوگوں میں باٹتی وہ
محنت کا درس دے کر
،سب کی خودی جگاتی
اپنی خودی پہ سب کو
سوچنا سکھاتی
ان کی خودی سے ان کی
ملاقات بھی کراتی
اپنے ہی دم پہ سب کو
جینا بھی وہ سکھاتی
کیسا عجب ہے منظر
کیسا ہے یہ نظارہ
سب کی خودی سے روشن
اب دیس ہے ہمارا

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

غزلیں

بشیر چراغ
سرینگر (کشمیر)
7889943414

عجیب منظر پیچاں 'شجر' ہوا اور میں
خموش سایہ گل 'برگِ تر ہوا اور میں
زرا سی دیر میں جانے کہاں کہاں ہوں گے
یہ رہگذار غبار سفر ہوا اور میں
کسی بھی سمت سے رستہ نکال سکتے ہیں
تمام دشت سے ہیں باخبر ہوا اور میں
کھلا نہ کوئی دریچہ نہ کوئی دروازہ
صدائیں دیتے رہے رات بھر ہوا اور میں
کبھی بہار بھی آئے گی چمن میں تو
نظر بچا کے بھی جائیں کدھر ہوا اور میں
گرا وہ پیڑ بھی تھا سراغِ راہ چراغ
الجھ رہے ہیں یہ کس سے مگر ہوا اور میں

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

(ابرِ سحاب)، جمشید پور

مجھے اس غزل کی تلاش ہے میرے درد کو جو زبان دے
کہیں در بہ در ہو جو آرزو، اسے اک سکوں کا مکان دے
مجھے شہرتیں جو ملیں کبھی، یہی مخلصی ہو کبھی میرے
میرے قد سے اونچا غرور ہو، وہ کبھی نہ اتنا گمان دے
جو کماؤں میں وہ حلال ہو، جو کبھی نہ وجہ ملال ہو
کبھی مجھ سے ہو نہ گداگری، مجھے مفلسی میں بھی شان دے
مجھے ایک روٹی ملے اگر، ترے ساتھ اس کو بھی بانٹ لوں
جہاں صرف میں ہی سما سکوں، نہ وہ اتنا تنگ مکان دے
جو فریب دے، وہی شاہ ہے، وہی جھوٹ کا بھی گواہ ہے
میں کہاں سے لاؤں تلاش کر، وہ جو حق کے حق میں بیان دے
وہ عوام دے میرے ہند کو، جو بٹیں نہ فرقوں کے نام پر
وہ جو مندروں میں بھی گا سکے، جو ہوئی سحر تو اذان دے
وہی بے کلی، وہی تشنگی، بڑی تلخ ہے یہاں زندگی
میرے ذہن و دل کو مٹھاس دے، مجھے اردو جیسی زبان دے

☆☆☆

ڈاکٹر حنیف ترین

نئی دہلی، 9971730422

مصیبتوں کو میرے گھر کا جب پتہ دینا
میرے خدا مجھے لڑنے کا حوصلہ
اڑان ٹوٹنے مری فکر کی جہاں یارب
وہاں نظر کے پروں کو نئی فضا دینا
قضا کے خوف سے احساس سرد ہیں جن کے
انھیں کڑی سے کڑی دھوپ کی سزا دینا
جو یاد بن کے مرے خون میں مچلتا ہے
اسے بھلا سکوں ایسی کوئی سزا دینا
اندھیری رات کی سڑک پہ چاند ابھر آئے
خدا یا لب کو مرے ایسی اک صدا دینا

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

ڈاکٹر جمال اویسی

ہاں مرے پاس جو قاصد ترا آیا ہوتا
زندگی جال نہ بُنتی نہ یہ پردا ہوتا

ڈوب جاتے سبھی چہرے ترے دریاؤں میں
میں ہی کچھ بن کے ابھرتا مرا چہرہ ہوتا

خار زاروں سے الجھتے رہے بھائی میرے
عمل زیست کو اک بار جو سمجھا ہوتا

ہیں تصور میں نئی منزلیں غش کھاتی ہوئی
میں کسی موڑ پہ کچھ دیر جو ٹھہرا ہوتا

جوئے کم آب نے محصور کیا ہے خود کو
یہ روانی میں اگر ہوتا تو دریا ہوتا

☆☆☆

کوئی کیا سمجھے مرا کارِ جنوں کیسا تھا
جینے مرنے کے تماشے میں فسوں کیسا تھا

جنبشِ لب کا خطاوار تھا میں چپ ہی رہا
جو مخاطب تھا مرا اس کو سکوں کیسا تھا

نقش کو گردشِ دنیا نے بدل ڈالا ہے
ہائے انسان ترا فکر دروں کیسا تھا

خواب پیمانۂ امروز کی سولی پر چڑھا
کس سے جا کر کہوں پروردۂ خوں کیسا تھا

ہاتھ باندھے ہوئے مجرم کی طرح لایا گیا
میں کہ نائب تھا ترا خوار و زبوں کیسا تھا

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

ڈاکٹر آفتاب اشرف
ایسوسیٹ پروفیسر و صدر
شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ

بظاہر شاعری کرتا ہوں غزل کہتا ہوں
دل کی آواز کو سنتا ہوں غزل کہتا ہوں

کوئی سنتا ہی نہیں دور پریشاں کی صدا
میں اسی دور میں رہتا ہوں غزل کہتا ہوں

مجھے فرصت ہی کہاں ہے کہ دیکھوں تم کو
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوں غزل کہتا ہوں

بحرِ ظلمت نہ رہے خوفزدہ کیوں مجھ سے
ناؤ روشنی کی رکھتا ہوں غزل کہتا ہوں

شاعری بس میں نہیں ہے میرے اشرفؔ لیکن
زندگی لفظ میں رکھتا ہوں غزل کہتا ہوں

☆☆☆

ہریش کُمار منّی بھدرواہی
(جموں وکشمیر)
9596888463

ملاوٹ قانون کے کُچھ اِدھیکاری ہیں
سیاست کے لوگ بھی کُچھ بلتکاری ہیں

بھروسہ اب تو کسی پر رہا ہی نہیں ہے
یہ داڑھی والے کیا یہ تلک دھاری ہیں

نہ جانے کس بھیس میں چھپ کے بیٹھے قاتل
بظاہرہ آتے نظر وہ تو بھیکاری ہیں

عزّت لُوٹ کے اِس طرح، دُور لے جا کہ کہیں
نہ جانے معصوم کتنی ہی بچّیاں ماری ہیں

یہاں پر قانون کیسے منّی نافذ ہیں؟
یہاں لُٹتی روز آصیفہ کیوں بچاری ہیں

ISSN No. : 2395-2016

سفیر صدیقی، نئی دہلی (انڈیا)

میں تو راضی ہوں، تو کب اور کہاں چاہتا ہے
بے جھجک بول اگر تو مری جاں چاہتا ہے
اس کی چنگاریاں جب توڑنے لگتی ہیں دم
منھ چھپانے کے لیے شعلہ دھواں چاہتا ہے
وہ نہ سمجھے گا مرا کربِ تبسم جو شخص
جسم پر روح کے زخموں کے نشاں چاہتا ہے
عشق کہتی ہے جسے اہلِ تجارت دنیا
اس تجارت میں مرا شوق زیاں چاہتا ہے
شہر کے شہر جلا ڈالے ہیں جس ظالم نے
آج وہ ظلم پسند امن و اماں چاہتا ہے
موت شاید کہ لگا دے مرے خرمن میں آگ
ہیزمِ ہجر کوئی برقِ تپاں چاہتا ہے
روز کانٹوں سے کھرچتا ہوں بڑھاپا ان کا
دردِ دل میرا، مرے زخم جواں چاہتا ہے
رسمِ دنیا ہے کہ ہر چیز ہے فانی، ورنہ
کب کوئی پھول یہاں فصلِ خزاں چاہتا ہے
راز کچھ، راز ہی رہ جائیں تو بہتر ہے سفیر
تو کہ ناداں ہے جو ہر غم کا بیاں چاہتا ہے

☆☆☆

پروفیسر خالد محمود
نئی دہلی
09811381606

بہت آسان تھا جینا ہمیں سیلاب سے بچ کے
نکل آتے اگر اس دیدۂ پُر آب سے بچ کے
اُفق سے تا اُفق دھڑکن بسی ہے ذرے ذرے میں
کوئی بھی رہ نہیں سکتا دلِ بے تاب سے بچ کے
اسے دیکھیں تو ساحل توڑنے لگتی ہے موجِ خوں
نہیں دیکھیں تو جائیں بھی کہاں مہتاب سے بچ کے
تمہاری طرح ہم بھی واقفِ آزارِ دنیا ہیں
مگر ہم رہ نہیں سکتے کبھی احباب سے بچ کے
سفینے سے مرے کچھ اہلِ ساحل خوش نہیں رہتے
کہ جب دیکھو نکل آتا ہے یہ گرداب سے بچ کے
خدا رکھے بزرگوں کو ابھی زندہ سلامت ہیں
مگر بچے بھاگے ادب آداب سے بچ کے
ہماری زندگی تہ خانۂ زنداں کی صورت ہے
یہیں رہتے ہیں خالدؔ مہرِ عالم تاب سے بچ کے

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

ڈاکٹر احسان عالم، دربھنگہ

دل کی خواہش ہے کہ گزرا ہوا منظر دیکھوں
زندگی کے میں ورق سارے الٹ کر دیکھوں

رہتا ہوں اوڑھے ہوئے دھوپ کی چادر دن بھر
شب میں گھر آؤں تو تپتا ہوا بستر دیکھوں

ان کی پرچھائیاں کرتی رہیں مجھ سے باتیں
ان کی یادوں سے در و بام معطر دیکھوں

ننگے پاؤں تو میں چلتے ہوئے تھک جاتا ہوں
حوصلہ کہتا ہے میں جانبِ رہبر دیکھوں

منتظر چاند ستارے بھی ہیں میرے لیکن
شوق کی راہ میں بکھرے ہوئے پتھر دیکھوں

نام رہ جائے زمانے میں مرا بھی احساںؔ
عزم اپنا ہے کہ پیچھے نہیں مڑ کر دیکھوں

☆☆☆

م، سرورؔ پنڈولوی

بہت حساس ہونا بھی علامت بے حسی کی ہے
ترے برباد ہونے میں ہر اک سازش اسی کی ہے

تمہاری حق نوائی پر ہر اک انگلی اٹھاتا تھا
قیامت اب ہے کیوں برپا جو حالت خامشی کی ہے

عدو کو بھول جاؤ گے، جو میرا حشر دیکھو گے
میری طرح بتاؤ تو جہاں میں دوستی کی ہے

کبھی ہنستے ہوئے چہرے بہت مغموم ہوتے ہیں
کبھی آنسو نکل آنا نشانی بھی خوشی کی ہے

ترے فکرِ سخن کی بس یہی معراج ہو سرورؔ
غزل ایسی کوئی کہہ دو لگے جو میر جی کی ہے

☆☆☆

عمر فرحت

پورا نام: محمد عمر فرحت، قلمی نام: عمر فرحت، تاریخ پیدائش: یکم۔ مارچ 1986
تاریخ مقام: راجوری، تعلیم: بی اے، تصانیف: نراکار (ناولٹ) شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے
ہندوستان و پاکستان کے مختلف اور اہم اخبارات و رسائل میں تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں ادارت: سہ ماہی تفہیم
پتہ: Umar Farhat
MOB. 185131. J&K. 04. RAJOURI. NO. WARDRIAD, ITI. Opp.
09055141889

قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے
آنکھ سے سورج نکل رہا ہے

ساون انگڑائی۔ لے کر
جسم سے تیرے پھسل رہا ہے

تیرے ببول کا زہریلا خار
میرے دل سے نکل رہا ہے

وہ چتکبرا زہریلا سانپ
کینچلی پر کیوں پھسل رہا ہے

چاندنی کا وہ پیکر فرحت
دھوپ پرانی نگل رہا ہے

☆☆☆

کون یہ بن میں رہتا ہے
تو یا تیرا سایا ہے

یہ جو سیہ سانپ کا پھن ہے
بالکل تیرے جیسا ہے

تیرے کھنڈر جسم کی چھت پر
کس مکڑی کا جالا ہے

میری خشک ندی سے پوچھ
جیون کتنا پیاسا ہے

بے رحم سمے کا سورج
میری پسلی سے نکلا ہے

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

پروفیسر طرزیؔ، دربھنگہ، بہار

منظوم تبصرے

دبستانِ نعت کا شمارہ ۲

دولتِ بے بہا ہے دبستانِ نعت
دفترِ دلکشا ہے دبستانِ نعت
جامِ حُبِّ نبی کا ہی پاتے جہاں
ایسا اک میکدہ ہے دبستانِ نعت
اسوۂ پاک کا ترجماں ہر ورق
تحفۂ ایماں فزا ہے دبستانِ نعت
روشنی پھیلی عالم میں توحید کی
روح پَرْوَرْ فضا ہے دبستانِ نعت
جس سے صالح عقیدے کا ہوتا فروغ
ایسی محکم بنا ہے دبستانِ نعت
سیرتِ مصطفیٰؐ کی بیاضِ حسیں
دردِ دل کی دوا ہے دبستانِ نعت
اِس کی نعتوں کو پڑھیئے بھی شام و سحر
دافعِ صد بلا ہے دبستانِ نعت
عشق بھی کچھ اِسی سے جلا پا گیا
نور کا دائرہ ہے دبستانِ نعت
پڑھیئے با چشمِ نم، دیکھیئے پھر اثر
مصطفیٰؐ کی ثنا ہے دبستانِ نعت
اللہ اللہ وہ جلوہ سامانیاں
حشر جس سے بپا ہے دبستانِ نعت
مرحبا مرحبا سعیؔ سیفیؔ، سراجؔ
خواب سچ ہوگیا ہے دبستانِ نعت
ہیں یہ دیوانے دونوں بڑے کام کے
جس نے ثابت کیا ہے دبستانِ نعت
جس سے تکمیلِ شانِ نبوّت ہوئی
وہ ضیائے حرا ہے دبستانِ نعت
پڑھ کے عالم بھی طاری ہے اک وجد کا
جب سے طرزیؔ مِلا ہے دبستانِ نعت

☆☆☆

پروفیسر طرزی، دربھنگہ

ڈاکٹر عالمگیر شبنم کی کتاب ''اردو ناول کا ارتقا''

مرحبا ہے نام عالمگیر شبنم آپ کا — ہیں معلم، اِس لئے ہے لکھنا پڑھنا مشغلہ
''ارتقا'' جو ''اردو ناول'' کا کتاب ہے آپ کی — اس سے تحقیقی بصیرت ہوتی ظاہر خوب ہی
ڈگری پی ایچ۔ڈی۔ کی ٹھہری ماحصل تحقیق کا — پھرتے ہیں ساغر بکف از میکدہ تا میکدہ
یہ ہے دو سو آٹھ کُل صفحات پر پھیلی کتاب — کرتی ہے ڈپٹی نذیر احمد سے آغازِ نصاب
جائزہ، اُنیس سو چھتیس ہی تک کا لیا — عہدِ زرّیں صنفِ ناول کا جو ہے مانا گیا
پیش لفظ اس پہ مصنف نے ہے لکھا دلکشا — پانچ تقریظوں سے بھی ہے یہ کتاب آراستہ
کاوشِ شبنم پہ ہے رائے امام اعظم کی بھی — مختصر ہوتے ہوئے بھی اہم مانی جائے گی
فنِ ناول پر ہے اُس کے بعد اک کاوش گراں — نکتہائے صنفِ ہٰذی کا جو ہے دلکش بیاں
آئے ہیں زیرِ قلم اُنیس جو ناول نگار — صنفِ مذکورہ کا حاصل اُن کو ہے بھی افتخار
شاد، حالی تو پریم چند، سرشار و شرر — راشد الخیری و عباسِ حسینی دیدہ ور
ہو رشیدِ النسا، طیّب علی ڈپٹی نذیر — مرزا رسوا و عزیز احمد تو سجادِ ظہیر
عصمتِ چغتائی، مرزا ہوش تو مستور ہی — پھر کرشنِ چندر اور سجاد تو طیب علی
جن کا ہے مرزا محمد ہی سعید ہاں نام بھی — ارتقائے اردو ناول کے ہیں ضامن یہ سبھی
جائزہ تنقیدی یہ موصوف کا ہے خوب ہی — محنتِ موصوف کو اس میں بڑا ہے دخل بھی
رکھا ہے تنقید کا معیار بھی پیشِ نظر — جستجوئے خوب تر کا نقش یہ ہے معتبر
جائزے میں آپ کے پاتے ہیں وصفِ اعتدال — ذہن میں قاری کے پیدا ہوتا ہے کیفِ جمال
سادگی اسلوب کی اِن کے ہے اک خوبی بڑی — معنوی ترسیل جس سے ہوتی ہے آسان بھی
نقص کمپوزنگ کے اِس میں پائے جاتے بیشمار — ہار میں پھولوں کے شامل ہوگیا ہو جیسے خار

ڈاکٹر شبنم! مبارک آپ کو ایسی سعی
آپ کے گنجینۂ دانش کا یہ گوہر بڑا ہے قیمتی

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

ترقی پسند شعری فکر اور اردو شعرا: پروفیسر شارب ردولوی، صفحات: 368، سائز: ڈیمائی، قیمت: چار سو روپے، پتہ: C95 سیکٹر E، علی گنج لکھنؤ (یوپی) 226024

مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع شدہ 2018ء کی یہ نئی کتاب پروفیسر شارب ردولوی کے وسیع نقطۂ نظر کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں ترقی پسند فکر اور ترقی پسند شعراء پر مضامین ہیں جن کے عنوان اس طرح ہیں:

"ترقی پسند نظم کی فکری بنیادیں، ترقی پسند شعری فکر اور اردو شاعری آزادی کے بعد، ترقی پسند شعری فکر اور مجاز، فیض احتجاجی شاعری کا نیا استعارہ، مطالعہ جوش، احتجاج اور مزاحمت کی منفرد آواز جوش ملیح آبادی، ایک کم سخن کم گو آمیز شاعر: جذبی" مخدوم کی نظموں کا آہنگ" ایک دلکش آہنگ کا شاعر وامق جونپوری، ایک درویش انقلابی نیاز حیدر، کیفی اعظمی: اردو شاعری کی پر اثر آواز، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر کی شعری جمالیات: شمیم کرہانی کا نظریہ شاعری" سردار جعفری، ترقی پسند شعری فکر کا ایک رخ، آل احمد سرور شعری نظریات اور شاعری اردو غزل ۱۹۴۷ء سے نئی صدی تک، غزل میں ایک نئی روایت جمیل مظہری، جدید غزل اور عرفان صدیقی، اشفاق حسین: ترقی فکر کے نئے ابعاد، منموہن تلخ ایک منفرد آواز، رفعت سروش، نامی انصاری ایک خوش گو شاعر، سالک لکھنوی، محسن زیدی، خمار بارہ بانکوی، ایک مقبول غزل گو شکیل بدایونی اور شاہ اقبال صابری رودلوی"۔

شارب ردولوی کی تنقید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کو مسائل کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے ہیں اور تخلیقات کے بطون سے تہذیبی، ثقافتی اور سماجی عکاسی کو واضح کرتے ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب کے مضامین سے انسان دوستی، محبت، رواداری اور مساوات پر روشنی پڑتی ہے۔ تزکیہ نفس سے لے کر ظاہر پرستش کے انحراف، جبر و اختیار اور باطن کی پاکیزگی کو وہ نئے فکری رویے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ معاشیات اور خود تعمیری کے وسیع تصور کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ عشقیہ اور رومانی شاعری کی شدت کو بھی محسوس کراتے ہیں۔ آزادی کی خواہش اور سماجی برابری کی آرزو رکھنے والے شاعروں کی صورت گری کرتے ہیں اور زبان کی شعری تبدیلی کی اثر آفرینی کی ترسیل تک پہنچتے ہیں۔ ترقی پسندی کی مقبولیت کا جائزہ لیتے ہوئے تحریک آزادی کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے شارب ردولوی اجمالی جائزہ اس طرح لیتے ہیں:

"۱۹۰۵ء میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم اور اس کے ردعمل میں رونما ہونے والے

حالات۔ ۱۹۲۱ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ جس کے ردعمل میں جلیاں والا باغ کا سانحہ ہوا۔ کمیونسٹ پارٹی کا قیام، ہجر کی تحریک جس کے تحت بہت سے لوگوں کی روس اور افغانستان ہجرت، ۱۹۲۷ء میں پنڈت نہرو کا روس کا سفر، ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا، ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کو ہندوستان کی آزادی، پاکستان کا قیام اور تلنگانہ تحریک، یہ وہ اہم سیاسی وسماجی موڑ ہیں جس کی تفصیل کو ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند فکر کے سلسلہ میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔"

آزادی کے بعد جو حالات رونما ہوئے اور بنیادی انسانی قدروں کی جیسی پامالی ہوئی اور اسکے تحت نئے موضوعات، نئے لسانی، علاقائی اور ردولوی نے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ نمو کے نئے برگ وبار کو نمایاں کیا ہے اور کئی نئے سوالات کھڑے کر کے عصریت کی اثر انگیزی تک رسائی حاصل کی ہے۔ ذات و کائنات کے حصار پر دوربین نگاہ ڈالنے کے ساتھ انہوں نے فکر و خیال کی وسعت پر خصوصی توجہ دی ہے۔

دمِ واپسیں: عبدالصمد صفحات: ۲۲۶، سائز: ڈیمائی، قیمت: دوسو روپے
۱۲۱۲اے، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ۔800010 (بہار)
مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

عبدالصمد کے پندرہ نئے افسانوں کا یہ مجموعہ ۲۰۱۸ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں جہاں تہذیبی روایت سے جڑاؤ ہے وہیں نئے دروازے وا ہونے کا فکری محور بھی ہے۔ احساسات کے خارجی اثرات، داخلیت کی آنچ اور جمالیات کی اعلیٰ سطح کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عبدالصمد بند کھڑکیوں کو آہستگی سے کھولنا جانتے ہیں اور تازگی کے لمس کے عمل کو ظاہر کرنے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ شناسائی کے آنگن میں دبے پاؤں چلتے ہوئے وہ جہد، عصری تقاضے، فکری پیمانے اور بدلتے موسموں کے پس منظر کی گرمی کو بیدار ذہنی سے بیان کرتے ہیں۔

''دمِ واپسیں''، رائیگاں، ٹھیکرا لا جواب، گیان، اعتراف، سدباپ، بھرم، سونے کے چاول، فریم، ہارا ہوا کھلاڑی، بنی ہاؤس، حربے، باسی خبر اور آ گاہی'' جیسے افسانے میں ہفت اقلیم پوشیدہ ہے۔ زندگی کے وہ لمحات کرب آمیز بنے ہیں جو تلخیوں کو گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ افسانہ ''ہارا ہوا کھلاڑی'' میں ایک موذن کے بیٹے اور ایک پیش امام کی بیٹی کی کہانی ہے۔ یہ دونوں بچپن سے ساتھ کھیلے بڑھے تھے۔ پھر جب لڑکے کے بازوؤں کے چشمے میں مچھلیاں تیرنے لگیں اور لڑکی کے سینے پر دوپٹہ آ گیا تو لڑکی کا گھر سے نکلنا بند کر دیا گیا۔ لڑکے کی زندگی میں مایوسی بھر گئی، پریشان رہنے لگا اور پڑھائی سے دلچسپی کم ہوگئی۔ ان ہی دنوں جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو لڑنے نے اسے سمجھایا ''صحن میں بلا مقصد تمہیں چکر لگاتے دیکھتے ہیں، اچھا نہیں لگتا، خوب پڑھو لکھو اور بڑے آدمی بنو''

لڑکے نے اس جملے کو گرہ میں باندھ لیا اور وہ کامیابی کے زینے طے کرنے لگا۔ بہت بڑا کرکٹر بن گیا۔ اس دوران لڑکی کی شادی ایک مولوی سے کر دی گئی اور وہ دور چلی گئی۔ لڑکا اس کے تصور میں کھویا رہتا۔ اسے یقین تھا کہ

ISSN No. : 2395-2016

لڑکی کی دعاؤں کی وجہ سے وہ اتنی کامیابی حاصل کر سکا ہے اور اسے نئی توانائی ملی ہے اور وہ ترقی کی اونچی منزل کو چھورہا ہے۔ نجمی ایک دن اسے پتہ چلا کہ لڑکی پانچویں بچے کو جنم دیتے ہوئے موت کی وادی میں چلی گئی ہے۔ پریشانی کے عالم میں وہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ شوہر گھر پر موجود نہیں تھا۔ گھر کیا تھا آسائش و آرائش کی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ بچوں سے تعزیت کے دو بول بولتے وقت وہ اپنے دل کی کئی خلش کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''بیٹے تمہارے پاس اردو کے کون کون سے اخبار آتے ہیں......''

ایک بھی نہیں...............''

''ریڈیو، ٹی وی وغیرہ۔''

''ٹی وی کو ابا ایک شیطانی ڈبہ مانتے ہیں۔ ریڈیو ہے مگر اسے صرف ابا سنتے ہیں اور وہ مجھے صرف بی بی سی کی اردو خبریں.......''

''تم لوگوں کو کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''

''ابا کہتے ہیں کہ کرکٹ ایک غیر شرعی اور کافرانہ کھیل ہے۔''

عبدالصمد کے افسانے ایسے ہی سچائی بھرے ہوتے ہیں۔ یہ دراصل بیداری کی علامت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض عادت اور علت پر احتجاج کو سامنے لاتے ہیں اور اخلاقی اور معاشرتی تصور کو ایک واضح شکل دینا چاہتے ہیں۔ عبدالصمد خاص وارداتوں سے جامع سچائی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی ایک مفروضہ متعین نہیں ہے بلکہ ہر افسانے میں مواعظمی مقصد عوامی ابلاغ تک پہنچنا ہوتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل نشانیاتی ہے جس میں حقیقی واقعات کی عکاسی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ زمین سے ناظم جڑے رہنے کی بات، پانی کی طاقت کا ذکر، درخت کا استحکام، وطن کے امکانات پر دستک اور بہت سی تشبیہیں اور استعارے ہیں جنہیں بیان کر کے عبدالصمد نے اپنے افسانوں کا مزاج بنایا ہے۔ جس میں جذبات اور نظریے کا نیا سورج ہے۔ (ہرگانوی)

۲۰۱۸ء میں لندن سے چھپی یہ خوبصورت، دیدہ زیب اور بیحد معیاری کتاب متوجہ کرتی ہے۔ منور احمد کنڈے بنیادی طور پر شاعر ہیں اور برطانیہ میں رہتے ہیں۔ وہ تہہ نشیں معنویت کے شاعر ہیں اور شدت احساس و حالات سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ اس لئے انفعالیت کے اکتساب سے لذت حاصل کرتے ہیں۔

نذیر بے نظیر: منور احمد کنڈے

صفحات: ۴۸، سائز: ڈیمائی، قیمت: تین پاؤنڈ (یو کے)

Sewera Academy, 86, RM 10, 8UT (U.K.)

ڈاکٹر نذیر فتح پوری کئی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور بسیار نویسی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت اس لئے بھی معتبر اور طمانیت بخش ہے کہ وہ سبھی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور جمالیاتی جہت کی آمیزش سے کئی اصناف کا منظر نامہ تشکیل دیتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی بیحد پرانے اور کلیدی اہمیت کے حامل ادبی صحافی بھی ہیں۔

منوراحمد کنڈے کی نذیر فتح پوری سے دوستی ہے۔افکار ونظریات کو جذب کر کے انہوں نے نذیر فتح پوری کو پونا لایا جائے۔اردو قرار دیتے ہوئے ایک سونو اشعار کی نظم کہی ہے جس کاروانی ٹرانس لیشن بھی اس کتاب کی زینگ ہے۔اس Transiteraltion سے غیر اردو داں قاری تک پہنچا جاسکتا ہے۔ برطانیہ کی نوجوان نسل رومن Transtiteration کو پسند کرتی ہے، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ایسے میں منوراحمد کنڈے نے اپنے اعجازن کوئی سطح تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔تاکہ یہ مختصری کتاب دواحی حیثیت کی ضمانت بن سکے۔

منوراحمد کنڈے نے نقش ثبات دوام سے کام لے کر ذہنی تحفظات کو وسیع افق کے خلوص کا حصہ بنایا ہے:

لفظ کے گلزار ہیں اور تتلیوں پہ ہے بہار
ان بہاروں سے ہی اجلے آپ کے لیل و نہار

Lafz kay gulzar hain aur titlion pe hai bahaar
Inn bahaaron say hi ujlay aapkay lail o nahaar

جستجوئے شوق میں ان کا قلم ہے تیز گام
منزلیں اجلی ہیں ان کی اور سفر کو ہے دوام

Justajoo-e-shauq main unn ka qalam hai tez gaam
Manzilein ulee hain unn ki, aur safar ko hai dawaam

دوست ان کے معترف ہیں، معترف اغیار بھی
عظمتوں کی سب نے رکھی ان کے سر دستار بھی

Dost unn kay motarif hain, motarif aghyaar bhi
Azmaton ki sab nay rakkhi unn kay sar dastaar bhi

ان کو دیتی ہیں صدا اجلے یقیں کی بتیاں
سبز رہتی ہیں ادب کے ہر شجر کی پتیاں

unn ko deti hain sdaa ujlay yaqeen ki battiyaan
Sabz Rahti hain adab kay har shazar ki pattiyan

نذیر فتح پوری پر منوراحمد کنڈے کے اشعار یا ان کی مسلسل نظم آفاقیت کی ترجمان ہے۔اس میں حسن و صداقت ہے، انسان دوستی ہے، نئی نسل کے لکھنے والوں کے لئے بشارت ہے، ایک فن کار کے نازک گوشوں تک رسائی ہے اور بازآفرینی اور نذیر فتح پوری کی تخلیقی قوتوں کے عناصر ہیں۔(ہرگانوی)

☆☆☆

ISSN No. : 2395-2016

☆سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب: عطا عابدی صفحات: ۳۰۴، سائز: ڈیمائی، قیمت: چار سو روپے
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، 80004 (بہار) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر عطا عابدی ان دنوں دہلی کے ماہنامہ ''افکار ملی'' سے وابستہ تھے جب سوویت یونین کی برخاستگی ہوئی تھی اور کمیونزم کی ناکامی سامنے آئی تھی۔ سقو ماسکو سے متاثر ہوکر انہوں نے ۱۹۹۲ میں ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جو سات سوالات پر مشتمل تھا۔ ان سوالات کے جواب جس ترتیب سے آتے گئے وہ عطا عابدی نے ''افکار ملی'' میں شامل کرتے گئے۔ جواب کا یہ سلسلہ جون ۱۹۹۲ء سے شروع ہوکر جولائی ۱۹۹۳ء تک چلا جسے کافی مقبولیت ملی اور خوب سے خوب تر نظریے اور مباحث سامنے آئے۔ اس نظریاتی زوال پر لکھنے والوں میں بالترتیب غلام ربانی تاباں، محمد حسین، قمر رئیس، عنوان چشتی، مظفر حنفی، محمود ہاشمی، قرۃ العین حیدر، گوپی چند نارنگ، کمال احمد صدیقی، عبدالمغنی، ابن فرید، ناوک حمزہ پوری، اویس احمد دوراں، شمس الرحمٰن فاروقی، طیب عثمانی ندوی، حفیظ بنارسی، منصور عمر، علیم اللہ حالی، الیاس احمد گدی، عابد کرہانی، ف س اعجاز، شہپر رسول، محمد بدیع الزماں، مجروح سلطانپوری، مظہر امام، مخمور سعیدی، مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی، کبیر احمد جائسی، سہراد منظر، سلیم شہزاد، طلحہ رضوی برق، سہیل احمد زیدی کے مکالمے اور جواب شامل تھے۔ ردعمل ظاہر کرنے والوں میں ذکاء الدین شایاں، خان فہیم، قاضی عبدالباسط، جمال اویسی، راشد انور راشد، وارث ریاضی، شین مظفر پوری، عبداللطیف اعظمی، سلیم انصاری، ناز قادری، مجاز نوری، عزیز مراد آبادی، محمد احسن دربھنگوی اور مرتضی اظہر رضوی کے نام اہم ہیں۔ اور مکتوبات کے ذریعے اپنی بات اور فکر لکھنے والوں میں شاہ رشاد عثمانی، معین احسن جذبی، منظر کاظمی، نعیم صدیقی، افتخار امام صدیقی، محمود عالم، ابن فرید، م ق سلیم، منیر سیفی، محمد بدیع الزماں، محمد انیس، شہزاد منظر، وصال احمد، عبدالحمید، محمد احسن دربھنگوی، سلیم مقصود، ابراہیم اشک، نعمت اللہ خاں، طلحہ رضوی برق، شہپر رسول، عدنان مُیر، شاہ رشاد عثمانی، شہزاد سلیم اور مبین صدیقی ایسے نام ہیں جنہوں نے صحیح وغلط نظام ہائے حیات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تمام نام ادب کے مختلف نظریے کے ماننے والے ہیں۔ ان سب ردعمل کا یہ مباحثہ کا جائزہ سید عبدالباری نے کیا ہے۔ جنہوں نے صرف اسلام مذہب کی عینک سے اسے دیکھا ہے اور ادب اور ترقی پسندی کے منظرنامے کو انہوں نے نظر انداز کیا ہے۔ اس سارے مواد میں سب سے کمزور گمراہ کن اور بھٹکاؤ کا شکار سید عبدالباری کا جواب ہے۔ انہوں نے نہ تو اشتراکی دانشوں کو سمجھا ہے اور نہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشویزم کے استدلال کی راہ کو جانا ہے۔ حقائق ودلائل سے صرف نظر کرتے ہوئے وہ ایمان کی گہرائی کو ناپتے ہیں اور اسی اسٹرکچر کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر عطا عابدی نے یہ سارا مواد ۲۹۶ صفحے میں سمیٹا ہے اور ایک اہم اور صداقت بھری کتاب اردو کو دی ہے جو اپنے موضوع پر پہلی دستاویز ہے۔ تخلیق اور نظریے اس تجزیے سے عصری تقاضے سامنے آتے ہیں۔ مکتبہ فکر اور رجحان کا گراں قدر تحفہ ہمارے لہو کو گرماتا ہے اور ذہنی وجذباتی ادبی، سیاسی اور معاشی وثقافتی کش مکش سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان تمام مباحث میں معلومات ہے۔ ٹکراؤ اور تضاد بھی ہے۔ ساتھ ہی جنبش اور روابط کی دریافت بھی

ISSN No. : 2395-2016

ہے۔ اس میں صرف نظریات کے فروغ کا تذبذب نہیں ہے بلکہ کھلی فضا میں اصلاحی اور انسانی بیداری کی ایمانداری کی دستک بھی ہے۔

کتاب کے آخری میں صفحہ ۲۹۷ سے ۳۰۴ تک عطا عابدی کا مکمل تعارف ایک طرح سے ترتیبی نما عالمانہ تصدیق نامہ ہے۔ (ہرگانوی)

☆ گفتگو کتابوں سے: منیر سیفی صفحات: ۱۸۴، سائز: ڈیمائی، قیمت: تین سو روپے،
مارک لین، سمن پورہ، وی بی سی، پٹنہ۔800014 (بہار)
مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

منیر سیفی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ لیکن انہوں نے تنقید بھی لکھی ہے اور کتابوں پر تبصرے بھی کئے ہیں جو فکر و عمل کو مہمیز کرتے ہیں، چمنستان شرر آمیز کو نفس گرم کی تاثر عطا کرتے ہیں اور تفاصیل کو بیان کرتے ہوئے دریافت کی افادیت پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح کے تبصرے اردو میں کم لکھے جاتے ہیں۔ یہ نیا پن منیر سیفی کی خصوصیت ہے کہ کتاب کی جانکاری کے لئے پورا تبصرہ خود کو پڑھواتا ہے۔ ان کے تبصرے پر عنوان بھی کنوارے ہوتے ہیں جو اپنی کشش سے متوجہ کرتے ہیں۔ یہ عنوان حقیقت نگاری کی جمالیات کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ ان میں نئی فکر ہے، تجزیہ کی مثبت تاریخیت ہے اور اسلوب کی ادعائیت سے نکلنے کی ناگزیریت ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کا اولین نقش اس طرح ہے:

''داستان جزائر انڈمان نکوبار اور ۱۸۵۷ء''نواب سراج الدولہ''''حکیم جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن (بابا سائیں)، بہزاد فاطمی، فن اور شخصیت'' علامہ فضل امام واقف: فن اور شخصیت، روئے دریا سلسبیل، قعر دریا آتش است، گلبانگ رفتہ: چندر شیکھر عکس بھارتی، تمنا مظفر پوری کا تحقیقی وتنقیدی آفاق، سید شکیل دسنوی کا شعری آفاق، سید نفیس دسنوی اور نور حرا، ہے کہاں وہ جو پہاڑوں کے ورق موڑتا تھا۔ شہریار: فکر وفن، میخانۂ اردو کا پیر وفا نارنگ ساقی''، سہیل کاغذ پہ صحرا سمیت لائے ہیں'' لہجے کی شناسائی: کسک، رقص سیماب، گرد سفر، فانوس خیال، گل کا جور اور خلیل تنویر، دنیا مایا جال اور سراج دہلوی، حیرت مراد آبادی کی اساس حیات'' صابر ادیب: شخصیت اور فن''ٹھہری ہوئی دھوپ کا مسافر، اردو کی خواتین ناول نگار، ڈاکٹر ایس کے، اردو افسانے کا بدلتا مزاج، پاؤں جلتے ہیں میرے، قیر قدیر ارم، ننگی آوازوں کی گونج، العطش، اردو شاعری میں جانور، سمندر جاگتا ہے، عالمگیر ادب کا عارف خورشید نمبر، مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعراء، ایک شاعر ایک غزل، گلاب رنگ: وقیع منظر اور دل کا شاعر غلام سرور ہاشمی۔

منیر سیفی نے اظہار اور ترسیل کو منکشف کرتے ہوئے نئے پیمانے کی طالب بنایا ہے تاکہ تخلیق کاری اور تحقیق تقاضے کا عمل سامنے آسکے۔ انہوں نے کتابوں سے گفتگو کرتے ہوئے وجود کی عبارت کو اپنا الگ نظریہ دیا ہے۔ مثلاً

ISSN No. : 2395-2016

۱۸۲۲ء میں کالپی میں پیدا ہونے والے میر قادر علی کی کتاب سے گفتگو کرتے ہوئے جزائر انڈمان نکوبار کی پوری تاریخ بیان کردی ہے۔ یہ ایک طرح سے سفرنامہ ہے جو روزنامہ کی شکل میں ہے۔ اسے لامتناہی اجنبی آبستان کی حقیقی سرگزشت کا نام دیا جاسکتا ہے جس میں پہاڑ، آبشار، جنگل، سمندر، ناختنی کھال پر زردموتی دھاریاں، اور بہت کچھ حیرت میں ڈالنے والی باتیں یادیں ہیں، ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''میزبان جنگلی عورتوں کے پستان نہیں ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کو پھلوں کا جوس پلا کر پالتیہیں۔ یہاں کے سار، جنگلی ایک ہی عمر کے دکھائی دیتے ہیں۔''

حافظ کرناٹکی کی کتاب ''سراج الدولہ'' میں منیر سیفی کو بہت کچھ انکشافی ملا ہے۔ ان کے تبصرہ سے یہ اقتباس دیکھئے: ''نواب سراج الدولہ کی شہادت ۲۱ رجولائی ۱۷۵۷ء کی خبر سنتے ہی باشندہ سہسرام راجا رام نرائن موزوں جو صوبیدار عظیم آباد اور پٹنہ تھے، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، ننگے سر، ننگے پاؤں دیوانہ وار بازار میں روتے پھرتے تھے۔ ان کے پیچھے ایک بے پناہ ہجوم نے کہرام مچار کھا تھا کوئی سینہ کوبی کرتا، کوئی آنسو بہاتا، گویا محرم کا ماتمی جلوس ہو۔'' حیرت انگیز اور لرزیدہ باتوں کو اپنے تبصرے میں اجاگر کرنے کا ہنر منیر سیفی کو معلوم ہے۔ (ہرگانوی)

ادب شناسی: صابر علی سیوانی

صفحات: ۳۰۴، سائز: ڈیمائی، قیمت: تین سو روپے مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

H.No. 9-4-87/C/12, 1st floor, Behind Moghal Residency Toli chowki, Hyderabad, 500008 (Telangana)

صابر علی سیوانی صحافی اور تنقید نگار ہیں۔ تہہ در تہہ معنی کے تلاطم تک پہنچنے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ نئی تنقید کو انہوں نے ضبط، سلیقہ اور رمز عطا کیا ہے کہ سماجی رشتوں سے بھرپور تخلیقات کو اپنی تنقید سے بامعنی حقیقت تک لے جاتے ہیں، عقلی جواز فراہم کرتے ہیں اور تہذیبی ولسانی مشترک رویوں کو تفہیمی وحدت عطا کرتے ہیں۔ جذباتی صورت نشاطیہ ان کی تنقید میں نہیں ملتی۔ بلکہ کشادگی کو اظہار کی پراسراریت سے مالا مال کرتے ہیں۔ موضوع زیر تکلیم کے حسن کو اجاگر کرتے ہیں اور ترین قیاس وجود کی گوناگوں کیفیت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ پانچ کتابوں کے مرتب اور تنقید نگار صابر علی سیوانی نفسیاتی اور واقعاتی سوچ کو لامتناہی تناظر میں لے جاتے ہیں۔ قبل: سیاق وسباق'' اور دکن میں شعر وادب'' جیسی کتاب سے وہ تنقیدی ڈسپلن کو نیا راستہ دے چکے ہیں۔ اب ۲۰۱۷ء کی شائع شدہ تنقیدی وتحقیقی کتاب سے علم وفکر کی متنوع جہتوں کو منضبط بنا رہے ہیں اور گفتار کو تحرک بخش کر ساخت کا عرفان طلوع کرتے ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

''خواجہ میر درد کے ضرب المثل اشعار''، بہار شاہ ظفر کی شعری سلطنت''، ''ذوق اپنے ضرب المثل اشعار کے آئینہ خانے میں''، مومن کے مقطعے اور مذہبی تلازمات، میر انیس کی رباعیات اور فلسفہ حیات وممات، شیفتہ سہل

ممتنع کی اعلیٰ مثال، پاکستانی فنکاروں کی زبان وشعری تخلیقات، مجاز لکھنوی: شخصیت اور شاعری، فیض احمد فیض کی فنی جہات، علی سردار جعفری کی تخلیقی ہنرمندی، معروف کالم نگار شاہد صدیقی کی غزل گوئی، شہریار کی میزان شعروسخن، ندا فاضلی کی شاعری میں انسانی رشتوں کی نزاکتیں، کلیم عاجز: کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں؟ غیر معروف شعراء کے مشہور اشعار، اردو تذکرہ نگاری کی روایت واہمیت، مختار الدین احمد آرزو کا تحقیقی زاویۂ نگاہ، ''انشاء کی شاہکار داستان، کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، سریندر پرکاش کا علامتی افسانہ ''بجوکا'' کا تنقیدی جائزہ، اردو میں ادبی کالم نگاری ''ساقی'' کے مدیر شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری، کچھ غلط العام الفاظ کے بارے میں، پشتارۂ اغلاط، لفظوں کا اسراف، اردو میں مستعمل فارسی محاورے اور ضرب الامثال، کہاوتیں اور ان کا تاریخی پس منظر اور ہندو مسلم اتحاد کا نقیب ''الہلال''۔

کتاب کے پیش لفظ میں صابر علی سیوانی نے بعض اہم نکتے کی نشاندہی کی ہے۔ خصوصاً نئے لکھنے والوں سے یہ بھی سرگوشی کی ہے:

''دور حاضر میں ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ مطالعہ سے زیادہ لکھنے کو فوقیت دی جاتی ہے، یعنی وسیع المطالعہ کے بغیر کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کرنے کے لئے قلم اٹھالیا جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ آج کل درست زبان لکھنے پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ جملے کی ساخت، تراکیب لفظی، فارسی زبان کے الفاظ کا صحیح استعمال، لفظوں کا درست املا اور محل استعمال وغیرہ سے بہت کم ہی لوگ واقف ہیں۔:

صابر علی سیوانی کی محبوبیت زبان کے ادراک سے ہے، صحت زبان، ضرب الامثال اور محاوروں پر توجہ دینے سے ہے اور تحقیق وتنقید کے مختلف جہات کو فنی گراف تک پہنچانے میں ہے۔ زیر مطالعہ کتابمیں نے خیال افروزی ہے، مفروضوں پر ضرب کاری ہے اور اردو ادب کی تفہیم وتشریح اور تنقید وتحقیق کی فکری جہت پر لسانی اظہار کا دفاع ہے۔ (ہرگانوی)

کتاب کا نام: دیرینہ خواب کی تعبیر۔ مصنف: انور آفاقی۔ مصنف کا پتہ: ہدیٰ منزل، راج ٹولی بھیگو دربھنگہ۔ سالِ اشاعت 2018ء قیمت 150 روپے۔ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

''دیرینہ خواب کی تعبیر'' انور آفاقی کا سفر نامہ ہے۔ اردو ادب میں انور آفاقی کی بنیادی پہچان شاعر کی حیثیت سے ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''لمسوں کی خوشبو'' کو پسند کیا گیا۔ نثر نگاری سے بھی ان کو دلچسپی ہے کہ انہوں نے چند افسانے لکھے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کشمیر کے سفری روداد پر محیط ہے۔ نگینہ انٹرنیشنل کے زیر اہتمام ادبی تقریب میں شامل ہونے کے لئے یہ سفر کیا گیا ہے۔ مصنف کے ساتھ شریک سفر ہیں دربھنگہ ٹائمنر کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر اور ڈاکٹر انتخاب ہاشمی۔ دربھنگہ سے سری نگر کے سفر میں جو دلچسپی ہوسکتی ہے اس کا مرقع یہ سفر نامہ ہے۔ آرام دہ ایر کنڈیشن بس سے دربھنگہ سے پٹنہ کا سفر اس سفر کا آغاز ہے۔ پٹنہ میں بک امپوریم اور وہاں شمیم

ISSN No. : 2395-2016

قاسمی، تبریز ہاشمی اوران کے ساتھی صدام سے ملاقات کو مصنف نے خوبصورتی سے بیان کیا ہے نیز شمیم قاسمی اوران کی چاروں کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ پٹنہ سے دہلی اور دہلی میں ایرپورٹ کے باہر غلام نبی کمار کے سراپا انتظار کو قرار ملنا پھر اس نوجوان ادیب کا تعارف، مصنف کا اپنے داماد سید نفیس الرحمٰن کے یہاں قیام اور دہلی ایرپورٹ پر کشمیر کی روانگی پر مشہور کرکٹر ایم۔ ایس دھونی سے ملاقات اس سفر کو پر لطف بنانے میں معاون ہے۔ ان تینوں مسافر کا قیام ہوٹل شہنشاہ پیلیس میں ہوتا ہے یہاں سے سری نگر کی سیاحت باضابطہ شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے سردی کا احساس یہاں کے موسم کا مزاج بتاتا ہے۔ سری نگر میں ڈرائیور بشیر احمد شاہ سے سری نگر کے بارے میں عمومی معلومات اوراس خوبصورت شہر کا تعارف نیز وحشی سعید (معروف فکشن نگار) اور معمر افسانہ نویس نورشاہ سے شہنشاہ پیلیس میں پہلی ملاقات اور متذکرہ دونوں ادباء کا تعارف سے ادبی سفری روداد کو مزید معلوماتی بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ سیاحی اور سیر سپاٹے کی غرض سے چشمہ شاہی باغ، ڈل جھیل، جھیل میں ہاؤس بوٹ، نشاط باغ کا دیدار کرتے ہوئے سفر نامہ نگار انور آفاقی یادوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ کبھی ہندی فلموں میں کشمیر کی عکاسی کا انہیں خیال آتا ہے تو کبھی رسائل وجرائد کے حوالے سے یہاں کے قدرتی حسن اور آب وہوا کو یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے روداد بیان کرتے ہوئے فلمی نغموں کے مشہور مکھروں کا باموقع استعمال کیا ہے جو سفر نامہ پڑھتے ہوئے خوب مزہ دیتے ہیں۔ شالیمار باغ کو موسمِ خزاں میں دیکھنے کا لطف اور کشمیر یونیورسٹی کی سیر سے آگے بڑھ کر نسیم باغ اور پھر مسجد حضرت بل پہ حاضری اور وہاں موئے مبارک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے واپس قیام گاہ آجاتے ہیں۔ اگلے دن گلمرگ کی سیر کا پروگرام کا خواب سجائے مسافر لحاف میں دبک جاتے ہیں۔ گلمرگ میں ہر سو برف کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ وہاں کارٹ پر تینوں سیاح خوب مزے لوٹتے ہیں یہاں تک کہ سفید داڑھی والے مصنف بھی اپنی عمر سے کافی پیچھے لوٹ کر برف کا لطف اٹھانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے ہیں۔ یہاں سے واپسی پر کچھ خریداری کی جاتی ہے۔ بازار کی حالت پر مصنف کا سرسری تبصرہ وہاں کی اصلی صورت کو اجاگر کرتا ہوا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر الطاف انجم سے ملاقات سے اس دن کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگلے دن سیمینار اور رسم اجراء تقریب ہونی ہے اس کی تیاری کے بعد تینوں مسافر پروفیسر حامدی کاشمیری سے ملنے جاتے ہیں۔ مسعود منزل پہ ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے بارے میں اہم معلومات سے قاری کو واقف کراتے ہیں۔ ڈل جھیل میں شکارا سے سیر کا لطف لیتے ہیں۔ سیمینار کی کاروائی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے انور آفاقی نے وہاں کے ادبی ماحول کی ستائش کی ہے۔ سری نگر اور گرد ونواح کے نام چین ادباء کی کہکشاں اس بزم میں سایہ فگن رہی۔ وہاں مہمانوں سے ملنے کا حسین اتفاق کو وہ غنیمت جانتے ہیں۔ انہوں نے بطور خاص اس پروگرام کے صدر جسٹس بشیر احمد کرمانی کا ذکر کیا ہے۔

یہ سفر نامہ ایک طرف جنت نشاں کشمیر کی سیر کی روداد ہے تو دوسری جانب مصنف کے دیرینہ خواب کی وہ تعبیر ہے جسے وہ پانا چاہتے تھے اس لئے اس سفر نامے میں جذبات ہر جگہ مچلتے نظر آتے ہیں۔ سیر وسیاحت ہو یا ادباء سے ملاقات، مصنف کا مطمحِ نظر آسودگیٔ دل ہے۔ دل جن جن لمحوں سے شاداں ہوتا ہے وہ لمحے انسان کے لئے قیمتی ہوتے ہیں۔ اس سفر نامے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں سیر وسیاحت کی للک ہے اور مقام کو جاننے کے لئے وہ پر تجسس بھی رہتے ہیں۔ اس سفر نامے میں جن شخصیات کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں عمومی معلومات بھی مصنف دیتے چلتے ہیں۔ کشمیر کے ادباء کا قابلِ لحاظ تعارف سے جو تاثر بنتا ہے اس سے اندازہ

لگانا آسان ہوجاتا ہے کہ جموں کشمیر میں اردو کا ادبی ماحول سازگار ہے اور نئے پرانے قلم کاروں کے درمیان مضبوط رابطہ ہے۔

''دیرینہ خواب کی تعبیر'' میں تصاویر بھی سجائے گئے ہیں۔ تصویریں سیاہ وسیفد مگر واضح ہیں۔96 صفحات کی اس کتاب کے شروع کا حصہ ڈاکٹر منصور خوشتر (کشمیر جنت نشاں)، ڈاکٹر احسان عالم (سیر کشمیر کی منظر کشی) اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (انور آفاقی کا شوقِ سفر) کے مضامین سے آراستہ ہے۔ ان مضامین میں اس سفرنامے کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کاش ایک آدھ صفحہ سفرنامہ نگار جناب انور آفاقی نے بطور پیشِ لفظ یا تعارف کے تحریر کیا ہوتا تو اس گوشے میں کشادگی آجاتی۔ انور آفاقی صاحب کو مبارکباد۔ یقین ہے کہ یہ سفرنامہ قارئین کو سفر پہ آمادہ کرے گا۔ آمین۔

کتاب کا نام: ڈیئوس علی اور دیا ناول نگار: نعیم بیگ سن اشاعت: ۲۰۱۸ء
مطبع: عکس پبلی کیشنز، بک اسٹریٹ داتا دربار مارکٹ، لاہور پاکستان
قیمت: ۸۰۰ روپے مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

نعیم بیگ مشہور فکشن رائیٹر ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ ان کو انگریزی زبان پر بھی دسترس حاصل ہے۔ انگریزی میں ان کی کتابیں ''ٹرپنگ سول'' اور ''کوکن پلان'' مقبول ہوئیں اور سنجیدہ ادبی حلقے میں زیر بحث آئیں۔ اردو میں ان کے دو افسانوی مجموعے ''یو۔ڈیم۔سالا'' اور ''پیچھا کرتی آوازیں'' ان کی تخلیقی تازہ کاری اور معاشرتی مطالعے کی غمازی کرتے ہیں۔ ''ڈیئوس، علی اور دیا'' ان کا ایک اہم اور منفرد ناول ہے۔

اس ناول میں کل اٹھارہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ ''دھوئیں کے پار''، ''روشن آسمان''، ''دیوانگی''، ''بادمراد''، ''گرج نما''، ''پہلی بہار''، ''جہاں گردی''، ''فلنگ سول''، ''ایکروپولیس''، ''ڈریگون سائن''، ''سچ کی تلاش''، ''ذات کا سحر''، ''امبر''، ''شی جسٹ ایکسپائرڈ''، ''روشن الاؤ''، ''دیوی سے داسی''، ''اڈیالہ جیل'' اور ''زرد خواب'' کے عنوانات سے جو کہانی بیان ہوئی ہے اس میں رومان ہے، سماجی جبر ہے، طاقت کا نشہ ہے اور حسن بیان نے اس سب سنجیدہ موضوعات کو قارئین کے دل تک رسائی کے قابل بنادیا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی محبت اور زندگی کے بارے میں نعمان اور سارہ کے فلسفیانہ خیالات سے قاری ایک خاص میں سوچنا شروع کردیتا ہے۔ سارہ کہتی ہے کہ'' ...... یہ میرا ذاتی خیال ہے اگر تم نے محبت نہیں کی تو تم نے زندگی کا لطف چکھا ہی نہیں۔ تم اسے یوں کہہ سکتے ہو کہ محبت زندگی کا دوسرا نام ہے...... '' پھر نعمان کا جواب زندگی کے ایک اور رخ سے آشنا کراتا ہے۔ وہ سارہ کو روکتے ہوئے کہتا ہے کہ'' .... تم صرف محبت کو زندگی کا دوسرا نام نہیں دے سکتی۔ زندگی تو کیفیت ہے، ایک بہاؤ ہے، جو دریا کی مانند بہتا چلا جاتا ہے اور اس کے راستے میں آنے والے کھیت، کنارے، لوگ، پتھر، دوست اور دشمن سبھی اس بہاؤ سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ کم از کم تم اسے صرف محبت تک پابند یا محدود نہیں کرسکتی۔ ہاں محبت اس کی روانی کا موجب ضرور ہے''۔ دو جرنلسٹوں کے معنی دار مکالمے اور سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا

کمرہ ایک مخصوص ماحول سازی کے لئے بطور تمہید ہے۔فیچر کے لئے جو مواد چاہئے اس کے لئے دونوں کے اپنے اپنے خیالات ہیں، سارہ تجربہ کار ہے اس لئے اس کی رائے میں وزن داری ہے۔مینٹل ہسپتال کے ''خطرناک مریض، ممنوعہ علاقہ'' میں سب سے خطرناک مریضوں کے وارڈ میں علی کمال ہمدانی کا انٹرویو صرف مریض سے روبرو ہونا نہیں ہے بلکہ ایک گتھی کو سلجھانے کا آغاز ہے۔ہسپتال سے اڈیالہ جیل، مس قادری اور علی کمال کی تحریروں کا حاصل ہونا ''روشن آسمان'' کی ٹیم کی کامیابی کا ضامن ہے۔علی کمال ہمدانی کے خیالات ''دیوانگی'' سے کم نہیں ہیں۔علی کمال ہمدانی کی کہانی میں معاشرے کا سچ سامنے آتا جاتا ہے۔بامراد کی بنت میں مشترکہ ہندوستان، تقسیم اور تقسیم کا درد اور حال و ماحول اس طرح روشن ہے کہ ناپاک سچائیاں سامنے آجاتی ہیں۔علی کا فسانہ ناول کوئی موضوعات سے ہم آہنگ کرتا ہوا آج کی کہانی بن جاتا ہے۔علی کے علاوہ دیا، امبر، چھوٹی، سلیم، حمزہ درانی وغیرہ ایسے کردار ہیں جن کے سہارے ناول نویس نے اس دنیا کی اصلیت اور کریہہ سچائی دونوں کو بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان میں سے چند کردار تو بھلائے نہیں جاسکتے ہیں۔علی کمال ہمدانی اسسٹنٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر، پروجکٹ ڈائرکٹر، جوائنٹ سکریٹری.....گویا کسی بھی ملک کا ذہن شخص اور سسٹم کی سیاست اور طاقت کے بل پر اس شخص کی درگت.......پورا ناول پڑھیے تو کئی ایک جگہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔اس ناول میں محبت ہے، سیاست ہے، صحافت ہے، صحافت کی نیرنگیاں اور ابن الوقتی ہے، انسانی نفسیات اور طور طریقے ہیں۔ہاں نعمان اور سارہ کے کردار شروع تا آخر پوری توانائی کے ساتھ عمل پیرا ہیں اور ان کو ناول نویس نے ان تمام اوصاف سے مزین کیا ہے جن کی بدولت ناول کو کامیابی تک ہم کنار کیا جاسکے۔

اس ناول کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی زبان نہایت عمدہ ہے۔مکالمے اتنے چست اور بامعنی ہیں کہ آپ عش عش کر اٹھیں گے۔فلسفہ حیات بیان کرنے اور عصری حقیقت بیانی کے لئے ناول نویس نعیم بیگ موزوں ترین الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔عصر حاضر کی کثافتیں اور رومان کا حسن اس ناول میں یکجا ہے۔فکری اعتبار سے ثروت مند اور فنی لحاظ سے مضبوط و مربوط ناول ''ڈیئوس، علی اور دیا'' کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

اس منفرد اور خوبصورت ناول کے لئے نعیم بیگ کو مبارکباد۔

کتاب کا نام: ببول (افسانوں کا مجموعہ)، مصنف: تنویر اختر رومانی، سال طباعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، مصنف کا پتہ: ۵۹ چوگاشاہ کالونی، آزادنگار (مانگو) جمشید پور، جھارکھنڈ، ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

''ببول'' تنویر اختر رومانی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔انہوں نے گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی سے افسانہ نگاری شروع کی جو اب تک جاری و ساری ہے۔البتہ درمیان کے چند برس خاموش رہے۔ان کے افسانے قابل قدر ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔پیش نظر افسانوی مجموعہ میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''ببول'' ہے۔یہ عنوان کتاب کا سرنامہ بھی ہے۔یہ کہانی عبرت آموز ہے۔

رمضانی چاچا کو ان کا بیٹا رجوا جاڑے کی ایک سرد ترین رات میں گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ گاؤں کا بوڑھا کنواں کے گرد ان کی آہ و پکار پر لوگ جمع ہوتے ہیں۔ شکور چاچا بھی انہیں دیکھنے آتے ہیں۔ نوجوان اور ضعیف سبھی رجوا کی حرکت سے نالاں ہیں۔ اس کو سبق سکھانے کا پلان کرتے ہیں۔ چند لوگ رجوا کی اس حرکت کا بدلہ چالیس سال بعد اس کے بیٹے کے ذریعے لینے کی بات کرتے ہیں۔ ایسے میں شکور میاں اس راز کو فاش کرتے ہیں کہ رمضانی نے بھی چالیس سال قبل اپنے والد کو اسی طرح گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے کہتے ہیں قدرت کا انتقام۔ یہ کہانی سیدھی سپاٹ بیانیہ میں درس وعبرت سے لبریز ہے۔ ''بھروسہ'' کہانی اولاد کی تربیت اور گھریلو ماحول کے ساتھ انسانی نفسیات کا عمدہ مرقع ہے۔ ایفا ملازمت پیشہ میاں بیوی کی اکلوتی بیٹی ہے جو بوا (خادمہ) کے سہارے گھر پر رہتی ہے۔ اسے بوا کا ساتھ پسند نہیں ہے۔ وہ بے چین رہتی ہے اور کئی طرح کے سوالوں سے ماں کو اپنی تنہائی اور حفاظت کے بارے میں بتاتی ہے۔ آخر کار معصوم ذہن سے اپنی ماں کو قائل کر دیتی ہے کہ الماری میں بند قیمتی سامان جس کی حفاظت وہ خود کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ قیمتی ہے۔ یہ سبق آموز کہانی ہے۔ ''دنگل'' افسانہ اپنے اختتام پر آنکھوں کو نم ناک کر جاتا ہے۔ دنگل استاد ظہور اور ہیرالال کے بیچ تھا مگر اصل کشتی بیٹی کی شادی اور ضرورت مند کے درمیان تھی۔ اس واسطے استاد ظہور نے ہار کر ہیرالال کا دل جیت لیا۔ اصل دنگل تو یہی ہے۔ ''بند مٹھی کا کرب'' نوکری کی تلاش میں سرگرداں اور بھوک سے پریشان جوان کی کہانی ہے۔ ''بدولت'' افسانہ رونگٹے کھڑا کر دیتا ہے۔ کیا؟ آج کے پریشان حال بیٹے ایسی حرکت بھی کر سکتے ہیں؟ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی شادی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ لڑکیوں کی عمر ڈھل جارہی ہے لیکن ان کو ور (دلہا) نہیں مل رہا ہے۔ افسانہ ''پگلی'' اس موضوع کی بہتر عکاسی کر رہا ہے۔ گاڑی کے نیچے آکر زخمی ہونے کا بہانہ بناتے ہوئے روپیہ اینٹھنے والے کی کہانی ہے۔ اس مناسبت سے ''روٹی مانگتی زندگی'' عنوان سٹیک ہے۔ ''بڑے لان کا آدمی'' افسانہ امیری اور غریبی کے فرق کو مٹانے کے لئے ذہن پہ دستک دیتا ہے۔ شیام لال اور رام کھلاون کے کرداروں کے ذریعے یہ واضح ہوا ہے کہ صرف انسانیت ہی قابل قدر ہے۔ ''تحفظ کا احساس'' میں وردی والے کی حرکت سے احساس تحفظ جاتا رہا ہے۔ ''دیش بھگت'' میں بسوں کی ٹکٹ میں کرپشن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''جس پہ تکیہ تھا'' افسانہ سچ ہے کہ فساد میں فسادی اور پولس والے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ مظلوم ہر فساد کے بعد اس صورت کا سامنا کرتے ہیں۔ ''چالیسواں سنگ میل'' میں درد کی وہ کرچیاں نمایاں ہیں جو غریبی کا مقدر ہوتی ہیں۔ ''حق'' میں زندگی کا ایک فلسفہ بیان ہوا ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اسے مل کر رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ''پردھان جی'' جیسے لوگوں کا ہی راج ہے۔ یہ افسانہ شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے تشنگی رہ جاتی ہے۔ ''ٹوٹی کہاں کمند'' کا جموا اور لاٹری کے دو لاکھ روپے دیکھ کر جگ جیون رام کا اس دار فانی سے رخصت ہو جانا اس افسانے کو جاندار بنا دیتا ہے۔ ''تیسرا طوفان'' سدھیر، سداما اور دیوا کر کے درمیان محبت اور جنس کی کہانی ہے۔ اس میں حسیناؤں کے چرتر کا خوب خوب چترن کیا گیا ہے۔ حصول آمدنی کے لئے انسان ''سطح سے نیچے'' اتنا گر جاتا ہے کہ اپنی جوان بیٹی کو بھی کاؤنٹر پر بٹھانے سے باز نہیں آتا ہے۔ اپنی خوبرو بیوی کی بدچلنی سے خودکشی کرنے والے مہندر کی خودکشی ایک معمہ ہے۔ ''حسین سراب''

ISSN No. : 2395-2016

کا موضوع عورتوں کی بدکاری ہے۔ اس مجموعے کی آخری کہانی ''مظلوم'' ہے۔ اس میں شریفوں کی شرافت بے نقاب ہوتی ہے۔ افسانوی مجموعہ ''ببول'' کے مطالعہ سے تخلق کار تنویر اختر رومانی کی اصلاح پسندی اور افسانوں کے ذریعے مقصد کی تلاش کا واضح مطمع نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانے طویل نہیں ہوتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے وہ بغیر کسی الجھاؤ کے کہانی بیان کردیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں گرد وپیش کے واقعات پر مبنی معلوم پڑتے ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے افسانوں کے باطن سے مکالمہ کرتا ہوا ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا مضمون اس کی کتاب کی زینت ہے۔ ''زندگی کی سچائیوں کو افسانہ کرنے والا فنکار تنویر اختر رومانی'' کے عنوان سے یہ مضمون ان کی افسانی نگاری کے جہات کو روشن کرتا ہے۔ یہ مضمون اٹھارہ صفحے پر پھیلا ہوا ہے۔ کچھ بیان اپنا اور مختصر کوائف سے صاحب کتاب اور ان کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ بطور مرتب سعید فردوسی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا نام ''بند مٹھی کا کرب'' رکھا تھا۔

امید ہے اس افسانوی مجموعہ سے تنویر اختر رومانی کے قارئین کا حلقہ وسیع ہوگا اور ان کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف ہوگا۔

اردو ناول کے حوالے سے موجودہ متعدد حوالہ جاتی تصنیفات وتالیفات کے باوجود اس کتاب کی جانب قارئین توجہ دیں گے ایسی امید ہے۔

☆ کتاب کا نام: پروفیسر ممتاز احمد کی ادبی خدمات، مرتب: ڈاکٹر خالد سجاد، صدر شعبۂ اردو، کے ایس کالج لہیر یاسرائے دربھنگہ، سال اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۲۰۲ روپے

مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

ڈاکٹر خالد سجاد کا تحقیقی کام مانوس سہرامی کے حوالے اعتبار پاچکا ہے۔ اس کے علاوہ وہ صالح ادبی روایات کی ترویج میں حصہ داری نبھاتے رہے ہیں۔ اردو ادب سے وابستگی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی اور سابق پرنسپل پٹنہ کالج پٹنہ پروفیسر ممتاز احمد کی ادبی خدمات کی بازیابی اور شیرازہ بندی ہے۔

پروفیسر ممتاز احمد اپنی مصروف ترین ملازمتی ذمہ داریوں کے باوجود ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔ ان کی کتابیں مثنویات راسخ، کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر، اردو شعراء کا تنقیدی شعور، حدیث سخن اور تحلیل نفسی اور ادبی تنقید (کلیم الدین احمد کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) ادبی سرمایہ میں اضافہ ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کو روشن ومنور کرنے کے لئے ڈاکٹر خالد سجاد صاحب اس کتاب تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں موصوف کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس حصے میں شامل تیرہ مضامین سے گیارہ ادبی نوعیت کے ہیں۔ حسرت تعمیر ایک مطالعہ، ایک غیر مطبوعہ قصیدہ، اپنی تلاش میں، بچوں کے ادب

میں شہباز کا حصہ، کلیم عاجز اور ان کا فن، تحقیق و تنقید، جمیل مظہری کا تنقیدی شعور، حسرت موہانی اور اردو صحافت، اکبر کا اصول نقد، عظیم الدین احمد بہ حیثیت نظم نگار، سید سلیمان ندوی بہ حیثیت شاعر، ایسے مضامین ہیں جن سے ممتاز احمد کے مطالعہ پسندی اور نتیجہ برآمد کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مضامین رسائل و جراید میں شائع ہوئے یا سیمینار میں پڑھے گئے ہیں۔ یہ ستر کی دہائی سے نوے کی دہائی تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ مذکورہ

مضامین میں تجزیاتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ گفتگو کو مدلل بنانے کے لئے فن پارے سے مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ کہیں کہیں کتابوں سے حوالے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ کتاب کے حصہ دوم میں پروفیسر ممتاز احمد کے تحریر کردہ مقدمات اور تبصرے شامل ہیں۔ ''نشاط و کرب'' اسلم آزاد کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ''اسلم آزاد کو اپنے اسلوب پر کافی قدرت ہے، پھر ان کا اپنا پر درد اور مدھم لہجہ ہے۔'' ''مکاتیب شہباز'' پر انہوں نے پر مغز اور معلوماتی مقدمہ تحریر کیا۔ اس مقدمے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ''خار و خس'' (رضا مظہری کا شعری مجموعہ) اور ''اس حمام میں'' (ابوالکلام کے انشائیے) کتابوں پر ان کے تبصرے لائق مطالعہ ہیں۔ ان کے یہاں تبصرہ کا انداز کتاب کا تعارف اور مشمولات پر نگاہ نقد سے آراستہ ہے۔ حصہ سوم میں پروفیسر ممتاز احمد کی کتابوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ ''مثنویات راسخ'' کے چند اوراق بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔ مشمولہ حصہ راسخ کو جاننے میں معاون ہے۔ ''کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر'' سے منتخب حصے میں ان کے شعری مجموعے ''۴۲ نظمیں'' اور ''۲۵ نظمیں'' کے تعلق سے جائزے شامل ہیں۔ اس کتاب کی تمہید کے طور پر کلیم الدین احمد کی حیات اور خدمات کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ ''اردو شعراء کا تنقیدی شعور'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا حرف اول خالد رشید صبا کا تحریر کردہ ہے۔ اس کا مقدمہ بسیط ہے۔ اس میں شاعری کے مقاصد، خصوصیات شاعر و سخنور اور محاکمہ کے ذریعہ شعراء کے تنقیدی مزاج کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مشمولہ حصہ اہمیت کا حامل ہے۔ ''حدیث سخن'' پروفیسر ممتاز احمد کی شعری مہارت کی تمثیل ہے۔ انہوں نے نئی شاعری کے لئے اس کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور موصوف کو بطور شاعر پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس پیش لفظ میں کلیم الدین احمد نے لکھا ہے اور نظم کی تعریف کی ہے۔ پس منظر کے عنوان سے ڈاکٹر محمد صدیقی کی تحریر سے روایت دل کی خوبیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر خالد سجاد کی یہ کوشش قابل رشک ہے کہ انہوں نے گم ہوتی ہوئی نگارشات کو اس طرح سے تازگی بخشی ہے۔ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو نجونا اور نئی نسل تک اسے پہنچانا ادیب کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے انہوں نے بخوبی نبھایا ہے۔ یقین ہے اسے قارئین پسند کریں گے۔

ڈاکٹر امام اعظم جہانِ تنقید و تخلیق کے اس سندباد کا نام ہے، جنھیں اردو زبان و ادب کے

ISSN No. : 2395-2016

نئے جزیروں کی سیر کا شوقِ فراواں میسر ہے۔ وہ ایک پولس آفیسر کا صلبی و علمی وارث ہونے کی وجہ سے ہر دم رواں پیہم جواں زندگی کے فلسفہ پر یقین رکھتے ہیں۔ کم یاب کتابوں اور رسالوں کی تلاش اور ورق گردانی ان کا شب و روز صبح و شام کا مشغلہ ہے۔ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی تحریریں لکھنا ان کے لیے اس یگ میں Passion سا بن گیا ہے۔

کتاب: گیسوئے اسلوب مصنف: ڈاکٹر امام اعظم ص: ۲۸۸ قیمت: ۳۵۰/روپے
رابطہ: تمثیل نو پبلی کیشنز، محلہ گنگواره، پوسٹ ساراموہن پور، ضلع دربھنگہ - ۷ (بہار)
مبصر: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ضلع مدھوبنی - 847237 (بہار) موبائل: 9910509702

زیر نظر تازہ ترین تنقیدی کتاب ''گیسوئے اسلوب'' بھی ان کے اسی فکر و جذبہ کی زائیدہ ہے۔ یہ کتاب مختلف ادبی، تنقیدی، تحقیقی، اسلوبیاتی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے نبضِ ادب کی موجودہ رفتار پر انگلی رکھنے، اس کی حرکت و حرارت کو محسوس کرنے اور اس کو ادبی کسوٹی پر پرکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ہر مضمون اپنے مواد و مشمول کے اعتبار سے مصنف کی نادرہ کاری اور جدت طرازی کا عکس پیش کرتا ہے۔ یہ کل ۴۳ رمضامین و مقالات کا تحریری گل دستہ ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ان کو دو خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک خانے میں عمومی نوعیت کے مضامین شامل ہیں، جب کہ دوسرے خانے میں شخصی سوانحی/ تاثراتی قسم کی تحریروں کو جگہ دی گئی ہے۔ عمومی نوعیت کے مضامین میں ''علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں، کولکاتا: تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں، اردو نظموں کا پس منظر اور پیش منظر: ۱۹۸۵ء کے بعد، ہندوستانی فلمیں اور اردو: ایک منظر نامہ، اکیسویں صدی میں بنگال میں اردو صحافت کی پیش رفت، اکیسویں صدی میں اردو کے روشن نقوش، جدید شاعری میں آزاد غزل کا ہیئتی تجربہ، مشترکہ تہذیب: ہندوستانی ثقافت کی شاخ گل، اردو زبان اور میڈیا، اردو وکی پیڈیا: ایک جائزہ''، شخصی/ سوانحی مضامین والے حصے میں درج ذیل تحریروں کو نمائندگی دی گئی ہے ''عبدالغفور شہباز کی نظمیہ شاعری، مولانا آزاد: فکر و عمل کے چند درخشاں پہلو، منٹو کے افسانوں کی سماجی معنویت، ہندوستانی تہذیب کا ترجمان افسانہ نگار: بیدی، روایت اور جدت کا شاعر: فیض احمد فیض، ترقی پسند غزل اور علی سردار جعفری، مجاز کی رومانی شاعری میں گوندھا ہوا گداز، احتشام حسین: اپنے ۴ رخطوط کی روشنی میں، نئی غزل کا معمار: شاد عارفی، وہ جو بچھڑ گئے: مظہر امام، روح عصر کا شاعر: علامہ شبلی، تیری غزلوں میں عجب سوز ہے لطف الرحمٰن، اردو تنقید کا جلی دستخط: نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی کا تنقیدی اختصاص، مناظر عاشق ہرگانوی: داستانی طرز کے قلم کار، سید محمد اشرف کی 'آخری سواریاں': اردو ناول کا ٹرننگ پوائنٹ، وسیم بریلوی کی غزلوں میں رومانیت، 'پھول مرجھا گئے'، خوشبو کا سفر جاری ہے': منصور عمر، سید تقی عابدی کا شاہکار 'دیوان رباعیات انیس'، فکر و عمل کا متحرک استعارہ: ارتضی کریم، ف.س. اعجاز کی غزلوں میں زندگی کی نیرنگیاں، ابواللیث جاوید کا منفرد افسانوی اسلوب، احمد سجاد کی تنقید میں متاع دین و دانش، 'چار رنگ کی کشتی' (صدیق عالم) ناول نگاری کا سنگ میل، ظہیر انور کا سفرنامہ 'ایک عرض تمنا'، اردو ڈراما کا ایک مقناطیسی عنوان: جاوید دانش،

یٰسین احمد کے افسانوں میں کرب آمیز زندگی کی عکاسی، ادب اطفال میں حشمت کمال پاشا کے کمالات، حقانی القاسمی کا تنقیدی وژن، اقبال جاوید کی کتاب 'آغا حشر کاشمیری: حیات اور ڈراما نگاری' کی معنویت، عصر حاضر کا ایک نمائندہ قلم کار: مصطفیٰ اکبر، سراج دہلوی کی دوہا نگاری کی انفرادیت، ایس. ایم. آرزو کی مزاح نگاری۔

مذکورہ بالا عناوین میں سے کئی ایسے عنوان تلاش کرنے پر مل جائیں گے، جن پر یا تو سرے سے توجہ نہیں دی گئی ہے، یا پھر اپنے تحفظات و تعصبات کے سبب کم کم توجہ دی گئی ہے۔ بعض عنوانات اپنے نام کے اعتبار سے قارئین کے لیے تعجب خیز تو نہیں ہیں کہ یہ نام ان کی سماعت سے ٹکر کھاتے رہتے ہیں اور اس قسم کے عمومی ادبی نوعیت کے عنوانات پر کچی پکی تحریروں کا انبار ہے، مگر اس کتاب میں شامل تحریروں کا انداز الگ ہے۔ پیش کش کے جلو میں جدت و ندرت ہے اور موضوع سے نتیجہ اخذ کرنے کی اپنی منفرد منطق ہے۔ یہی خصوصیت ادب آ کاش پر ان مضامین کی حیاتِ جاودانی کا باعث ہے۔ اور بات کچھ یوں بھی ہے کہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا جاسکتا ہے۔ مصنف کا اپنا فکری محور ہے، مخصوص ادبی فکر ہے۔ وہ ادب کو کس نظریہ سے دیکھتے ہیں، فن پارے کے حسن و جمال اور اس کی خوبی و خامی کو کس طرح جانچتے ہیں، ''پیش گفتار'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے ادب کے انفرادی کارنامے کو مطمح نظر بنایا ہے اور بازیافت تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ذہن اور نظر کی وسعت ضرور ہے، ادبی محاسن کا برملا اعتراف ہے اور ہر تخلیق یا تخلیق کار کو اس کی روشنی میں دیکھنے کی قطعیت ہے۔''

بعض مضامین خاصے طویل بھی ہیں اور ذہن و فکر کو نئی دریافتوں کے در تک لے جاتے ہیں۔ حقائق و شواہد تک خود پہنچنے اور اپنے قارئین کو بھی مصدقہ معلومات تک پہنچانے کی کوشش میں مصنف بے تاب نظر آتے ہیں۔ امام اعظم ادب کو لفظی رسمی تعریف کے دائرے میں محصور نہیں رکھتے۔ ادب چوں کہ ایک کھلے ڈلے صحت مند رویے کا نام ہے، اس لیے وہ ادب کی اخلاقیات و سماجیات کا بھی گہرا شعور و ادراک رکھتے ہیں۔ ادبی سرمایہ کسی بھی زبان کا ہو، وہ تاریخ، تہذیب، تمدن، علمیات، عمرانیات، سماجیات سبھی کا مزوجہ ہوتا ہے۔ کولکاتا کی قدیم و جدید تاریخ و تہذیب کے تعلق سے ان کا مضمون (کولکاتا: تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں) نہ صرف ایک اپ ڈیٹیڈ مضمون ہے، بلکہ انھوں نے مضمون کی شکل میں کولکاتا کا ایسا تحریری کولاژ تیار کردیا ہے کہ ایک سیاح کے لیے یہ روڈ میپ کا کام بھی دے سکتا ہے۔ اس مضمون میں کولکاتا کی ادبی تگ و تاز، لسانی رنگا رنگی، تحریکی کشاکش کے ساتھ اس کے معاشی، تجارتی، اقتصادی، سیاحتی، تہذیبی، تعلیمی نقوش بھی مجتمع ہو گئے ہیں اور یہ ایسا دلچسپ مضمون ہے، جس سے ادیب و غیر ادیب، عالم و غیر عالم سبھی یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

شخصی مضامین کا حصہ کافی وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مختصر تاثراتی اور تبصراتی نوعیت کی چند صفحاتی تحریریں شامل ہیں۔ مگر ان تحریروں میں ادب کی تمام اصناف کی روح سمٹ آئی ہے۔ انھوں نے ادب کی نثری و شعری ہر صنف کو مناسب نمائندگی دی ہے۔ شعر و شاعری سے لے کر، ناول و افسانہ، تنقید و تحقیق، مزاح نگاری و ڈراما نویسی تک سے انھوں نے روبرو کرایا ہے۔ منٹو کے افسانوں کی سماجی معنویت والا مضمون دانش ورانہ لمس کا

حامل ہے۔منٹو پر کس ادیب یا ناقد نے نہیں لکھا ہوگا، مگر منٹو کی تحریروں کو منفی انداز نظر سے ہٹ کر سماج وسوسائٹی کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش خال خال ملتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ان کے افسانوں کے داخلی اور باطنی منظرنامے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔انسانی سماج کی دردمندی اور تپش وحرارت ان کی کہانیوں میں فنی لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اور ادبی حسن کی افزائش کا وسیلہ بنتی ہیں۔منٹو عظیم تھا، عظیم ہے اور رہے گا۔لوگ چولے بدل بدل کر ان کے عہد اور موضوع کی نقالی کرتے رہیں گے۔'' (ص:۱۲۶)

امام اعظم کا امتیاز واختصاص ان کی سادہ و پرکشش زبان ہے۔وہ تحریری تکلفات سے دامن بچاتے ہیں۔وہ مختصر جملوں میں اپنی بات کہنے اور اشاروں کنایوں میں بھی اظہار خیال کا سلیقہ جانتے ہیں۔وہ ہر لفظ کی قدر وقیمت سے آشنا ہیں کہ کوئی لفظ معنویت سے معریٰ نہیں ہوتا۔وہ اپنی علمیت کا رعب گانٹھنے کے لیے دور کی کوڑی بھی نہیں لاتے۔قریب المعنی اور قریب المفہوم الفاظ سے اپنے تحریروں کا نگارخانہ سجاتے ہیں۔اس کتاب کے مضامین میں بھی انھوں نے مختصر اور بامعنی مدلل گفتگو کا سلیقہ دکھایا ہے۔یہ مضامین ادبی تب وتاز کے حامل ہیں، جن سے ادب بدن میں حرارت اور حرکت پیدا ہوتی ہے۔یہی ان کا مقصد و مطلب بھی ہے۔مشہور ادیب و ناقد پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

''امام اعظم قریب المفہوم لفظوں کے استعمال سے مضمون کے سورنگ کو اعتبار بخشتے ہیں جس سے ان کی تنقید نگاری درجۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ان کی تنقید میں لفظوں کے تلازمے اور ان کی نسبتیں بنیادی حیثیت اختیار کرکے معنویت کی تشکیل کو تشریح کے زمرے میں داخل کرتی ہیں تاکہ معانی کی وسعت سامنے آسکے......لفظ و معنی کے اس تناسب میں شائستگی، لہجہ کی نرمی اور اظہار کے گہرے رنگ کو دیکھا جاسکتا ہے''

عہد حاضر کے دانش ور اور ملٹی لنگول ناقد نظام صدیقی نے اس کتاب پر فلیپ لکھا ہے اور ان مضامین کی خوش فکری، خوش اسلوبی، دل آویزی اور تخلیقیت افروزی کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر تحریر میں لکھا ہے:

''اکیسویں صدی کے مابعد جدید تناظر میں ''گیسوئے اسلوب'' نئے عہد کی اضافی تخلیقیت، اضافی معنویت، اضافی معاصریت اور اضافی فنیت افروزی کا یادگاری تنقیدی مکاشفہ ہے۔ڈاکٹر امام اعظم کی ذات و کائنات کی دیومالا میں بیک وقت دھرتی اور آسمان کی شعریات باہم دگر ایک ہوگئی ہے۔''

فاضل مصنف ایک کثیر التصانیف رائٹر ہیں۔۱۹۷۸ء سے تواتر کے ساتھ اپنے خوشہ چینوں کے لیے مضامین نو کے انبار لگا رہے ہیں، وہ نہ صرف تنقیدی مضامین لکھتے ہیں، بلکہ گزشتہ ۱۷ ربرسوں سے پابندی سے رسالہ 'تمثیل نو' بھی نکالتے ہیں۔دو شعری مجموعوں ''قربتوں کی دھوپ'' اور ''نیلم کی آواز'' کے علاوہ مختلف موضوعات پر ۱۶ رکتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔مگر یہ کثرت ان کی تحریروں کے معیار و اقدار پر اثر انداز

نہیں ہوئی ہے۔ ہر کتاب نظم وضبط کا آئینہ ہوتی ہے اور اس نے ادب میں نئے تنقیدی ڈسکورس کو تحریک وتقویت عطا کی ہے۔ امید ہے کہ ان کی دیگر تنقیدی کتابوں کی طرح ''گیسوئے اسلوب'' کی بھی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ اور انھوں نے ''گیسوئے تحریر''، ''گیسوئے تنقید'' اور ''گیسوئے اسلوب'' کے شعریت آمیز عنوان سے ادب شناسی/تنقید نگاری کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے، وہ یوں ہی جاری رہے گا۔ کتاب دیدہ زیب ٹائٹل اور گرد پوش کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کتابت وطباعت بھی صاف ستھری اور جاذبِ نظر ہے۔

نام کتاب: ابن صفی کے 101 اداریے: جائزہ مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
سن اشاعت: 2013ء صفحات: 179 قیمت: 200 روپئے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی
مبصر: غلام نبی کمار

برصغیر میں جاسوسی ناولوں کی تاریخ رقم کرنے والے ایک ممتاز اور ہردلعزیز ناول نگار ابن صفی کے کارناموں سے اردو ادب کا کون قاری واقف نہ ہوگا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کم وبیش دو سو تر پن ناول تخلیق کرنے والے ابن صفی کی ادبی دنیا جس قدر شہرت اور پذیرائی ہونی چاہیے، نہیں ہوئی۔ دنیا میں بہت سارے لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اردو زبان کے ادیبوں کی تعداد بھی کچھ اس سے کم نہیں۔ جن کی جیتے جی زمانے نے قدر نہیں جانی لیکن دنیا سے رخصت ہونے کے فوراً بعد ان کی عظمت کا احساس ہونے لگا۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کے معیار، وقار اور فن کی بلندی انہیں اعلیٰ پایہ کے ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ خصوصاً جاسوسی ناول نگاری میں ابن صفی کا ابھی تک کوئی ثانی پیدا نہیں ہوسکا۔ ابن صفی کی شخصیت اور ناول نگاری پر مختلف جامعات میں تحقیق ہو رہی ہے اور کچھ پبلشروں کی ذاتی کوشش بھی انہیں اپنا جائز مقام دلانے کی ایماندانہ سعی کر رہے ہیں۔ اس کوشش میں محمد عارف اقبال (مدیر اردو بک ریویو) کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔ اردو میں جو ادیب ابن صفی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں ان میں ایک اہم نام پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا ہے۔ جو اردو کے وہ گوہر نایاب ہیرے ہیں جنھوں نے اپنی علمی وادبی کاوشوں سے نہ صرف اس کے دامن کو وسعت بخشی بلکہ سرسبز وشاداب کرکے اسے زرخیز بھی بنا دیا۔

زیر نظر کتاب ''ابن صفی کے 101 اداریے: جائزہ'' کے علاوہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی ابن صفی پر لکھی گئی دو اور کتابوں میں ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز ومزاح'' اور ''ابن صفی کا جاسوسی سنسار'' قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ابن صفی شناسی میں ہرگانوی صاحب ایک اہم نام بن کر ابھرتے ہیں۔ ابن صفی پر دو سابقہ کتابوں کی طرح ان کی یہ کتاب بھی قارئین میں ایک خاص تاثر پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ ابن صفی اپنے ناولوں میں ''پیش رس'' کے نام سے اداریہ لکھتے تھے جنہیں ابھی تک منظر عام پر نہیں لایا گیا تھا۔ یہ اداریے ابن صفی کے ناولوں میں پوشیدہ کئی اہم

ISSN No. : 2395-2016

پہلوؤں کو سمجھنے میں بہت حد تک معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ''گفتنی'' کے عنوان سے مناظر صاحب نے ابتدائیہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے ابن صفی کے تعلق سے اپنے ابتدائی کام سے آگاہ کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ موصوف ناول نگار سے متعلق مزید کچھ موضوعات جیسے ان کے جاسوسی ناولوں میں ''اردو'' لفظ کا بکثرت استعمال اور فریدی سریز اور عمران سریز کے تحت سائنس کی موشگافیوں کو برتنا وغیرہ پر خامہ فرسائی کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا قلم مسلسل حرکت میں رہتا ہے اس لیے رکنا، تھکنا یا سست پڑ جانا وغیرہ جیسے الفاظ کی ان کی ادبی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جیسے کہ انھوں نے یہ عہد کر لیا ہو کہ ''مر کر دہی دم لیں گے''۔ اللہ تبارک وتعالی ان کی عمر میں برکت کرے تا کہ اردو ادب کے وہ کام جو ہمارے ذہنوں سے کوسوں دور ہیں البتہ ان کی دسترس میں ہیں وہ پایہ تکمیل کو پہنچ سکیں۔ مناظر صاحب نے ''گفتنی'' سے آگے بڑھتے ہوئے ابن صفی کے اداریوں کا بھی کچھ صفحات میں جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستانی قارئین کو اس کا علم نہیں ہوگا کہ ابن صفی نے اداریے بھی لکھے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں ان کے جتنے بھی ناول شائع ہوئے ان سب میں ابن صفی اداریہ ''پیش رس'' کے نام سے لکھتے تھے۔ تاہم ''جاسوسی دنیا'' اور ''نکہت'' میں ابن صفی کے جتنے بھی ناول چھپے ان میں اداریے علی عباس حسینی کے نام سے ہوتے تھے۔ اب مناظر صاحب کے مذکورہ اداریوں سے متعلق خیالات سے مستفید ہوتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

''ابن صفی کے ان اداریوں میں جاسوسی ناولوں کی کہانیوں کی باتیں ہیں، قارئین کے تاثرات کے جواب ہیں، عمران، فریدی، حمید، قاسم اور دوسرے کردار کا ذکر ہے، نئے کرداروں کی آمد کی جانکاری ہے، قارئین، اخبار اور بعض پبلشرز کے الزامات کے جواب ہیں، لطیفے کی پھلجھڑیاں ہیں اور موسم، ملکی حالات اور کراچی شہر کے مزاج کے بارے میں تفصیل ہے۔''

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ابن صفی کے 101 اداریوں میں اڑتیس اداریوں سے کچھ دلچسپ ٹکڑے لیے ہیں جس سے ان اداریوں کی افہام و تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں ان اداریوں میں پائی جانے والی خصوصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً ان اداریوں میں طنز کی کاٹ ہے، مزاح کی چاشنی ہے، لطیفے ہیں، ماحول کی صحرا نوردی ہے وغیرہ۔ ابن صفی کے یہ اداریے اردو اداریہ نگاری میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اداریوں میں مصنف اپنے ناولوں سے متعلق مسائل، قارئین کے سوالات کا جواب اور ان کی دلچسپیوں اور فرمائشوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ قارئین کی نفسیات سے آگاہ کرنے کے علاوہ نئے ناولوں اور کرداروں کی آمد کا اعلان اور کہیں کہیں ان کے رول سے واقف بھی کراتے ہیں۔ ابن صفی نے کرداروں اور ان کے ناموں میں بدلاؤ، کتابوں کا قارئین تک دیر سے پہنچنے کی وجوہات، چھپنے چھپانے کے مسائل اور کاغذ کے بڑھتے دام، پرانے اور نئے ناول کے کسی اہم واقعے کا تذکرہ اور کہیں کسی تاریخی واقعے کا ذکر چھیڑ کر اپنے اداریوں کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

ابن صفی ایک اداریے میں ''پیش لفظ'' کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ ایک اداریے میں سائنس فکشن

کے متعلق رقمطراز ہوتے ہیں۔ایک اداریے میں شائع ہوئی کتابوں کی کتابت اور پروف ریڈنگ کی غلطیوں کے متعلق جواب دہ ہوئے ہیں۔ایک اداریے میں پبلشر سے نالاں نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''چھوٹے موٹے پبلشرز کے خلاف اگر میں نے کوئی کارروائی کی بھی تو وقت کی بربادی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔پبلشروں سے تو عموماً معافی تلافی ہی پر بات ٹل جاتی ہے۔''

اس طرح ابن صفی نے کسی اداریے میں دانشورانہ باتیں کی ہیں، کسی اداریے میں خوش کن اور طبیعت بحال کردینے والی باتیں کرتے ہیں، کسی اداریے میں قارئین کی تلخ ترین خطوط کا جواب دیتے نظر آتے ہیں، کسی اداریے میں کہانی میں غم اور خوشی کی پیدا کی گئی کیفیت کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہیں، کسی اداریے میں سیاست سے متعلق بحث چھڑتی ہے تو بحث کو لطیفے کی شکل دے دیتے ہیں۔ابن صفی ایک اداریے میں قاری کے خط کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

''ایک صاحب نے اسلام آباد سے لکھا ہے کہ جنگلوں میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے جرائم تو بستیوں میں ہوتے ہیں۔پھر تہذیب و تمدن کو چھوڑ کر جنگل کی راہ کیوں لی جائے۔گزارش ہے کہ جنگل سے پھر کسی تمدن کے گہوارے ہی کی طرف رخ ہوجائے گا۔کیوں کہ تمدن کے گہوارے ہی جنگلوں کا سکون بھی غارت کرتے ہیں۔''

ابن صفی کے بیشتر اداریے ایسے ہیں جن میں یا تو وہ اپنے آنے والے ناولوں اور کرداروں سے متعلق آشنا کراتے ہیں یا اپنے قارئین کے خطوط کا جواب دیتے ہیں۔ان کی خاص بات یہ ہے کہ سخت لہجے میں لکھے گئے خطوط کا جواب بھی مشفقانہ انداز اور خلوص مندی سے دیتے ہیں۔جس میں ضاحت بھی کی گئی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ اس میں بیباکانہ اور دلیرانہ پن بھی صاف نظر آتا ہے۔جس سے نہ قاری کے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے اور نہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔بلکہ مصنف بڑے فنکارانہ انداز میں اپنا دفاع کرتا ہے۔کیونکہ اسے قاری کے دل کو جیتنا ہے۔اس بات کا ابن صفی نے بڑا خوب خیال رکھا ہے۔وہ قاری کی ہر بات کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان کی خواہشات پر پورا اترنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔لیکن اس دوران وہ فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''کسی بھی کہانی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں اور ان مدارج کی مناسبت ہی سے کچھ لکھا جاتا ہے۔ہر جگہ زور نہیں باندھا جاتا۔موقع بے موقع ڈرامہ پیدا کرنے سے آپ تو واہ واہ کرسکتے ہیں۔لیکن فن کا خون ہوجاتا ہے۔''

یہ اقتباس بھی ابن صفی کی فنکارانہ سنجیدگی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔اس کتاب کے تمام اداریوں پر ابن صفی کے دستخط ہے۔بعض اداریوں میں دستخط کے علاوہ تاریخ کا اندراج بھی ملتا ہے۔جبکہ بعض تاریخ کے اندراج سے خالی ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ عمران سریز کا پہلا داریہ 15 / جون 1956ء میں لکھا گیا۔

ISSN No. : 2395-2016

ہے۔کتاب میں شامل آخری اداریہ جس میں تاریخ مندرج ہے،3/ جون 1978ء کا لکھا ہوا ہے۔یہ کتاب پروف کی غلطیوں سے پاک ہے۔اس میں کتابت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔مزید مجلد اور خوبصورت طباعت سے مزین ہے۔کاغذ اچھا استعمال کیا گیا ہے اور قیمت بھی معقول رکھی گئی ہے۔یہ کتاب قارئین کے لیے بہت مفید بخش ثابت ہوسکتی ہے۔☆☆☆

نام کتاب: خوشبو کے حوالے (مجموعۂ غزل) مؤلف: بدر محمدی
ضخامت: ۱۶۰، قیمت: ۲۵۱ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷ء مبصر: ابرار احمد اجراوی

ریاست بہار سے تعلق رکھنے والے بدر محمدی کا شعری وفکری افق بہت اونچا ہے۔وہ قصۂ قدیم و جدید میں اسیر نہیں،روایت و جدت میں وصال و ملاپ کے حامی ہیں۔وہ الفاظ و معانی میں اتصال وارتباط کی انگلی پکڑے رہتے ہیں۔بدر محمدی اردو کے ساتھ فارسی میں بھی ماسٹر ڈگری رکھتے ہیں،اسی لیے نہ تو اپنے کلاسیکی ادبی سرمایے اور اردو کی جڑ بنیاد میں پیوست روڑوں سے بے بہرہ ہیں اور نہ نئے ادبی رجحانات وتحریکات اور نت نئے نظریات کی ہمہ ہمی سے۔شاعری،تنقید وتبصرہ اور ادبی صحافت ان کے تخلیقی وتحریری جولان گاہ ہیں۔وہ شعر کے ساتھ نثر کا بھی عمدہ وشستہ ادیبانہ ذوق رکھتے ہیں،تبصراتی تجزیاتی تحریروں کا مجموعہ ''امعان نظر'' باذوق افراد واحباب کی نظروں سے گزر بھی چکا ہے۔۲۰۱۱ء میں ان کا ایک اور شعری مجموعہ 'بنت فنون کارشتہ' شائع ہوکر مرکز بحث وسرمۂ نظر بن چکا ہے،مگر ان کے زیر نظر غزلیہ مجموعہ ''خوشبو کے حوالے'' کو ماقبل کے شعری مجموعے سے زیادہ پذیرائی،تحسین اور داد مل رہی ہے کہ ہر شاعر و فن کار کا اگلا قدم نئے پانی میں ہوتا ہے۔اس مختصر غزلیہ دیوان میں حمد ونعت کی رسم بسم اللہ ادا کرنے کے بعد شاعر نے غزلوں کی حسین اور عطر بیز وادی کی طرف رجوع کیا ہے۔

بدر محمدی کی شاعری انفس وآفاق کی شاعری ہے۔وہ شاعرانہ انہماک واشتغال کی جلوت گاہ سے نکل کر روح عصر کو فن کے وسیع تر دامن میں گل بوٹے کی طرح سجاتے ہیں۔وہ نجی محسوسات ومشاہدات کے ساتھ ہم عصر کرب و درد،نیرنگی زمانہ،گردش ایام اور یاس انگیز فضا کو بھی اپنی شاعری کا محور بناتے ہیں۔ان کی شاعری ذات وکائنات کے مٹی سے نمو پاتی ہے۔وہ خود کو نہ ماحول سے الگ کرتے ہیں نہ ماحولیات سے۔آرٹ ہو یا موسیقی ومصوری،شاعری ہو یا فن کاری؛یہ تخیل اور حقیقت کا عکس ونقش ہوا کرتی ہے،بدر محمدی بھی اپنی غزل کو نرے اور مجرد الفاظ ومرکبات کا آمیزہ بھی بننے نہیں دیتے،بلکہ اس میں آس پاس کی زندگی،سماجی احوال وکوائف زمانہ،انسانی معاملات وعام اخلاقیات کا رس بھی بھر دیتے ہیں۔عجلت میں شعر موزوں کرنا ان کا شیوہ نہیں،بلکہ پھونک پھونک کر اس دشتِ امکاں میں انھوں نے قدم رکھا ہے۔اور یہی وہ انفرادی اور انحرافی روش ہے کہ انھوں نے ایک غزل میں برملا کہا ہے:

آتے نہیں ہمیشہ مضامین غیب سے
آمد کے ساتھ ساتھ ہے آورد لازمی

اپنے جامع اور علمی مقدمہ میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے،وہ گویا ان کی غزل بیتی کا درجہ

رکھتے ہیں اور اس بات کا اشاریہ واعلانیہ بھی کہ وہ سوچ سمجھ کر، ٹھوک بجا کر غور وفکر کی پل صراط سے گزرنے کے بعد غزل گوئی کرتے ہیں، غیر ممسوس اور معصوم اچھوتے الفاظ وتراکیب کی تلاش میں سند باد کی طرح سرکھپاتے ہیں، مضامین وموضوعات کے غیر مختتم ولا محدود نادیدہ جہان کو کھنگالتے ہیں کہ یہ عمل اس سائنٹفک اور مشینی دنیا میں معیوب بھی نہیں رہا۔ لکھتے ہیں:

''مشق سخن میں اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ موضوع اور مضمون نیا ہے یا نہیں۔ پارینہ خیال کا نیا پہلو ہے یا نہیں۔ کلاسیکیت کو برقرار رکھا گیا ہے یا نہیں۔ روایت کے ساتھ جدت ہونے سے وہ زیادہ مقبول ہوتی ہے، اسے ہی فنی رچاؤ کہتے ہیں اور اسی سے اچھوتا پن آتا ہے۔ فنی رچاؤ، جدید خیالات وافکار اور اچھوتا پن یہ وہ تین خصوصیات ہیں جو کسی شاعر کے یہاں ہونے پر اسے حیات بخشتی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلوب اور شعری حسن نہ ہو تو کلام رسمی بن کر رہ جاتا ہے۔''

دیکھیے چند اشعار، جس میں فکر بھی نئی ہے، الفاظ وتراکیب بھی قدامت وکہنگی کے عیب سے منزہ ہیں اور انداز پیش کش میں بھی ندرت وجدت جلوہ گر ہے:

آسماں نے پڑھایا ایسا سبق
یہ زمیں اب تک امتحان میں ہے

تا عمر اگاتا رہا میں حشر کا پودا
ہے تخم قیامت مرے اعمال کے اندر

کتاب وقت کے اوراق پڑھیے
سبق لیجے نصاب روز و شب سے

یہاں ساری غزلوں سے نہ اشعار پیش کرنا ممکن ہے، نہ ہی یہ مستحسن عمل ہے کہ قاری انتخاب واختیار کے عمل میں کسی کنفیوژن اور ابہام کا شکار ہو جائے۔ مگر مذکورہ بالا چند اشعار سے بدر محمدی کی شعری کائنات کے ابعاد واطراف کا طواف کیا جاسکتا ہے اور آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ بدر محمدی نے فکر وخیال کی زمین پر نئے مضامین وموضوعات کی کاشت وپرداخت کی ہے۔ احساس واظہار کی دنیا ان کی اپنی بسائی ہوئی ہے۔ ان کے یہاں نہ تو بے جا قسم کی فرسودگی پر اصرار ملتا ہے، نہ تکرار واعادۂ مضامین کی کثرت ہے کہ شاعر خود کو دہرانے کا ملزم ٹھہرے۔ بدر محمدی نے مختلف نظریات وتحریکات کا مشاہدہ تو کیا ہے، مگر اپنے فن کو ان کے اثرات بد سے بچائے رکھا ہے۔ سخت اور مشکل زمین میں شعر کہتے ہوئے ردیف وقافیہ کی تنگی اور فن کی پابندی شاعر کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے، لیکن بدر محمدی ان تمام مشاکل وعواقب سے دامن بچا کر نکل گئے ہیں۔ انھوں نے اساتذۂ فن اور ہم عصروں سے بھی استفادہ کیا ہے، مگر ان مضامین ومفاہیم کو نئے انداز واطوار سے اپنی شاعری میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ باندھا ہے۔ ان کی غزلوں کی بعض ترکیبیں تو اتنی جدت آمیز ہیں کہ ان سے اردو کی نئی فرہنگ مرتب کی جاسکتی ہے۔ بدر محمدی کو نروان وعرفان کی دولت غزل شجر تلے ملتی ہے، وہ غزل کے شاعر ہیں اور اس کے ساتھ ان کی پائے دار ذہنی وابستگی بھی ہے۔ یوں بھی غزل حسینۂ ہزار عشوہ وادا

ہے۔اس ہرجائی صنف سخن کو قابو میں کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بدر محمدی کا فکری افق اتنا وسیع وعریض ہے کہ وہ سخت مضامین کو بھی غزل کے پیمانے میں ڈھال دیتے ہیں۔

محمد انوارالحسن جو اپنے قلمی نام انوارالحسن وسطوی سے معروف ہیں۔ سرزمین بہار کے ویسے قلم کار جنہوں نے اپنی

کتاب کا نام: نیرنگ قلم، مصنف: انوارالحسن وسطوی

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۲۲۵ روپے، صفحات: ۲۲۴ پبلشرز: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶

مبصر: ڈاکٹر احسان عالم، محلہ: رحم خاں، نزد الحراء پبلک اسکول، پوسٹ: لال باغ، دربھنگہ۔ 846004

تحریروں کے ذریعہ قارئین کا متاثر کیا ہے اور جو اپنی سادہ، سلیس، شستہ اور دلکش نثر کے لئے جانے پہچانے جاتے ہیں ان میں ایک نمایاں نام انوارالحسن وسطوی کا ہے۔ ان کے مضامین ہندوستان کے مختلف اخبارات، رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کئی اہم قلم کاروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، ناقدوں، افسانہ نگاروں کی شخصیت اور خدمات پر اپنی تحریریں قلم بند کی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''نیرنگ قلم'' میں پندرہ شخصیتوں پر اپنے مضامین شامل کئے ہیں تو دوسری طرف پندرہ کتابوں پر تبصرے بھی اس کتاب کی زینت بنے ہیں۔ اس کتاب میں جن شخصیتوں کے حوالے سے مضامین تحریر کئے ہیں وہ تمام اشخاص کسی کسی نہ نہج پر اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی، مظفر عالم ضیا عظیم آبادی، متین عمادی، پروفیسر رضیہ تبسم، پروفیسر طارق جمیلی، ناوک حمزہ پوری، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، اظہر نیر، پروفیسر عبدالمنان طرزی، شوکت حیات، مولانا ابوالکلام قاسمی، اشک امرتسری، منیر سیفی اور طارق متین کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی۔ وہیں تبصروں کی فہرست میں ''کتنا ہے بدنصیب ظفر، اردو میں مرصع نثر کی روایت، اردو زبان وادب کا ابتدائی دور، دیوان اوج، تلاش وتصنیف، متن اور مفہوم، فکر تونسوی: حیات وخدمات، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں: ایک شخص ایک کارواں، آئینۂ سیتا مڑھی، رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت، تنقیدی نگارشات، مانک ٹالا فنکار و محقق، سلطان اختر کی شاعری، کچھ محفل خوباں کی اور پیام صبا'' نام کی کتابیں شامل ہیں۔

''حرف آغاز'' کے عنوان سے اپنے پیش لفظ میں انوارالحسن وسطوی فرماتے ہیں: ''راقم السطور کے تحریر کردہ ادبی وتاثراتی مضامین کے مداح جہاں بہت سارے نامور ناقدینِ ادب رہے ہیں، وہیں کتابوں پر لکھے میرے تبصروں میں کئی حضرات کو ایک کمی کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں اس کے مندرجات کی خامیوں اور غلطیوں کی جانب نشاندہی کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ لوگوں کی یہ شکایت بجا ہے لیکن اس تعلق سے میرا موقف یہ ہے کہ میں گلستاں کی سیر پھولوں کے حسن، رنگینی اور خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لئے کرتا ہوں، کانٹوں کی تلاش کے لئے لیے نہیں کرتا۔''

پیش نظر کتاب میں انوالحسن وسطوی نے تنقیدی مضامین کو جمع کرنے کا کام ہے۔ان کی تنقید تاثراتی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔تاثراتی تنقید کے ذریعہ نصب العین واضح طور پر سامنے نہیں آتا ہے۔اس کتاب میں شامل ان کے سارے تنقیدی مضامین ادبی صداقت کی جلوہ گری پیش کرتے ہیں۔ان کا طرز تحریر سادہ، سلیس اور رواں دواں ہے۔ان کے مضامین کو پڑھنے کے بعد کہیں سے ذہن بوجھل ہوتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ایک دلچسپی برقرار رہتی ہے جو ان کے تمام مضامین کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

پیش نظر کتاب کا پہلا مضمون ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی پر ہے۔وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں وہ ایک طرف عظیم مجاہد آزادی تھے تو دوسری جانب بے لوث قومی وملی رہنما تھے۔ساتھ ہی ساتھ ایک مبلغ اسلام، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار، بہترین شاعر، نثر نگار اور ایک ماہر طبیب کی حیثیت سے معروف تھے۔

کتاب میں ایک مضمون ''مناظر عاشق ہرگانوی کے انشائیوں میں طنز ومزاح کے عناصر'' کے عنوان سے شامل ہے۔پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اپنی کثیر الجہتی اور بسیار نویسی کے لیے صرف بہار یا ہندوستان میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر مشہور ہو چکے ہیں۔اردو ادب کے تقریباً ہر صنف میں انہوں نے اپنی تخلیقات کے جوہر دکھائے ہیں۔ بیک وقت وہ ایک اعلیٰ معیار ناقد، ناول نگار، افسانہ نگاری، ڈراما نگار، انشائیہ نگار، بچوں کے ادیب اور بہترین صحافی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ایک مضمون پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب کے منظوم تبصرے پر ہے۔پروفیسر عبدالمنان طرزی عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ایک معتبر مقام حاصل کر چکے ہیں۔۲۰۱۶ء میں انہوں نے منظوم تبصرے پر ایک کتاب تحریر کی جسے ڈاکٹر منصور خوشتر نے ترتیب دیا ہے۔اس کتاب پر انوارالحسن وسطوی نے ایک بسیط تبصرہ قلم بند کیا ہے۔

اس طرح چند مضامین کے تذکرہ سے ساتھ بات مکمل نہیں کی جاسکتی ہے۔لیکن ان مضامین کا تذکرہ میں نے حوالے کی طور پر پیش کیا ہے۔اس کتاب میں سارے مضامین معلوم افزا ہیں۔امید ہے اس کتاب کی پذیرائی ضرور ہوگی۔☆☆☆

کچھ لوگ نام ونمود کی تمنا سے اس قدر بے نیاز ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے سرمایۂ فکر وفن کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ایسے

نام کتاب: صدائے اعظم (شعری مجموعہ) مرتب: ڈاکٹر عبدالودود قاسمی
سال اشاعت: 2018 ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷ء
مبصر: کامران غنی صبا

درویش صفت لوگوں کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔یہ لوگ فیض کا ایک دریا ہوتے ہیں جو خاموشی سے بہتا رہتا ہے۔جس کی اہمیت کا اندازہ تب ہوتا ہے جب دریا بہتے بہتے رک جاتا ہے۔فاروق اعظم انصاری مرحوم کا شمار ایسے ہی درویش صفت شعراء میں ہوتا ہے۔وہ تازندگی گیسوئے شعر وادب کو سنوارتے رہے۔دنیا ان سے فیض اٹھاتی رہی لیکن خود انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا۔''بزم رہبر'' کے نام سے قائم ادبی

انجمن میں پابندی سے ہونے والے مشاعروں کے متعلق کون نہیں جانتا۔ فاروق اعظم انصاری مرحوم نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک 'بزم رہبر' کو زندہ رکھا۔ وہ اپنے ذاتی خرچ سے مشاعرہ کراتے رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ فاروق اعظم انصاری مرحوم نے 'بزم رہبر' کو اپنی ذات سے زیادہ اہمیت دی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کا کوئی مجموعۂ کلام تک منظر عام پر نہیں آسکا۔ اللہ بھلا کرے ڈاکٹر عبدالودود قاسمی صاحب کا کہ انہوں نے حقِ شاگردی ادا کرتے ہوئے اپنے مرحوم استاد کے منتشر کلام کو یکجا کر کے کتابی صورت دینے کا بیڑا اٹھایا ورنہ فاروق اعظم انصاری کی وفات کے ساتھ ساتھ ان کا شعری سرمایہ بھی ختم ہو چکا ہوتا۔

ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کا نام ادب و صحافت کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک عالمِ باعمل، بہترین استاد، صاحب طرز انشاپرداز اور بے مثال منتظم کے طور پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اسلاف کے کارناموں سے محبت ان کے خون میں رچی بسی ہے۔ اسی محبت نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے استاد مرحوم کے شعری سرمایہ کو کتابی صورت میں جمع کریں جس کا نتیجہ زیر تبصرہ کتاب ہے۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر اویس احمد دوراں، ڈاکٹر عطا عابدی، اشرف استھانوی، ڈاکٹر ریحان غنی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، جمیل اختر نقش بندی، حکیم صدر الحسن عطار، معراج غالب، ڈاکٹر ایس اے ایچ عابدی، انجینئر عمر فاروق رحمانی، انجینئر محمد خورشید عالم اور الحاج ماسٹر اسد احمد کے مضامین اور پروفیسر عبدالمنان طرزی، رہبر چندن پٹوی، رفیق انجم، پروفیسر خلیل الرحمٰن سلفی، علاؤالدین حیدر وارثی، صبا دربھنگوی، ڈاکٹر محمود بھارتی، ڈاکٹر محمد اسلام فیضی، امان ذخیروی، ڈاکٹر منوری راہی، شکیل سہسرامی، جمیل اختر شفیق وغیرہ کے منظوم تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب کتاب نے کتاب کی اشاعت میں بھرپور محنت کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کی ترتیب شدہ یہ کتاب فاروق اعظم انصاری صاحب کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ محبان شعر وادب خاص طور سے عقیدت مندان فاروق اعظم انصاری کو ان کا یہ شعری مجموعہ ضرور خریدنا چاہیے۔

کتاب کا نام: اظہر نیر: شخصیت اور خدمات، مرتب: ڈاکٹر سید محمد احتشام الدین
اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، صفحات: ۱۹۲ پبلشرز: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۶
مبصر: ڈاکٹر احسان عالم، محلہ: رحم خاں، نزد الحراء پبلک اسکول، پوسٹ: لال باغ، دربھنگہ۔ 846004

پیش نظر کتاب ''اظہر نیر: شخصیت اور کارنامے میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کو سی ایم کالج دربھنگہ کے ایک ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد احتشام الدین نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں کل ۳۱ رمضامین ہیں۔ سارے مضامین بزرگ شاعر اور افسانہ نگار اظہر نیر کی شخصیت اور ادبی کارناموں کو اجاگر کرتے ہیں۔ تیرہ صفحات پر کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید احتشام الدین نے اپنا عرض مرتب بعنوان ''اظہر نیر شخصیت اور خدمات پر ایک نظر'' پیش کیا ہے۔ اپنے اس طویل مضمون کے ذریعہ مرتب نے کتاب کی ایک مختصر جھلک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالمنان طرزی کے منظوم تاثر جو ''اظہر نیر اور غزل'' کے عنوان سے ہے پیش خدمت ہے۔

پروفیسر نادم بلخی (مرحوم) نے ''اظہر نیر۔ بحیثیت جدید خلقِ منظومات'' کے عنوان سے بڑا پُر مغز مضمون تحریر کیا ہے۔ ان کی مختلف نظموں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

> ''اب تک میرے نگاہ سے اظہر نیر کی جتنی نظمیں گذری ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد آزاد نظموں کی ہیں۔ دوسری خصوصیت میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ زیادہ ترمنی (مختصر نظموں) کی تخلیق سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بری بات نہیں۔ انہوں نے پابند نظمیں بھی کہی ہیں لیکن شاید ویسی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں۔ اس طرف بھی ان کو خصوصی دھیان دینا چاہئے۔''

دیپک بدکی (غازی آباد) نے ''ببول کے سائے کا طلب گار۔ اظہر نیر'' کے عنوان سے اپنا مضمون تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اظہر نیر کی شاعری کے کئی جہات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اظہر نیر کی شاعری میں ذاتی غم بھی جھلکتا ہے اور اجتماعی غم بھی، وہ جس معاشرے میں رہتے ہیں اس کے تنزل کے بارے میں وہ فکر مند ہیں۔ ذات سے متعلق ان کی شاعری میں محبوب کی پیکر تراشی بھی ملتی ہے اور جدائی کا غم بھی۔ اس موضوع پر انہوں نے ''احساس''، ''گم شدہ''، ''یادیں'' اور ''رشتہ'' جیسی خوبصورت اور دلگداش نظمیں لکھیں ہیں۔ نظموں کے علاوہ اظہر نیر کی غزلوں میں بھی حسن وعشق اور ہجرو صال کا بیان جا بجا ملتا ہے۔''

عظیم اختر (نئی دہلی) اور رام پرکاش کپور (گڑگاؤں) نے اظہر نیر کا تذکرہ بھلائی شہر کے حوالے سے کیا ہے۔ جس وقت موصوف اپنی روزی روٹی کے لئے بھلائی شہر میں قیام پذیر تھے۔

معروف ادیب اسلم بدر (جمشید پور) نے ''ببول، دھوپ، سائے اور اظہر نیر'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔

حباب ہاشمی (الہ آباد) نے ''اردو زبان کا ایک سچا کادم، ایک خوش فکر شاعر۔ اظہر نیر'' اور ڈاکٹر افسر کاظمی (جمشید پور) نے ''اردو کا سچا خادم۔ اظہر نیر'' کے عنوان سے اظہر نیر کے پرانے دنوں کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بوکارو قیام کے دوران ان کی اردو سے متعلق سرگرمیوں پر نظر ڈالی ہے۔ یہ بھی بڑے حوصلہ کا کام ہے کہ اظہر نیر نے ان دنوں اس ویرانے میں اردو کا رنگین پھول کھلانے کی کوشش میں لگے رہے۔

انوارالحسن وسطوی آج کے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے بہت سے مضامین ہندوستان کے معتبر رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے ''اظہر نیر۔ شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون تحریر کیا ہے۔

عرش صہبانی ''اظہر نیر کا شعری سفر'' کے عنوان سے ان کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''جن

شاعروں نے اپنی تخلیقات کی بناپر اردوادب میں مقام پیدا کیا ہے ان میں اظہر نیر بھی ایک اہم نام ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کی طبیعت کا رجحان غزل کی طرف ہے یا نظم کی طرف۔ ان کی نظمیں نثری نظمیں ہیں لیکن نظمیں پڑھنے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ نظمیں صرف خیال تک محدود نہیں۔ ان میں اگر خیال ہے تو اظہر نیر اس خیال کو نبھانا بھی جانتے ہیں۔ اس صورت میں نظم میں شعریت قدرتی بات ہے۔ الفاظ کا موزوں انتخاب، ہی انہیں قابل توجہ بنادیتا ہے اور اس طرح یہ دل میں اتر جاتی ہیں۔

سید سجاد بخاری (چنئی) ''اظہر نیر کی کائناتِ شاعری'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جناب اظہر نیر دور حاضر کے ایک منفرد اور پروقار شاعر ہیں اور ان کی شاعری اعلیٰ ترین اوصاف شاعری کی غماز ہونے کے ساتھ ساتھ جدید شعری اظہاریہ کی علمبردار بھی ہے۔ خودی اور خودداری جس طرح اظہر نیر کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، ان کی شعری تخلیقات بھی برابر اس کی پاسداری کرتی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد عصر حاضر کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے ''زندگی اور حسن زندگی بیان کرنے والا شاعر: اظہر نیر'' کے عنوان سے اظہر نیر کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ شاغل ادیب، سید احتشام الدین، راقم الحروف، احسن امام احسن، محسن باعش حسرت، بدر محمدی، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر منصور خوشتر، عبدالمتین جامی، رہبر جونپوری، قمر سنبھلی، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی، سلیم انصاری، شکیل گوالیاری، بسمل عارفی، رؤف جاوید، غلام نبی کمار وغیرہ کے مضامین بھی توجہ طلب ہیں۔ ان سارے مضامین نے اس کتاب کو اظہر نیر کے سلسلہ میں معلومات کا ایک ذخیرہ بنادیا ہے۔ امید ہے اس کتاب کی پذیرائی ادبی حلقوں میں ہوگی۔ کتاب کی چھپائی اور سرورق کافی دیدہ زیب ہے۔

☆ کتاب کا نام: ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، اشاعت: ۲۰۱۸ء، صفحات: ۹۶ مبصر: ڈاکٹر احسان عالم، رحم خاں، دربھنگہ

پیش نظر کتاب معروف ادیب ودانشور ڈاکٹر امام اعظم کے فن پر تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف تقریباً دوسو پچیس کتابوں کے مصنف اور عالمی شہرت یافتہ ادیب پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں اپنی گفتنی کے علاوہ اٹھارہ مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت دی ہے۔ ساتھ ہی کتاب کے آخر میں کچھ تصاویر سے بھی کتاب کو آراستہ کیا گیا ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اپنی گفتنی میں فرماتے ہیں: ''امام اعظم خود احتسابی سے گذرتے رہتے ہیں اور قول وفعل کی عکاسی کرتے رہتے ہیں۔ بعض کمزوریاں بھی ان میں ہیں جن کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے جھنجھلاہٹ ہوتی ہے لیکن ان کے عزم محکم اور عمدہ تہذیبی فکر کے آگے یہ سب عمل روشن چراغ بن کر تحرک آشنا ذہن کو فہم کے مطابق

ڈھال لیتا ہے اور معاملات سے آگے پیچھے زمانہ ساز بن جاتے ہیں۔اس لئے کہ تخلیق کار معاشرے کا حساس اور باشعور فرد ہوتا ہے اور ہر صورت میں اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔''

کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر امام عظم کی کئی فکری اور فنی جہتوں کا علم ہوتا ہے۔ڈاکٹر اعظم جدید نسل کے خوش فکر شاعر ہیں۔ان کی غزلیہ اور نظمیہ شاعر متاثر کرتی ہے۔ان کی نثریں بھی کافی اچھی ہوا کرتی ہیں۔ان کی طبیعت کو غزل سے خاص مناسبت ہے۔غزل کے اور خاص طور پر جدید غزل کے مزاج کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

اپنے ایک مضمون ''ڈاکٹر امام اعظم کی شاعری میں تخلیقی پیکریت'' میں پروفیسر ہرگانوی کہتے ہیں کہ ''غزل کے موضوع کا تعلق کائنات کی ہر شئے سے ہے، جس میں مادیت اور باطنی کیفیات کا دخل ہوتا ہے۔امام اعظم کی غزلوں کے موضوعات کی نوعیت الگ الگ ہے۔اگر حسن و عشق کو لیں تو ان میں جذبات کی فراوانی کا احساس ملتا ہے۔رنج و غم، حسرت و مسرت، رحم و جبر، ستم و جور، محبت و بغض اور ہجر و وصال سبھی کچھ نمایاں ہیں۔کسک، تڑپ، غیرت و حمیت اور خارجی و داخلی احساس کا حقیقی اظہار مندرجہ ذیل اشعار سے نمایاں ہے:

محبت میں محض جھوٹی تسلی جان لیوا ہے — اسی کو سوچ کر اپنوں سے دلداری نہیں کرتا
زوال آمیز جب رفتار الفت دیکھتا ہوں میں — نشیب عشق پر اظہار بیزاری نہیں کرتا

اس کتاب میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ڈاکٹر امام اعظم کی منطقی تنقید پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں ''جہاں تک ڈاکٹر امام اعظم کی تنقیدی فکر کی بات ہے انہیں اپنی خصوصیت پر بھروسہ ہے اس لئے کہ انہوں نے محض تاثرات کو اپنی تنقید کی بنیاد یا نظام فکر کا مرکز نہیں بنایا ہے بلکہ تاثرات کو فنی خوبیوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور فنی کارنامے سے گہرے لگاؤ کی مثال پیش کی ہے۔''

ڈاکٹر امام اعظم کی فکری اور فنی خوبیوں سے متعلق پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے دیگر مضامین ''ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب میں تاریخی نقوش، ڈاکٹر امام اعظم: ہندوستانی تہذیب اور کثرت میں وحدت، ڈاکٹر امام اعظم کے نام نظیر صدیقی کے خطوط کی معنویت، ڈاکٹر امام اعظم کی ''نصف ملاقات'' جائزہ، ڈاکٹر امام اعظم کی دو کتابیں مظہر امام کے حوالے سے، ڈاکٹر امام اعظم کے ترجمے میں تخلیقی وژن، ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب ''اقبال انصاری: فکشن کا سنگ میل''، ڈاکٹر امام اعظم کے حوالے سے ہندوستانی فلمیں اور اردو، ڈاکٹر امام اعظم کی عبدالغفور شہباز پر مستند کتاب، ڈاکٹر امام اعظم کی ترتیب ''فاطمی کمیٹی رپورٹ'' تجزیہ، ڈاکٹر امام اعظم کی نشان دہی نقد پارے میں، ڈاکٹر امام اعظم کے نام مناظر عاشق ہرگانوی کے خطوط، ڈاکٹر امام اعظم کے ''تمثیل نو'' میں ۳ خطوط، ڈاکٹر امام اعظم کے ''تمثیل نو'' کے ۱۱ شماروں پر تبصرے'' اس کتاب میں شامل ہیں۔یہ سارے مضامین ڈاکٹر امام اعظم کی مختلف جہتوں کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

اس طرح پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ کتاب ڈاکٹر امام اعظم سے متعلق باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔کتاب دیدہ زیب ہے۔امید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔

کیول دھیر اردو کے ایک نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔جن کا تخلیقی سفر کئی دہائیوں پر مشتمل ہے۔ان کے کئی افسانوی

نام کتاب: کیول دھیر کہانیاں (تجزیاتی مطالعہ) مرتب: ارتضیٰ کریم

سال اشاعت: 2018 صفحات: 592 قیمت: 600 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: غلام نبی کمار

مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ کیول دھیر نے سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ انھیں بیک وقت اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں میں بھی کہانی لکھنے کا ہنر ہے اور مذکور ہر زبان میں ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ انگریزی پر انھیں اچھی خاصی دسترس ہے۔ لیکن فکشن میدان خصوصاً اردو فکشن میں کیول دھیر کا پنجاب میں کوئی ثانی نہیں۔ کیول دھیر نے نہ محض ہندوپاک بلکہ پورے برصغیر میں جہاں جہاں اردو پڑھی، لکھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے، شہرت پائی اور انھوں نے ہر طبقۂ فکر کو اپنی علمی استعداد اور فنی و تخلیقی اظہار سے متاثر کیا ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر پہلی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن ارتضیٰ کریم کی تازہ ترین ترتیب شدہ کتاب ''کیول دھیر کہانیاں؛ تجزیاتی مطالعہ'' ان سب سے انفرادیت کی حامل ہیں۔

''کیول دھیر کہانیاں: تجزیاتی مطالعہ'' میں تین باب ہیں۔ باب اول ''تجزیے'' پر مشتمل ہے جس میں کیول دھیر کی کہانیوں پر کئی مشاہیر ادب اور معتبر ناقدین نے تجزیے کیے ہیں۔ باب دوم ''جائزے'' پر محیط ہے جس میں ان کی کتابوں پر کیے گئے چند اہم تبصروں کو جگہ دی گئی ہے۔ باب سوم ''کہانیاں: زیر تجزیہ'' میں وہ کہانیاں ہیں جن پر نقد و تجزیے ہو رہے ہیں۔ آغاز میں مرتب کتاب ارتضیٰ کریم نے پیش لفظ لکھا ہے۔ ارتضیٰ کریم کے تعلق سے اگر بات کریں تو ان کا ترتیب و تالیفی کام باب بہت متاثر کن رہا ہے۔ انھوں نے کئی مشاہیر ادبا مثلاً قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، میر ناصر علی دہلوی وغیرہ پر بہت اعلیٰ کام کیا ہے جس کی دستاویزی اور تاریخی حیثیت ہے۔ ان کی ترتیب کردہ کتابیں بہت پسند کی جاتی رہی ہیں۔ کیول دھیر پر ترتیب دی گئی یہ کتاب بھی بہت ضخیم اور بہت معیاری مشمولات سے مزین ہے جس میں صرف چنندہ تجزیوں کو ہی شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ارتضیٰ کریم پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> ''اس میں مشاہیر کے مضامین کے علاوہ کیول دھیر کی کہانیوں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ دراصل تجزیہ ہی اس کتاب کا بنیادی مقصد ہے کیونکہ کہانیوں کے بہت سے جوہر تجزیوں سے ہی سامنے آتے ہیں۔ تجزیے کے ذریعے کسی بھی تخلیق کار کے فکری اور فنی اعماق تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کے لسانی اور فنی اظہار کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں۔ کیول دھیر پر شخصی اور فنی نوعیت کے مضامین تو بہت لکھے گئے مگر ان کے افسانوں کے تجزیے نہیں ہو پائے تھے۔ اس کتاب میں ان کے نمائندہ افسانوں کے تجزیے شامل کیے گئے ہیں تا کہ مختلف تجزیاتی ذہنوں کے ذریعے ان کی کہانیوں کی پرکھ اور پہچان کا ایک سلسلہ قائم ہو اور یہ واضح ہو پائے کہ سیدھی سادی کہانیوں میں بھی بہت سارے ایسے مضمرات ہوتے ہیں جن تک عام ذہن کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔''

ارتضیٰ کریم نے اس کتاب میں شامل تجزیوں، کتاب کے وجود اور اس کی اہمیت کے حوالے سے مذکورہ اقتباس میں بہت خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے کتاب میں موجود مضامین و تجزیوں کے حوالے دے کر

ISSN No. : 2395-2016

گفتگو کو اچھی طرح سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ ''کیول دھیر کہانیاں: تجزیاتی مطالعہ'' کا ابتدائیہ پروفیسر قدوس جاوید نے بعنوان ''کیول دھیر: تعمیری آئیڈیالوجی کا افسانہ نگار'' تحریر کیا ہے۔ قدوس جاوید نے کیول دھیر کے افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے افسانوں میں کلاسیکی افسانہ کی روایات اور رسومیات اور عصری افسانہ کے فنی و فکری اور جمالیاتی اجتہادات کو اپنے انداز میں برتنے کا ایک ایسا منفرد تخلیقی رویہ ملتا ہے جس کی وجہ سے ہر مکتبہ فکر ذوق کے قارئین اور ناقدین اُن کے فن کو سراہتے رہے ہیں۔

اس کتاب کے باب اول میں کیول دھیر کے بتیس افسانوں پر چوالیس ناقدین کے تجزیے ملتے ہیں۔ جن افسانوں پر تجزیے کیے گئے ہیں ان میں ہم دونوں، حادثہ، بدچلن، شناختی کارڈ، تو کیا ہوا، انتقام، میں شرمسار نہیں ہوں، کمپی ٹیشن، وہ لڑکا وہ لڑکی، نمائش، دہشت، لہو کا رنگ، رشتوں کی پہچان، تم وہی ہو، اپنا دامن اپنی آگ، احساس، جذبوں کا کھیل، خلش، زندگی خواب اور حقیقت، ٹوٹتے کنارے، پیاسی روحیں، لہو کی لکیریں قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں پر اعجاز علی ارشد، فرحت پروین، مجاہد الاسلام، خورشید سمیع، ظہیر انور، ستیہ پال آنند، مشرف عالم ذوقی، اقبال حسن آزاد، انجم عثمانی، اقبال واجد، شہناز رحمٰن، فاروق بخشی، اسلم جمشید پوری، حقانی القاسمی، نگار عظیم، مناظر عاشق ہرگانوی، نورالحسنین وغیرہ نے بے حد عمدہ تجزیے کیے ہیں۔ باب اول کے ہی دوسرے حصے بعنوان مشترکہ تجزیے (یعنی دو افسانوں پر ایک نقاد کا تجزیہ) میں 'حادثہ اور تو کیا ہوا، وہ لڑکا وہ لڑکی اور یادوں کے کھنڈر، کمپی ٹیشن اور رشتوں کی پہچان، بکھری ہوئی زندگی اور میں اور وہ، واسنتی اور انسان مر گیا' افسانوں پر شائستہ فاخری، پرویز شہریار، محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر طاہرہ اقبال اور فیاض احمد وجیہہ نے تجزیے کیے ہیں۔

دوسرا باب جائزے پر محیط ہے جس میں کیول دھیر کی کتابوں پر تبصروں کو جگہ دی گئی ہے۔ جس میں پاؤں پاؤں بڑھتا کہانی کار، تخلیقی بیانیہ اور کیول دھیر، مہا پرش۔ ڈاکٹر کیول دھیر، اردو کا ایک منفرد کہانی کار کیول دھیر، کیول دھیر کی کہانیاں، حقیقت اور رومان کا افسانہ نگار، کیول دھیر کے افسانے، کیول دھیر۔ کہانی سے کہانی تک، کیول دھیر۔ ایک دردمند افسانہ نگار، کیول دھیر ایک قابل افسانہ نگار، کہانی اور کیول دھیر کی افسانہ نگاری، ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانیاں، کیول دھیر کہانیوں کا مسیحا، ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانیاں۔ ایک تاثر، ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانی۔ تجزیاتی مطالعہ کے بعنوان بالترتیب جوگندر پال، ستیہ پال آنند، ابدال بیلا، محمد زماں آزردہ، منشایاد، صغیر افراہیم، علی احمد فاطمی، عزیز پریہار، غضنفر، ف۔ س۔ اعجاز، شین کاف نظام، عبدالکریم خالد، رخسانہ نور، ڈاکٹر آصف ہمایوں اور سیفی سرونجی کے جائزے قابل ذکر ہیں۔

تیسرے باب میں کیول دھیر کی کہانیوں کا انتخاب رکھا گیا ہے۔ اس باب کے لیے کیول دھیر کی انہیں کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن پر زیر نظر کتاب میں تجزیے شامل کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ارتضٰی کریم نے کیول دھیر کی افسانہ نگاری سے متعلق قارئین کو بہت ہی اہم اور معلوماتی مواد فراہم کر دیا ہے۔ یہ کتاب آئندہ

ISSN No. : 2395-2016

نسل اور آج کے قارئین خصوصاً فکشن سے دلچسپی رکھنے والے اور اس موضوع پر تحقیق کرنے والے حضرات کے لیے یہ کسی خزینے سے کم نہیں۔

کتابی سلسلہ: سہ ماہی ''ثالث'' 12 مدیر اعزازی: اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح جلد۔3، شمارہ۔12 سن اشاعت: 2018 قیمت فی شمارہ: 150

سالانہ: 500 روپیہ ناشر: ثالث آفاق صالح مبصر: غلام نبی کمار

سال چار موسموں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر موسم اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے گل کھلاتا رہتا ہے۔ اس دوران سرد و گرم ہواؤں کا بھی سامنا ہوتا ہے لیکن بہر حال چاروں موسموں کا آنا اور ہر موسم کا اپنا اثر چھوڑ جانا ایک فطری عمل ہے۔ ''ثالث'' کے روح رواں ایک ایسی ہی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کا رسالہ بھی نہایت استقلال کے ساتھ صحیح وقت پر دستک دے کر قارئین کے دلوں میں اپنا گھر کر جاتا ہے۔ یہ بھی ''ثالث'' کی ایک خاص انفرادیت ہے۔ آزاد صاحب ''ثالث'' کو مسلسل اور سلیقہ شعاری کے ساتھ شائع کر رہے ہیں جو اردو کے تئیں ان کے جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔ وگرنہ آج کے زمانے میں رسالے کی اشاعت کو برقرار رکھ پانا کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں۔ مختلف موضوعات پر وقیع تحریروں کا انتظار نیز ان کی پرکھ اور پھر بڑے آزمائشی مرحلے (اشاعت) سے گزار کر رسالے کو مختلف خریداروں اور محبان اردو تک پہنچانا اور بھی بے حد صبر آزما کام ہے۔ لیکن آزاد صاحب ہیں بڑے جگر والے، جو اس جریدے کو قارئین تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ ''ثالث'' کے چار شمارے سال کے چار موسموں میں ہی آجاتے ہیں۔ موسموں کے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ کوئی موسم بے اثر بھی جاتا ہے لیکن ''ثالث'' کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شمارہ اب تک قاری کی توجہ کو اپنی جانب مرکوز و مبذول کرانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کے آنے سے آندھی طوفان کی توقع نہیں کی جا سکتی یعنی ''ثالث'' کو پڑھ کر قاری کا وقت ضائع نہیں ہو جاتا البتہ اس کے علم اور فکر میں اضافہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ''ثالث'' نے نہ محض ہندوستان میں بلکہ بہت کم وقت میں بیرونی ممالک میں بھی اپنی کامیابی کا لوہا منوایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ممالک کے قارئین کی علمی اور ادبی پیاس بھی بجھائی ہے۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ''ثالث'' ایک ''انٹرنیشنل چہرہ'' بن گیا ہے۔

''ثالث'' 12 کا آغاز اداریہ سے کیا گیا ہے۔ جو اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کو ادب کی عصری صورت حال پر محیط رکھا گیا ہے جس میں ''تنقید کیا ہے'' اور ''صحیح اور استدلالی تنقید'' کی بحث چھیڑی گئی ہے۔ نیز قدامت پسند ادیبوں اور نئی طرز کی ایجادات کے ادبی فوائد بھی اجاگر کیے گئے ہیں۔ مشمولات کی ابتدا ذوالفقار نقوی کے حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد شفیع الرحمٰن شفیع (دو غزلیں)، مرغوب اثر فاطمی، ڈاکٹر منصور خوشتر، ساجد حمید (چار

غزلیں) شکیل جمالی (دوغزلیں)، وفا نقوی، جمیل ارشد (دوغزلیں) شامل ہیں۔ متفرق مضامین میں اجالوں کی سیاہی کا منظر نامہ از ڈاکٹر منظر اعجاز، شکیلہ اختر اور ان کی ترقی پسندانہ واقعیت شعاری از ڈاکٹر ہمایوں اشرف اور مولانا محمد حسین آزاد کی نظم نگاری از ڈاکٹر ندیم احمد قابل ذکر ہیں۔ ''ثالث'' میں اس بار اردو کے معروف ترقی پسند شاعر، نقاد اور محقق پروفیسر قمر رئیس پر گوشہ شائع کیا گیا ہے۔ قمر رئیس برسوں تک دہلی یونیوسٹی کے شعبہ اردو میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اتنا ہی نہیں اردو ادب میں موصوف نے کئی کارہائے نمایاں بھی انجام دیے ہیں۔ اقبال حسن آزاد نے ان پر گوشہ شائع کر کے انہیں بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ''ثالث'' کے تازہ شمارے میں قمر رئیس کی کوائف کے علاوہ قمر رئیس کے فن پر ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور پروفیسر محمد ظفر الدین کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں قمر رئیس کی شعری تخلیقات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ ''ثالث'' میں اس بار پانچ افسانہ نگاروں محمد جاوید انور، ناصر بغدادی، نجمہ محمود، محمد الیاس گوندل، احمد عرفان کے افسانوں کے علاوہ ناہید طاہر کا مائیکروفکشن اور انتخاب کے تحت اقبال حسن آزاد کا افسانہ بندوبست اور پھر اس پر ارشد عبدالحمید کا تجزیہ بعنوان ''افسانہ بندوبست کا بست وکشاد'' کی اشاعت بھی عمل میں آئی ہے۔ ناول کا ایک باب میں پاکستانی ناول نگار اقبال حسن خاں کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا ایک باب شائع کیا گیا ہے جس کے کچھ باب ''ثالث'' کے سابقہ شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔ کل ملا کر فکشن کے باب میں بیرونی ممالک خصوصاً پاکستانی فکشن نگار پوری طرح حاوی نظر آتے ہیں۔ ''فلم کا باب'' ثالث کی ایک اور کامیابی ہے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانا چاہیے۔ کیونکہ بعض قارئین ہندی سینما سے متعلق جانکاری کے بھی شوقین ہوتے ہیں۔ تازہ شمارے میں ہندی فلم کے بے تاج بادشاہ اور ممتاز اداکار دلیپ کمار پر ''یوسف ثانی'' کے بعنوان شکور پٹھان کا بے حد عمدہ مضمون ہے جس میں شہنشاہ جذبات سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ''ثالث'' کا ایک حصہ شوہر نامہ کے تحت رکھا گیا ہے۔ اس شمارے میں شائستہ انجم نوری کا مشتاق احمد نوری پر ''میرے مجازی خدا'' کے بعنوان خاکہ شائع ہوا ہے جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس کے بعد ''ثالث'' میں تبصرے کا حصہ ہے جس میں ثالث اور مختلف کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ آخر میں مکتوبات کا گوشہ ہے۔ اس مایہ ناز جریدے کے اب تک چند اہم اور ضخیم شمارے بھی منظر عام پر آئے ہیں جنہیں ادبی حلقے نے کافی پسند کیا ہے۔ ''ثالث 12'' اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جہاں اس کا سرورق دیدۂ زیب ہے وہیں اس کی چھپائی بھی عمدہ ہے۔ ہندوستان کے شائع شدہ چند اہم معیاری رسائل میں ''ثالث'' اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ہم اس خوبصورت جریدے کی مسلسل اشاعت کے لیے دعا گو ہیں۔

☆☆☆

خیال آباد

☆**قاضی عبدالستار، علی گڑھ** عزیزی خوشتر!

دربھنگہ ٹائمز موصول ہوا۔ ہر چند کہ ڈاکٹر نے مجھے فون سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے لیکن رسالہ کے معیار نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں خود کو فون کرنے سے نہیں روک سکا۔ تمہارے لیے میری دعائیں اور ڈھیر سارا پیار۔

☆**سر مستنصر حسین تارڑ (پاکستان)**

دربھنگہ ٹائمز کے مضامین کے معیاری ہیں۔ رسالہ ہر اعتبار سے بہت عمدہ ہے۔ دربھنگہ ٹائمز کی ٹیم کو مبارک باد۔ "منصور خوشتر کا شکریہ جس نے سرحد پار سے رسالہ بھجوانا یاد رکھا"۔۔

☆**ابواللیث جاوید (دہلی)**

برادرم، دعا و خیر

''دربھنگہ ٹائمز'' کا جنوری تا مارچ 2018 کا شمارہ محترم غلام نبی کمار کے توسط سے مجھ تک پہنچا، مجلّہ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ آپ نے اب تک ''افسانہ نمبر''، ''ناول نمبر'' اور ''غزل نمبر'' تو شائع کیے ہی ہیں، معروف شخصیتوں کے حوالے سے ان کے فن پر سیر حاصل مضامین بھی شائع کیے ہیں۔ اس طرح مجھے کہنے دیجیے کہ ''دربھنگہ ٹائمز'' کوئی ایسا رسالہ نہیں ہے جو اپنے اداریوں میں مالی دشواریوں اور اردو کے تئیں حکومت کی بے توجہیوں کا رونا رو کر دو تین شماروں کے بعد غائب ہو جائے۔ یہ رسالہ آپ جیسے اردو کے جیالے نوجوان ذہن کے سایہ تلے پروان چڑھ رہا ہے اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ یہ رسالہ سنگ میل ہی کی حیثیت نہیں بلکہ تاریخ ساز حیثیت کا حامل ہوگا، ان شاء اللہ! مشمولات نہایت معیاری اور قابل مطالعہ ہیں۔ افسانوی حصہ میرے نزدیک کمزور سا ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شعری حصّہ غنیمت ہے۔ مجموعی طور پر رسالہ نہایت خوبصورت اور معیاری ہے۔ میری جانب سے بہت بہت مبارک ہو۔

☆ **عزم سہریلوی** (دہلی)

گرامی قدر۔ منصور خوشتر، سلام مسنون.... اللہ محافظ و نگہبان

دربھنگہ ٹائمز جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ دیکھا۔ بہت پسند آیا جو یقیناً مدیرِ ذی وقار کی انتھک کوششوں کا انجام ہے۔ سرِ ورق نہایت خوبصورت و دل نشین ہے۔ مطالعے کے تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد ایسا لگا کہ دل میں کوئی چیز کسک پیدا کر رہی ہے۔ شاید وہ قارئین گرامی کی بے توجہی، اخبارات، رسائل و جرائد کی طرف سے یہ بات عام مشاہدے میں آئی ہے کہ آج کا قاری اردو زبان کی خاطر کبیدہ خاطر نظر آتا ہے، لیکن جب بات اردو اخبارات و رسائل کو خرید کر پڑھنے کی آتی ہے تو اس سے روگردانی اور انحراف کرنے لگتا ہے جس کی طرف توجہ مدیرِ گرامی قدر نے دلائی ہے جو یقیناً ایک مثبت اور صحت مند اقدام ہے۔

مضامین نو بہ نو کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔تمام مضامین معلوماتی اور انسا ئپرنگ ہیں۔افسانوں ،کہانیوں،رباعیوں اور بالخصوص غزلوں کے تجزیے وتبصرے نہایت پرمغرور اور مناسب ہیں۔غلام نبی کمار کا نثری اسلوب نہایت دلپذیر ہے۔یہ ہونہار فرزند کشمیر ایک گوہر نایاب ہے جسے جوہری کی تلاش ہے۔آسمانِ اردو کا ابھرتا ہوا وہ آفتاب ہے جس کی تابناک شعاعیں زمانے کو خیرہ کردینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔آخر میں مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر اور ان کی پوری ٹیم کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے اتنا ضرور کہنا چاہوں گا اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ایک تازہ غزل آنے والے شمارے کی زینت بنا کر شکریہ کا موقع فراہم کریں۔

☆**محمد عطاء کریم، کویت**

ادبی رسائل وجرائد کی دنیا میں سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔مجھے آپ کے کئی شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔خاص طور پر ناول نمبر اور اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر میں شامل معیاری مضامین سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ رسالہ کی اشاعت میں کس قدر محنت کرتے ہیں۔پابندی کے ساتھ اردو کا رسالہ نکالنا کسی جہاد سے کم نہیں۔آپ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز اور المنصور ٹرسٹ کے ذریعہ زبان وادب کے فروغ کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

☆**صدف صلاح الدین، برمنگھم(یوکے)**

رسالہ دربھنگہ ٹائمز کا تازہ شمارہ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا ثبوت پیش کررہا ہے۔بہت کم وقت میں آپ نے اس رسالہ کو عالمی شناخت عطا کروائی ہے۔مضامین اور تخلیقات کا انتخاب بہت ہی اعلیٰ ہے۔کئی مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عصری موضوعات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔یہ بڑی بات ہے۔زندہ زبانیں ہمیشہ اپنے وقت کے ساتھ چلتی ہیں۔ہمیں بھی وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا سیکھنا ہوگا۔ہمارا عہد ٹکنالوجی اور صارفیت کا عہد ہے۔ زبان وادب کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیے بغیر ہم اس کے تحفظ وفروغ کی تمنا نہیں کرسکتے۔آپ نوجوان ہیں۔نئی نسل کی نفسیات اور ان کی ضروریات سے اچھی طرح واقف ہیں،اس کا اندازہ نہ صرف آپ کی پرنٹ صحافت سے ہوتا ہے بلکہ سوشل میڈیا پر آپ کی سرگرمیوں سے بھی ہوتا ہے۔آپ جیسے نوجوان صحافی اور مدیر سے اردو زبان وادب کو کافی امیدیں وابستہ ہیں۔میری تمام تر نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

☆**عین الحق انصاری، گیا**

سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز ایک معیاری ادبی رسالہ ہے۔مجھے پٹنہ میں پہلی بار اس رسالہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔آپ کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔میرا ناقص مشورہ ہے کہ اس رسالہ کو سہ ماہی کے بجائے ماہنامہ کردیا جائے۔

☆☆**استوتی اگروال (سرونج ، مدھیہ پردیش)**

جناب منصور خوشتر صاحب.........................آداب

''دربھنگہ ٹائمس'' کا غزل نمبر سیفی لائبریری میں پڑھا اتنا ضخیم اور معیاری رسالہ دیکھ کر خوش گوار حیرت

ہوئی۔400 صفحات پر مشتمل پرچہ پڑھ کر میں حیران رہ گئی۔دربھنگی ٹائمس کو دیکھنے کا بہت دل تھا اور آج پڑھنے کو بھی مل گیا اور خوشی ہوئی پڑھ کر۔آپ کی محنت سے یہ رسالہ دن بدن شہرت کی بلندیوں کو چھورہا ہے اور رسالے کا معیار بھی بڑھتا جارہا ہے۔سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رسالے میں ایک بھی بڑے لکھنے والے موجود ہیں۔ آپ نے پہلے ''افسانہ نمبر'' اور پھر ''ناول نمبر'' اور اب ایک ضخیم غزل نمبر نکال کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جو اردو ادب میں ایک سرمایا بن چکا ہے اور رسالے نے بھی دستاویزی شکل اختیار کرلی ہے۔سبھی مضامین، غزلیں، تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور خطوط کا تو جواب ہی نہیں۔مضامین میں علی احمد فاطمی، مشرف عالم ذوقی، مناظر عاشق ہرگانوی، نذیر فتح پوری، اچھے لگے۔غزلوں کا تو جواب ہی نہیں اتنی غزلیں ایک ساتھ پڑھ کر غزلیں لکھنا آنے لگا۔ وزیر آغا، انور سدید، ندا فاضلی ، باقر مہدی اور افتخار امام صدیقی کی غزلیں بہت خوب ہیں۔امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

☆**یوسف رامپوری** ، ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی دہلی

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر منصور خوشتر صاحب، ایڈیٹر سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔اس کے متعدد مضامین کے مطالعے کے بعد یہ اعتراف کرتے ہوئے فخر محسوس ہورہا ہے کہ یہ شمارہ اپنے تحریری مواد کے لحاظ سے بہت معیاری ہے۔مضامین کا انتخاب عمدہ ہے۔کاغذ، طباعت اور تزئین کے اعتبار سے بڑا شمارہ بہت پُرکشش ہے۔اداریے کے ایک ایک لفظ کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دربھنگہ ٹائمز اردو کے فروغ کے لیے بھی کوشاں ہے اور اردو ادب کے معیار کے تعلق سے بھی سنجیدہ ہے۔دربھنگہ ٹائمز کے مختلف شماروں کو دیکھ اور پڑھ کر بلاتذبذب یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اخلاص، جذبہ اور جہدِ مسلسل ہو تو فردِ واحد یا معدودے چند افراد بھی بڑے بڑے اداروں اور تحریکوں کا کام انجام دے سکتے ہیں۔آپ اور آپ کے رفقا جس محنت و جانفشانی سے پابندی کے ساتھ رسالے کو شائع اور اس کے معیار کو دن بہ دن بلند کررہے ہیں، وہ یقیناً قابل تحسین کام ہے۔میں آپ کو اور آپ کی ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ''دربھنگہ ٹائمز'' آگے اور بھی کئی منزلوں کو طے کرے گا۔نوجوان ریسرچ اسکالر غلام نبی کمار کی تحریریں پڑھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ انھیں خصوصی طور پر مبارکباد پیش کروں۔ان کا مضمون ''خواتین کی خودنوشتوں کے تجزیوں کا تجزیہ'' موضوع کے اعتبار سے تو اچھوتا ہے ہی لیکن مواد کے اعتبار سے بھی اچھوتا ہے۔انھوں نے موضوع کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور پہلو بہ پہلو تجزیہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ تبصروں کی صورت میں بھی ان کی کئی تحریریں اس شمارے کی زینت بنی ہوئی ہیں۔اور بھی کئی مضامین و تبصرے خاصے معیاری ہیں جن میں ڈاکٹر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر نصرت جبین اور ڈاکٹر مشتاق قادری کے مضامین بہت عمدہ ہیں۔آخر میں دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو نظرِ بد سے محفوظ فرمائے اور دربھنگہ ٹائمز کو مزید ترقیات سے نوازے۔

☆ **شوبی زہرا نقوی** (ریسرچ اسکالر) چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

'سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز' میری نظر سے آپ کا رسالہ گزرا، مجھے اچھا لگا یہ رسالوں کی بھیڑ میں دوسروں سے خاصا مختلف ہے ناچیز کی مبارکباد قبول فرمائے۔ اپنا تازہ ترین مضمون رسالے کے لیے ارسال کر رہی ہوں کسی تازہ شمارے میں شائع کر کے شکریے کا موقع عنایت کریں۔

☆**فطین احمد صدیقی (عمان):**

تازہ شمارہ کا سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔ حسن مضامین کے اعتبار سے بھی اسی قدر دلکشی کا عکاس ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ دلی مبارک پیش ہے۔

☆**عبدالسمیع (بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس)**

جناب منصور خوشتر صاحب! سلام

دربھنگہ ٹائمز کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ آپ نے اس کے قارئین میں مجھے شامل کیا، رسالہ اور آپ نے شہرت و مقبولیت کی منزلیں بہت جلدی طے کی ہیں، خدا سفر کی رفتار برقرار رکھے؟ Abdus Sami ....

☆**خُورشید حیات ، بلاس پور (چھتیس گڑھ)**

معاصر ادبی منظرنامے میں بہت کم ایسے چہرے ہیں۔ جو کسی ادبی رسالہ کی اشاعت سے پہلے نفع ونقصان کے بارے میں نہیں سوچتے - میں حیران ہوتا ہوں ''تخلیق کار'' کے تخلیقی عمل کو دیکھ کر کہ جہاں ایک طرف ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی پرچھائیاں ہیں - وہیں دوسری طرف لخت لخت، تغیر وتبدل والے اس جہاں میں ڈاکٹر منصور خوشتر کے سے نوجوان کا "شاملاتی تہذیب زبان" کا قصہ عشق بھی ہے - جس نے اپنے پانچ خاص رُتوں (م+ن+ص+و+ر) کے سحر میں زبان وادب سے جُڑے قارئین کا دل موہ لیا ہے - فریفتگی کی کیفیت سے دوچار کرنے والے، ادب و صحافت کے سادہ لوح موہن پیارے/منصور خوشتر کا ایک زمانہ شیدائی ہے - ایک وقت وہ تھا جو ہمیشہ ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے ساتھ چلتا تھا - ایک زمانہ ''شمع'' اور ''بیسویں صدی'' کے قارئین کا تھا - بہت پیچھے چھوٹ گیا وہ دور جب سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے بھی گھر کو واپس لوٹتے تو ان کی پانچ انگلیوں کی گرفت میں کتب ورسائل ہوتے تھے -

ایک زمانہ آج کا ہے موہن پیارے؟
اے سبک دست، سنگتراش!

اپنی بے پناہ مدیرانہ صلاحیتوں سے ''دربھنگہ ٹائمز'' کے ہر شمارہ کو منصور خوشتر جس طرح سے پیش کررہے ہیں وہ قابل تقلید ہے - دربھنگہ ٹائمز کے مدیران کا جنوں کچھ ایسا ہے کہ یہ رسالہ اپنے مواد اور صوری حسن کی بدولت، اس عہد کے زندہ رسالوں کے درمیان اپنی پہچان بنا چکا ہے - دربھنگہ ٹائمز کے ناول نمبر اور غزل نمبر کی مقبولیت اس بات کی گواہ ہے کہ موبائل کے بیچ اسکرین سے جڑا آدمی کتاب کلچر کی طرف واپس لوٹ آیا ہے -

ISSN No. : 2395-2016

اردو کے اخبارات ورسائل کا جو زریں دور تھا اسے پھر سے واپس لانے کے لئے ہمیں عملی قدم اٹھانا ہوگا- اردو کتب ورسائل کے قاری کا ایک بڑا طبقہ آج بھی موجود ہے جو ڈیجیٹل زندگی میں اس کی بقا اور تحفظ چاہتا ہے- ادب سماج یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کمزور وسائل کے باوجود رسائل کو جاری رکھنا تپتی دوپہر میں ننگے پاؤں چلنے جیسا ہے کہ اسے آج بھی ''الفاظ''، ''جواز''، اور ''آہنگ'' کے سے سیکڑوں معیاری ادبی رسائل کی چیخیں سنائی دیتی ہیں-

کلام حیدری کے کشکول سے جھانکتے یہ حروف آج بھی کچھ کہتے ہیں میرے موہن پیارے/منصور!

''آہنگ'' کے قارئین یہ جانتے ہیں کہ گیا جیسے دیہات سے پابندی اور معیار کے ساتھ ماہنامہ نکالتے رہنے کے لئے ہم کو کیا کیا کرنا پڑ رہا ہے اور آئندہ کرنا پڑے گا- اس پر حالات یہ ہیں کہ ''بہار'' کی عموما" یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہر کام کرنے والے کی مدد کرنے کی بجائے اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں- اور یہ بھی جو کرتے ہیں ان کا ہم شکر بجالاتے ہیں کہ کم از کم دوستی نہ سہی دشمنی تو کرتے ہے-

دربھنگہ ٹائمز کی مسلسل اشاعت اور اس کے یک موضوعی شمارہ کی مقبولیت کو دیکھ کر کچھ لوگ اسی طرح بوکھلائے ہوئے ہیں جیسا کہ کلام حیدری کے زمانے میں- المنصور ٹرسٹ سے جڑے افراد نے چند برسوں کے دوران جس طرح کے علمی/ادبی/سماجی/فلاحی کام زمینی سطح پر کئے ہیں- وہ ہمیں عزیز النساء کے سرسید احمد خاں کے زمانے کی یاد دلاتا ہے- ہر اچھا کام کرنے والوں کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے چاہے وہ منصوری ہوں یا نوری!

گھر- آنگن "میں اردو'' کے عملی نفاذ کے لئے کامران غنی صبا، منصور خوشتر، غلام نبی کمار کے سے جیالے جو کر رہے ہیں اسے دیکھ ''لبیک لبیک'' کی صدا بلند کیجئے اس کے سالانہ خریدار بنئے

لبڑ دھوں دھوں آخر کب تک؟
بھیڑ کو عقل کب آئے گی؟؟

دربھنگہ ٹائمز (شمارہ" جنوری تا مارچ 288 صفحات پر محیط اس شمارہ کے مندرجات دیکھ کر خوشی ہوئی کہ منصور خوشتر صحت مند فکری رجحان سے مزین معیاری تحریروں کو اہمیت دیتے ہیں-جس سلیقے اور اہتمام سے وہ کام کر رہے ہیں اسے شائقین ادب اور فن شناس کبھی فراموش نہیں کر پائیں گے- تحقیقی- تنقیدی مضامین میں مناظر عاشق ہرگانوی (اردو ناول کا بیسمنٹ)، ڈاکٹر سفینہ (ذکیہ مشہدی کی کہانی، ماں کا تجزیہ) غلام نبی کمار (خواتین کی خودنوشتوں کے تجزیوں کا تجزیہ) اور بھی کئی مضامین نئے تنقیدی رجحانات کی نئی سمت کی نشان دہی کرتے ہیں- ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں میں، مشرف عالم ذوقی، احمد صغیر، سیمیں کرن، صادقہ نواب، وحشی سعید، مجیر احمد آزاد وغیرہ کی کتھا- کہانی میں عصر حاضر کے موضوعاتی تھرکن کو فنی شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے-

آخر میں بس یہی کہنا چاہونگا کہ تخلیقی اذہان کو دنیاوی خداؤں کی اجارہ داری سے خود کو آزاد کرنا ہوگا-

☆**علی نثار (کناڈا)**

منصور خوشتر اور ان کی پوری ٹیم کو اس انتھک محنت، جوش وولولہ سے اردو ادب کی خدمات کے لئے بے شمار تہنیت اور بے شمار دعائیں۔

☆**اقبال حسن آزاد (مدیر ثالث، مونگیر)**

ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ "دربھنگہ ٹائمز" کی تیرہویں جلد کا پہلا شمارہ بابت جنوری تا مارچ 2018 زیر مطالعہ ہے۔ کامران غنی صبا اور غلام نبی کمار اس کے معاون مدیر ہیں۔ 288 صفحات پر محیط اس ضخیم رسالے کی قیمت 250 روپے ہے۔ اداریہ میں ''اردو'' اور ''دربھنگہ ٹائمز'' کے سلسلے میں خوش آئند باتیں تحریر کی گئی ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے باب میں شامل لگ بھگ سارے قلم کار نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ افسانے کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نثری حصے میں یک بابی ڈراما، سرسید احمد خان کا مشہور زمانہ انشائیہ اور طنز و مزاح کے ذیل میں ایک ہلکی پھلکی تحریر پیش کی گئی ہے۔ شعری حصے میں رباعیات، نظمیں، غزلیں اور منظوم تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔ آخر میں کتب و رسائل پر تبصرے اور قارئین کے خطوط پیش کیے گئے ہیں۔

اس پر آشوب دور میں اس آب و تاب سے اردو کا رسالہ نکالنا دراصل ایک ادبی جہاد ہے اور اس کام کو کوئی مرد مجاہد ہی انجام دے سکتا ہے۔ اس کارنامے کے لئے ڈاکٹر منصور خوشتر، کامران غنی صبا اور غلام نبی کمار کے دلی مبارک باد۔

☆**ارشاد اقبال (بنگال)**

آج ڈاکٹر منصور خوشتر صاحب کے ذریعہ بھیجا گیا ایک نایاب تحفہ ''دربھنگہ ٹائمز'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ رسالے میں شامل تمام مضامین عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔ ان شاء اللہ مطالعے کے بعد تبصرہ کروں گا۔

☆**غلام نبی کمار (کشمیر)**

جناب ڈاکٹر منصور خوشتر صاحب

سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ ملا۔ جس کی پہلی کاپی اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے مجھے اس لیے بھی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر منصور خوشتر صاحب نے اس میں میرا نام بحیثیت معاون مدیر شامل کیا ہے جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اس شمارے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض اہل علم حضرات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ''دربھنگہ ٹائمز'' میں تحقیقی وتنقیدی مضامین، ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانے، ڈرامہ، طنز و مزاح، ہم عصر اردو شاعری، تبصرے اور خیال آباد (خطوط) کے تحت بہت معیاری اور وقیع علمی وادبی تحریروں کو جگہ دی گئی ہے جو اسے خوبصورتی عطا کرنے کے لیے میرے لحاظ سے کافی ہے۔

☆**احمد سہیل (امریکہ)**

عزیزی منصور خوشتر کے لئے بے شمار دعائیں
اللہ کرے کامیابیاں ہمیشہ انکا قدم چومتی رہیں۔
دربھنگہ ٹائمز کے تازہ شمارہ جنوری تا مارچ 2018
منصور خوشتر کی محبتوں کا شکریہ

آج اردو کی جدید حسیّت کا علمی اورادبی جریدہ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' ہم دست ہوا۔ پرچے میں اردو فکشن کے حوالے سے بہترین مضامیں کا انتخاب کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ شاعری پر بہتریں مقالات اورڈرامہ اورطنزومزاح پہ کتابوں پر تبصرے کے علاوہ سب سے دلچسپ قارئین کے خطوط کو'خیال آباد' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ منصور خوشتر بڑی محنت اور ہنر مندی سے یہ پرچہ ترتیب دیتے ہیں۔اس کا لکھا ہوا اداریہ پرمغز اور پڑھنے کے لائق ہے، لکھتے ہیں۔ ''مشاہدے میں آیا ہے کچھ مدیران ادیبوں اوراسکالروں کو مضمون ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ پیسہ بھیجنے کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔اوررقم اکاونٹ مین جمع ہوتے ہی فوراان کی تحریروں کواوّلیت کے ساتھ شائع کرتے ہیں''۔ منصور خوشتر نے بڑی جرات اور دلیری سے اردو کے ادبی معاشرے میں اس افسوسناک اورزہریلے رجحان کو بےنقاب کیا ہے۔یہ بازارکاری اردو کے کئی مدیران کرر ہے ہیں۔جن کا ادب وعلم سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔یہ لوگ بےنقاب تو ہوگئے ہیں۔بس اردوادبی سماج میں یہ غیر متعلق ''گھس پیڈیوں'' کی مزید نشاندہی ہونے چاہیےاوران کا بائیکات کرنا چاہیے۔ مشفق خواجہ مرحوم کہا کرتے تھے کی ادبی پرچوں میں انہی شعرا کے شاعری فوراً ہی چھپ جاتی ہے جو''چیک'' کی پشت پراپنی نظم یا غزل لکھ دیتے ہیں۔پرچے کا سرورق جاذب نظر ہے۔یہ پرچہ دیگر پرچوں کی طرح یادگار ہے جس میں اردوزبان کی تہذیبی خوش بو بھیلی ہوئی ہے۔جسکو قاری محسوس کرتا ہے۔جو اردو کی تمدنی وارثت کی امین ہے۔

مشتاق احمد نوری (سکریٹری بہاراردواکیڈمی، پٹنہ)

منصور خوشتر جیسے دیوانے ہی ایسے رسائل نکال سکتے ہیں اس کا کمال یہ ہے کہ اردو جہاں جہاں پڑھی جاتی ہے دربھنگہ ٹائمز وہاں پہنچ جاتا ہے۔اللہ منصور کی دیوانگی برقرار رکھے

انجم عثمانی (کراچی ، پاکستان)

یہ رسالہ کیا مشتاق دربھنگوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے؟۔منصور خوشتر صاحب نے بجا طور پر ایک ادبی ناسور کی نشاندہی فرمائی ہے جس پر احتجاج کیا جانا ضروری ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سی بدعات ادب میں داخل ہوچکی ہیں جن کے خاتمے کے لئے آوازاٹھانا ضروری ہوگیا ہے۔

☆**طارق عزیز (پاکستان)**

سرتارڑنے دربھنگہ ٹائمز کے مضامین کے معیار کوسراہتے ہوئے ٹیم دربھنگہ ٹائمز کو مبارک کہی۔اور کہا: ''منصور خوشتر کو

ISSN No. : 2395-2016

شکر یہ کہہ دینا جس نے سرحد پار سے رسالہ بھجوانا یاد رکھا''۔
اردو ناول کی پیش رفت از منصور خوشتر در بھنگہ، بہار انڈیا

☆نعیم بیگ پاکستان

ڈاکٹر منصور خوشتر کا نام اردو ادب کے شیدائیوں کے لئے اب قطعاً اجنبی نہیں رہا۔ ایک درجن سے زائد کتب کے مصنف و مرتب، در بھنگہ ٹائمز کے مدیر اعلیٰ اور المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، در بھنگہ ٹائمز، بہار ہندوستان کے منتظم اعلیٰ، دنیائے ادب میں چہار جانب اردو ادب و فکر و فہم و دانش کے چراغ روشن کر رہے ہیں۔
ان کی حالیہ کاوش ''اردو ناول کی پیش رفت'' اکیسویں صدی کے پہلے پندرہ سولہ برس میں چنیدہ اردو ناول کی ایک تاریخ مرتب کرتی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہوئے آپ اردو ناول کے امکانات پر بات کرتے ہیں، تاریخی حسیت و عناصر کی شمولیت پر زبان کی تخلیقیت اور ادب کے انسلاکات، نقادوں اور قارئین کے درمیان ناول کا معلق ہونا اور تفہیم و ترسیل، اور موضوعاتی تنوع ان کی گفتگو کا محور ہیں جن پر منصور خوشتر کھل کر بات کرتے ہیں۔
ان کے مطابق ناول میں تاریخی سروکار کا معاملہ بھی یوں اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ بیدار مغز اور توسیع پسندانہ ذہن سے بات نہیں ہو رہی ہے۔ انھوں نے گزشتہ پندرہ برسوں کے دوران پاک و ہند میں لکھے گئے ناولوں کو اپنی گفتگو کا حصہ بنایا ہے، ان کے بیشتر موضوعات سوشل زندگی اور معاشرتی حرکیات ہیں۔۔۔
اس ضمن میں پاکستان میں لکھے گئے گزشتہ پانچ برسوں بیشتر ناول جو سامنے آئے ہیں میں ان کا اپنے تئیں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، ان میں موضوعاتی تنوع کے علاوہ اسلوبیاتی رنگ بھی نظر آئے ہیں جن میں کچھ تاریخی حوالوں کے علاوہ پارٹیشن، دیہی زندگی اور شہری زندگی میں ثقافتی و شناختی بحران اور سندھ کی تہذیب جیسے موضوعات بھی شامل ہے۔ مصنفین میں خالد فتح محمد ''شہر مدفون''، علی اکبر ناطق ''نولکھی کوٹھی''، میرزا اطہر بیگ ''حسن کی صورتِ حال -- خالی جگہیں پر کرو'' اختر رضا سلیمی'' جاگے ہیں خواب میں''، رفاقت حیات ''میرواہ کی راتیں'' اور سید کاشف رضا کا ناول بھی شامل ہے۔ ان ناولوں میں پری اور پوسٹ کالونیل سماجی مسائل پر کرداروں کی اٹھان کی گئی ہے۔ ان سب کے بعد حال ہی (2017) میں آنے والا میرزا حامد بیگ صاحب کا معرکتہ الآرا ناول ''انارکلی'' ہے۔ جسے دستاویزی ناول کا درجہ حاصل ہے اور خود خاکسار کا ناول ''ڈیئوس، علی اور دیا'' ہے۔ اس ناول پر الگ سے بات کی جا سکتی ہے۔۔۔ ''اردو ناول کی پیش رفت'' پر ابھی پہلی نظر ڈالی ہے۔۔۔ اس پر مزید گفتگو ہوگی۔ لیکن یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ منصور خوشتر آج کی نوجوان نسل کے لیے راہنما ثابت ہوئے ہیں۔

فیضان حسن ضیائی، سہسرام

''در بھنگہ ٹائمز'' جنوری تا مارچ 2018 زیر مطالعہ ہے۔ اخبارات اور فیس بک پر آپ کی مختلف سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی رہی ہے ۔ المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے ذریعے آپ زمینی سطح پر اردو کی ترویج و ترقی کے لئے لوگوں کو بیدار کرنے میں محو ہیں۔ امید ہے اس کے اور بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ معاصر ادبی رسائل کے

ISSN No. : 2395-2016

منظر نامے پر ''دربھنگہ ٹائمز'' نے اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔ نئے سال کا یہ پہلا شمارہ خوبصورت کتابت، گٹ آپ، اور کتابی شکل میں ادب کی مختلف اصناف سے لبریز ذہن کو تازگی عطا کررہا ہے۔ جو یقیناً آپ کی اور آپ کے معاونین کی خوش ذوقی اور خوش سلیقگی کا آئینہ ہے۔ رسالے کے سرورق پر اگر معاون مدیران کو بھی جگہ دی جائے تو اس کی خوبصورتی میں نکھار آئے گا۔ بہرحال تحقیقی اور تنقیدی حصہ اس بار نئے قلم کاروں سے بھرا بھرا ہے جو نئے چراغوں کو روشنی عطا کرنے کے مانند ہے۔ افسانوی حصہ بھی باوقار ناموں سے پر ہے۔ اس شمارے کی خاص چیز سلام بن رزاق کا ڈرامہ ''کام دھینو'' ہے اردو کے ادبی رسائل میں ڈراموں کی شمولیت خال خال ہے۔ رسائل میں ڈراموں کی اشاعت کی جانب آپ حضرات نے توجہ مبذول کرائی ہے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب کے منظوم تبصرے بے حد پسند آئے۔ طرزی اپنے منفرد طرزِ اظہار کے باعث ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ وہ سامنے والی شخصیت کو اپنی عینک سے دیکھتے ہیں اور الفاظ کی سادگی سے اسے پرکشش بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، غلام نبی کمار اور مجیر احمد آزاد کے تبصرے تفصیلی اور معلوماتی ہیں۔ امید ہے ''دربھنگہ ٹائمز'' کا آئندہ شمارہ بھی ہمیں یوں ہی سیراب و سرشار کرتا رہے۔

☆ **راجہ یوسف** ۔ اننت ناگ (اسلام آباد) کشمیر

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہٗ۔

جب کوئی خوبصورت چیز نظروں کے سامنے آجاتی ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اگر یہ کوئی ادبی رسالہ ہے تو یہ خوشی دوگنا، چارگنا بڑھ جاتی ہے۔ میں نے جب ''دربھنگہ ٹائمز'' کا تازہ شمارہ دیکھا تو یقین نہیں آیا کہ آج بھی اتنا خوبصورت کوئی ادبی رسالہ نکلتا ہے۔ دیکھنے میں رنگین اور دلکش ''دربھنگہ ٹائمز'' کا اداریہ سب سے پہلے پڑھا۔ جس میں مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر صاحب کا یہ دعویٰ ہے۔ ''دربھنگہ ٹائمز کا یہ شمارہ رنگارنگ موضوعات سے مزین ہے۔ جس میں قارئین کی دلچسپی اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان کی بیشتر شہرت یافتہ اصناف کو جگہ دی گئی ہے'' رسالہ بڑے شوق و ذوق کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تو ورق ورق پر منصور خوشتر صاحب کا دعویٰ صحیح لگا اور مضبوط بھی۔ رسالے کا گٹ اپ خوبصورت خوشنما اور دیدۂ زیب بنانے کے لئے جہاں اس کے ٹائٹل کور اور بیک پیج پر توجہ دی گئی ہے۔ وہاں رسالے کا معیار بلند رکھنے کے لئے تخلیقات کو جانچنے اور پرکھنے پر بھی بہت زیادہ محنت کی گئی ہے۔ رسالے کا چاہئے نظم کا حصہ ہے یا نثر کا، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نظم میں غزل، رباعیات اور نظموں کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ جبکہ نثر میں مضامین، افسانے، انشائیہ، ڈرامہ اور تبصرے بہت اعلیٰ ہیں اور منصور خوشتر صاحب کی بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ رسالے میں اردو زبان کی بیشتر شہرت یافتہ اصناف کو جگہ دی گئی ہے۔ ''دربھنگہ ٹائمز'' محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ نوجوان شاعر اور ادیب ڈاکٹر منصور خوشتر جیسے قابل قلم کار رسالے کے مدیر ہیں۔ دور حاضر کے فعال اور متحرک ادیب کامران غنی صبا اور غلام نبی کمار معاون مدیر۔ مجلس ادارت اور مجلس

ISSN No. : 2395-2016

مشاورت میں قدآور ادبا اور شعرا کے نیک مشورے، یہ سب رسالے کا معیار اعلیٰ اور اونچا رکھنے کے ضامن ہیں۔

میں اپنی طرف اور اپنے دوستوں کی طرف سے "دربھنگہ ٹائمز" کی پوری ٹیم کو مبارکباد دیتا ہوں۔

محمد حامد سراج (پاکستان)

منصور خوشتر صاحب ۔۔۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اردو ناول کی پیش" کتابی صورت میں بہ عنوان "اور دربھنگہ ٹائمز کا ناول نمبر "دربھنگہ ٹائمز" کل کی ڈاک سے مسرت ایسے الفاظ لکھنا بہت آسان ہیں لیکن دل کی کیفیات دل سے دل" سرشاری" "خوشی" موصول ہوا۔ "رفت میں" تک جب بھی سفر کرتی ہیں وہ عالم محسوسات ہے اور اسے کبھی بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اردو ناول کی پیش رفت آپ نے میری بہت عام سی رائے کو اہمیت اور جگہ دی۔ یہ آپ کی عظمت اور بڑا پن ہے۔ کتاب کا سرورق بہت عمدہ اور کاغذ کا معیار دیکھ کر دل خوش ہوا۔ مندرجات کے وقیع ہونے میں شک ہی کیا ہے وہ ہم پہلے مستفیض ہو چکے ہیں بل کہ آپ کے ناول نمبر نے ہمیں نئے ناول سے متعارف کرایا اور ہم نے وہ ناول تلاش کر کے مطالعہ کئے۔ اللہ

رب العزت آپ کو عمر میں

اپنے تخلیقی کام میں برکت عطا کریں۔'

☆**آفتاب احمد آفاقی**، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

"اکیسویں صدی میں اردو" ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز کا خصوصی شمارہ موصول ہوا شکریہ

غزل داخلی کیفیات کے اظہار کا فن ہے اور۔ اصناف سخن میں غزل مقبول ترین صنف رہی ہے اردو کی جملہ شعری غزل کی خوش آہنگی، اشاراتی و ۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے دوسری اصناف سخن کے مقابلے زیادہ مستحکم اور منظم ہے ایمائی انداز اور منضبط طرز اظہار جو اس کی اساسی خصوصیت ہیں اس کی مقررہ ہیئت کے اندر ہی بروئے کار لائی غزل کے اسالیب میں عہد بہ عہد تبدیلیوں کے باوجود ایک داخلی صنف کی حیثیت سے اس کی فنی ہیئت ۔ جاتی ہے ۔ تاہم ہر دور کے تقاضوں کے مطابق غزل نے اپنے فکری اسالیب میں لچک روا رکھی ۔ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اکیسویں صدی میں اردو غزل پر مشتمل یہ شمارہ اس لحاظ سے توجہ طلب ہے کہ اس کے بعض مضامین جہاں اردو غزل کے بدلے تیور کی نشاندہی کرتے وہیں ان تقاضوں اور محرکات سے بھی واقف کراتے ہیں جن کے نتیجے میں تخلیقی سطح نئی صدی کی دوسری دہائی میں اردو غزل فکر و خیال کی کن جہتوں سے سرشار ہے ان ۔ پر تبدیلی واقع ہوتی ہے علاقائی اور صوبائی لحاظ سے لیا گیا جائزہ، مکالمہ، اور نمائندہ غزلوں کی شمولیت ۔ مضامین سے اندازہ کیا جا سکتا ہے

☆☆☆

جشن المنصور مارچ ۲۰۱۸ء کی مختصر روداد

المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ کے میدان میں ایک سو چپن واں پروگرام ''جشن المنصور''، بموقع پروفیسر طرزی کی یوم پیدائش کے موقع پر قومی سیمینار بعنوان ''اردو زبان کا فروغ اور ہماری ذمہ داریاں''، کل ہند مشاعرہ اور ایوارڈ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے راج بھاشا بہار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد کریمی، قاسم خورشید، اقلیتی فلاح آفیسر وسیم احمد، مہمان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائرکٹر مانو کولکاتا)، حنیف ترین دہلی، خلیق الزماں نصرت ممبئی، نذیر فتح پوری پونا، غلام نبی کمار کشمیر، خورشید حیات چھتیس گڑھ، نعیم اختر ناگپور، اشتیاق سعید ممبئی، وینا ٹھاکر ممبر ساہتیہ اکاڈمی، پدم شری ڈاکٹر مانس بہاری ورما، ہارون شیلندر سیوان، اویناش امن، شمیم قاسمی، علام الدین، فہام الدین، فلم پدماوت کے گیت کار ایم اے طراز، ہاشم فیروز آبادی، چاندنی شبنم، تبریز ہاشمی، علی بارہ بنکوی، جمیل اختر شفیق، گل صباح فتح پوری، شنکر کیموری، صدر عالم گوہر، معین گریہڈوی، مجیر احمد آزاد، منظر سلیمان، احسان عالم، انور آفاقی، ڈاکٹر انتخاب ہاشمی، علاء الدین حیدر وارثی کے علاوہ ہزاروں اردو شائقین شامل ہوئے۔







جشن المنصور

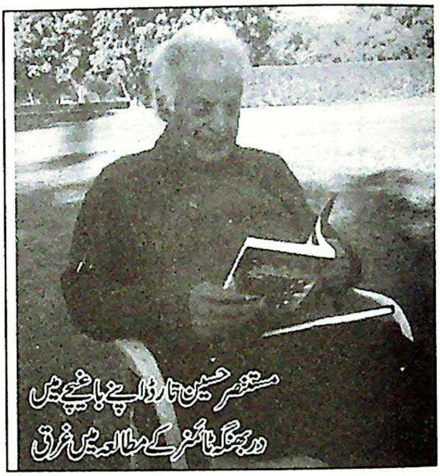
ساہتیہ کار ادبی سنگم کے تحت ایوارڈ ۲۰۱۸

۱۔شعری نذیر فتح پوری۔ نظم سفر (نظمیں) اویس احمد دوراں ایوارڈ، ۲۔افسانہ نورشاہ۔ایک معمولی آدمی ۔کرشن چندر ایوارڈ، ۳۔تنقید خورشید حیات ۔لفظ تم بولتے کیوں ہو۔کلیم الدین احمد ایوارڈ، ۴۔صحافت ڈاکٹر محمد سراج اللہ۔ اردو صحافت کے فروغ میں مدارس کا کردار۔اجمل فرید ایوارڈ، ۵۔ترجمہ محمود احمد کریمی۔ مجموعی ترجمہ نگاری۔ شکیل الرحمٰن ایوارد، ۶۔عبدالودود انصاری۔ مسلمان سائنسدانوں کی خدمات ۔اے پی جے عبدالکلام ایوارڈ، ۷۔میتھلی وینا ٹھاکر۔ بھارتی ۔ناگارجن ایوارڈ، ۸۔ہندی اشتیاق سعید۔ क शTT गT व ۔راہی معصوم رضا ایوارڈ، ۹۔ہندی تنقید ہارون شیلند، समय संवेदना और संवाद، رام دھاری سنگھ دنکر ایوارڈ، ۱۰۔عمدہ نصابی کتاب ڈاکٹر محمد نعیم اختر۔وہاب اشرفی ایوارڈ، ۱۱۔خواتین نازنین ۔اردو خودنوشت نگاری پر ایک نظر۔ حکیم الطاف حسین حالی ایوارڈ، ۱۲۔علام الدین۔ لچھمن ریکھا کے پار۔سید الطاف حسین حکیم دَمری ایوارڈ

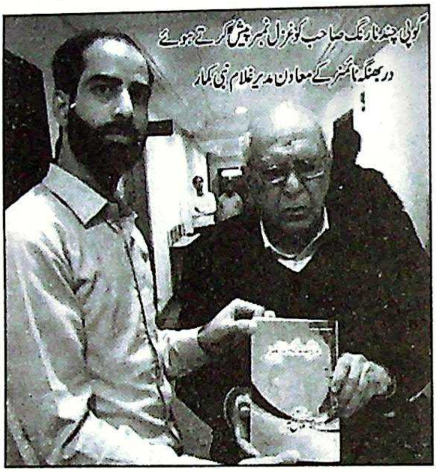
دیگر ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۔متھلا رتن۔ مانس بہاری ورما، ۲۔نوجوان ادیب۔غلام نبی کمار۔مظہر امام ایوارڈ



دربھنگہ ٹائمز بین الاقوامی سطح کے مشہور و معروف ادیبوں اور نامی گرامی شخصیات کے ہاتھوں میں

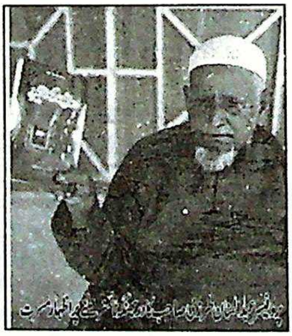


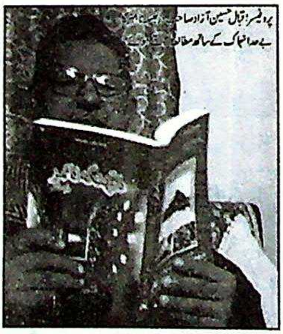
مستنصر حسین تارڑ اپنے باغیچے میں
دربھنگہ ٹائمز کے مطالعہ میں غرق

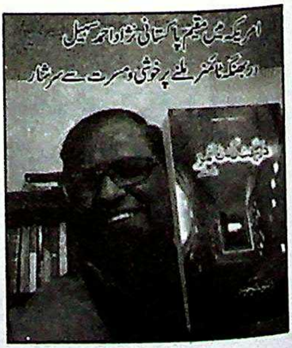


گوپی چند نارنگ صاحب کو غزل نمبر پیش کرتے ہوئے
دربھنگہ ٹائمز کے معاون مدیر غلام نبی کمار









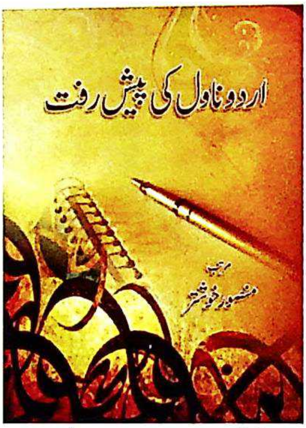
امریکہ میں مقیم پاکستانی شاعر احمد سہیل
دربھنگہ ٹائمز ملنے پر خوشی و مسرت سے سرشار





ابواللیث جاوید صاحب
دربھنگہ ٹائمز کے مشمولات کا جائزہ لیتے ہوئے

ISSN No. : 2395-2016



اردو ناول کی پیش رفت

مرتب ڈاکٹر منصور خوشتر　　قیمت : 350.00 روپے

☆اکیسویں صدی کے زیادہ تر ناول بدلتی ہوئی اس خوبصورت اور خوفناک دنیا کے گواہ ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جس رفتار سے ناول لکھ جا رہے ہیں، اس رفتار سے تنقید سامنے نہیں آ رہی۔ منصور خوشتر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اکیسویں صدی کے ناولوں کو موضوع بنایا اور ایک ایسی کتاب ترتیب دی جس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اردو ناولوں پر ریسرچ کرنے والے، پبلشرز کے پاس کتابیں تلاش کرتے رہتے ہیں، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس موضوع پر کتابیں مارکیٹ میں نہ کے برابر ہیں۔ منصور خوشتر کی خوبی یہ ہے کہ ہر بار وہ خصوصی طور پر، ریسرچ اسکالر کو سامنے رکھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس سے قبل کے بعد کے افسانوں پر کتاب لے آئے اور اب اردو ناولوں کو موضوع بنایا..... مجھے یقین ہے کہ ان کا کارنامہ نہ صرف ادبی دنیا میں پسند کیا جائے گا بلکہ اردو ناول کو وقار بخشے گا۔

مشرّف عالم ذوقی

☆اردو ناول کی پیش رفت میں حاصل محنت کی ہے اور خاصا اہم مواد جمع کر لیا ہے اور اتنا جمع کر لیا ہے کہ ابھی بہت دنوں تک اس کی افادیت قائم رہے گی۔

عبدالصمد، پٹنہ

اردو کے نیے ناول کی فنی جہات تک رسائی کے لیے ''اردو ناول کی پیش رفت'' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ منصور خوشتر نے اس کتاب میں نئے مضامین کی ایک کہکشاں سی سجادی ہے اس کتاب میں اردو ادب کے آفتاب و مہتاب ہی نہیں وہ ستارہ بھی اپنی چمک دکھلا رہا ہے جو ادب کے افق پر ابھی ابھی طلوع ہوا ہے۔ اس طرح منصور خوشتر جہاں ایک طرف نیے اذہان کی تربیت کر رہے ہیں تو دوسری طرف نئے لکھاریوں کی ایک کھیپ بھی تیار کر رہے ہیں مجھے کہنے دیجئے کہ دربھنگہ کی سرزمین سے منصور خوشتر کے روپ میں ایک محمد طفیل ابھر کر سامنے آیا ہے۔

شموئل احمد، پٹنہ

☆اردو ناول کی پیش رفت تاریخی دستاویز کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اردو زبان و ادب ڈاکٹر منصور خوشتر کی شکر گزار ہے اور اردو ادب کا قاری ان کی کاوش پر انہیں سلام کرتا ہے۔

محمد حامد سراج (پاکستان)

☆ ڈاکٹر منصور خوشتر کی کاوش ''اردو ناول کی پیش رفت'' ایک ایسی تاریخی حیثیت کا حامل کام ہے جو اکیسویں صدی کی پہلی دو دھائیوں میں جنم لینے والے اردو ناول میں نئے اور پرانے عہد کے تہذیبی رشتوں کی دریافت اور انسانی شعور کے لئے آفاق کی جستجو کا نام ہے۔ اس کتاب کے مشمولات میں مضامین و دیگر ملفوظات ادبی و علمی مزاج میں تنوعات، فنی ہیئت کی کثیر الجہتی، اسلوب و معنویت کی آگہی قاری کے لئے خوشگوار تجربہ اور ذہنی اہتزاز نامہ ہے۔

نعیم بیگ (لاھور پاکستان)

☆''اردو ناول کی پیش رفت'' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں اردو ناول کی تاریخ، ارتقا، ماہیت، اس میں پوشیدہ شعریات اور افقی، ناول میں فرد کے رجائی اور قنوطی حسیت کا احوال اور عمودی نقدیات کے کئی پڑاو کی نشاندہی ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اردو ناول کے روشن مستقبل راہوں کو بھی دریافت کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ناول کے حوالے سے تاریخ کے سانحات موضوعی اور معروضی حساسیت اور جذباتیت کی وارداتیں بھی پوشیدہ ہیں اس کتاب کو پڑھکر یہ احساس ہوتا ہے اس میں اردو ناول کی مختصر تاریخ کے بیانیے میں عصری اردو ناول کی تابندگی کا عندیہ دیا گیا ہے۔

احمد سہیل، امریکہ

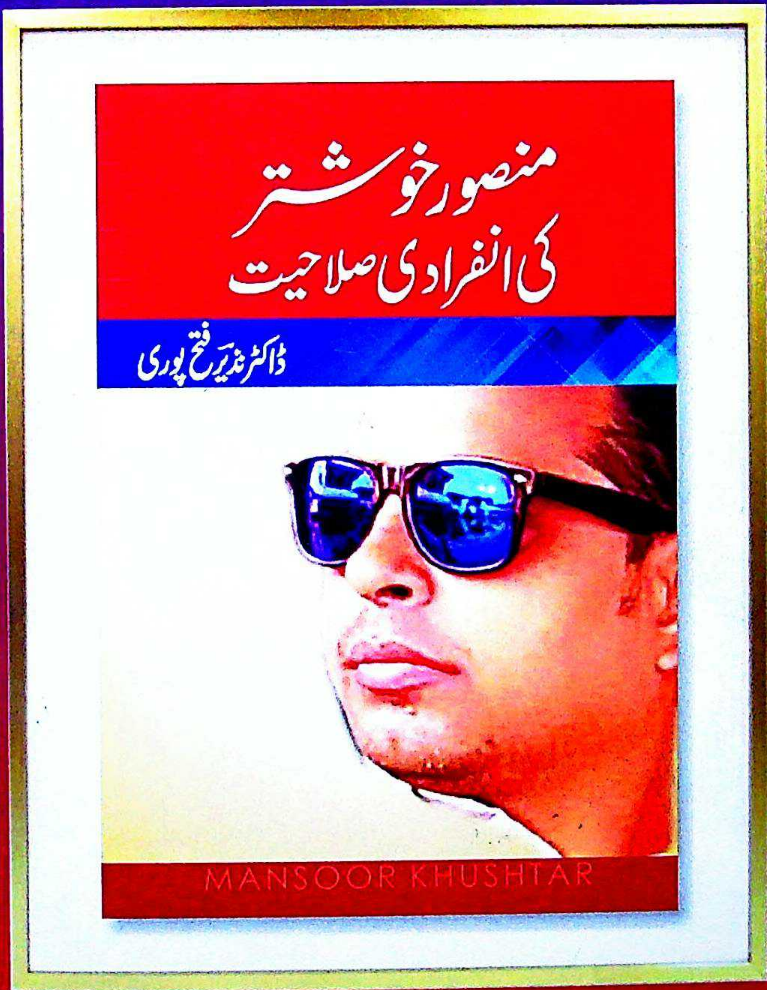
زیر اہتمام: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ، سبھاش چوک، دربھنگہ

ISSN No: 2395-2016
Book Series
RNI. BIHURD 00639/04/01/2005 TC

DARBHANGA TIMES

VOL - 14 ISSUE - 1 JANUARY 2019

Purani Munsifi, Darbhanga-04 (Bihar) India, Cell: 9234772764, Fax: 06272-250103
Email: darbhangatimes@gmail.com www.darbhangatimes.in
EDITOR: DR. MANSOOR KHUSHTER



دربھنگہ ٹائمز پبلیکیشنز
DARBHANGA TIMES PUBLICATIONS
Purani Munsafi Darbhanga-04 (Bihar) Mob: 9234772764
Email: darbhangatimes@gmail.com www.darbhangatimes.in